مولانا ظفر احمد

(حیات و خدمات)

تلخیص

مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی

مقالہ نگار

عبید اقبال عاصم

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی

شعبۂ عربی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمان الرحیم

مولانا ظفر احمد

حیات وخدمات

مولانا ظفر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ (۱۳۱۰-۱۳۹۴ھ/۱۸۹۲-۱۹۷۴ء) برصغیر کے ان نامور فضلاء میں تھے جنہوں نے اپنے علمی شہ پاروں سے برصغیر کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے علم و ادب کو فیض یاب کیا۔ بیسویں صدی میں ایسے ممتاز علماء دین انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں جن میں مولانا ظفر احمد صاحب کو خصوصی مقام حاصل ہے۔

انہوں نے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور برما کے تشنگانِ علوم کو صرف کتابی علم کی تقسیم پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ بذاتِ خود ان ممالک میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے کر ہزارہا تلامذہ تیار کیے، جن میں سے بیشتر نے نمایاں علمی کارنامے انجام دیے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی دیوبند کے محلّہ دیوان میں پیدا ہوئے، جو ان کے جد امجد دیوان لطف اللہ کا بسایا ہوا ہے اور انہیں کے نام سے منسوب ہے۔ ان کے دادا شیخ نہال احمد دیوبند کے اپنے وقت کے مشہور زمیندار اور دار العلوم، دیوبند کی پہلی شوری کے تاسیسی ارکان میں سے ایک اہم ترین رکن تھے۔ دار العلوم، دیوبند کی بیشتر عمارتیں انہیں کی وقف کردہ زمین پر بنی ہوئی ہیں ۔مولانا کے والد شیخ لطیف احمد نے بھی دار العلوم، دیوبند سے کسبِ فیض کیا تھا، لیکن وہ عصری علوم خصوصاً انگریزی زبان کے حمایتی ہونے کے باعث ترکِ وطن کرکے آگرہ مشن (Mission) اسکول میں فارسی پڑھانے پر متعین ہوگئے تھے، جس کی وجہ سے مولانا ظفر صاحب کا بچپن والدہ کی گود میں گذرا، اور وہ والد کی تربیت سے محروم رہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ ان کے حقیقی ماموں تھے، بھانجے کی تعلیم وتربیت صحیح خطوط پر کرنے کی غرض سے وہ ایامِ

طفلی میں ہی مولانا ظفر احمد صاحب کو اپنے ساتھ تھانہ بھون لے گئے، جہاں مولانا کی تعلیم و تربیت مولانا تھانویؒ کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں شخصیتوں کے مابین گہرے مراسم قائم ہوئے، اور مولانا ظفر احمد عثمانی ''دیوبندی'' کے بجائے ''تھانوی'' مشہور ہوئے۔

ایامِ طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں ہی یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اپنے مخصوص علمی ذوق کے سبب آگے چل کر یہ بچہ علمی دنیا میں نام روشن کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مولانا کی شخصیت علمی شخصیت تھی، لیکن انہیں سیاست میں بھی ایک اہم مقام حاصل رہا۔ مسلم لیگ میں ان کی شرکت کے سبب مسلم لیگ کے وقار میں اضافہ ہوا۔ وہ دوقومی نظریہ کے علم برداروں میں سے تھے، اس کے لئے دامے، درمے، سخنے ہر طرح سے تیار رہے۔ ان کی یہ خدمات تاریخِ پاکستان کا اہم باب تصور کی جاتی ہیں۔ انہیں خدمات کے کسی حد تک اعتراف کے طور پر انہیں تقسیمِ ملک کے بعد (۱۴ راگست ۱۹۴۷ء) پاکستان کے مشرقی حصہ (موجودہ بنگلہ دیش) کی راجدھانی ڈھاکہ میں سرکاری طور پر رسمِ پرچم کشائی کا اعزاز حاصل ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ اگرچہ سیاسی میدان میں سرگرمِ عمل نہیں رہے، لیکن جب کبھی انہوں نے مذہبی طور پر اپنی ضرورت محسوس کی تو اس میں پیش پیش رہے، چنانچہ پاکستان کو آئینی طور پر اسلامی ملک کا درجہ دیے جانے کی مانگ سے لے کر قادیانیت کو اسلام مخالف فرقہ قرار دیے جانے تک جتنی بھی مذہبی سیاسی تحریکات وجود میں آئیں ان میں مولانا نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ عرصۂ دراز تک جمعیۃ علمائے اسلام، پاکستان کے صدر رہے جس کی بنا انہوں نے ہی ڈالی تھی۔

علم و فضل کی دنیا میں مولانا کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے اعلاء السنن کی بیس ضخیم جلدوں کے ذریعہ فقہ و حدیث میں اپنی فنی، علمی مہارت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے، جس کی نظیر گذشتہ کئی صدیوں میں بہت کم ملتی ہے۔

اگرچہ یہ خدمات فقہِ حنفی کو احادیث سے مستحکم و مستدل کرنے پر موقوف ہیں، تاہم اس

میں مولانا نے جو علمی مباحث اٹھائے ہیں وہ اپنی جگہ گرانقدر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی اس خدمت کا اعتراف عرب وعجم کے مختلف علمی حلقوں کی جانب سے کیا گیا۔ ایک طرف مصر کے مشہور حنفی عالم شیخ زاہد الکوثری نے اسے سراہا تو دوسری جانب شام کے مشہور عالم ومحقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اس کی علمیت سے متاثر ہوکر باقاعدہ برصغیر کا سفر کیا، اور یہاں کے علماء کرام سے استفادہ کیا اور بالخصوص مولانا کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور پھر اس کے مقدمہ پر مزید حواشی کا اضافہ کرتے ہوئے اسے وقیع علمی تالیف ''قواعد فی علوم الحدیث'' کے نام سے پیش کیا، جو حدیث کے فنی موضوعات پر ایک اہم کتاب ہے، بعد میں پاکستان کے مشہور و معروف عالمِ دین مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنی تحقیقات وتعلیقات سے اس کی علمی شان کو دوبالا کردیا۔

مولانا کو جہاں فقہ وحدیث پر عبور حاصل تھا، وہیں عربی شعروادب سے متعلق بھی ان کا ذوق اعلی تھا۔ آپ کا زیادہ تر علمی سرمایہ عربی زبان میں ہی ہے، خصوصاً عربی زبان میں آپ کے نعتیہ قصائد، تقاریظ اور مراثی وغیرہ کافی تعداد میں ہیں، جو اس وقت کے علمی جرائد میں یا مختلف کتابچوں کی صورت میں شائع ہوتے رہے، اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ مولانا کی بہت سی شعری تخلیقات مجلّات ورسائل کے صفحات میں دبی پڑی ہوں گی۔

اس زاویہ سے اس عبقری شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ہمیں ''ہشت پہلو'' شخصیت دکھائی دے گی، لیکن افسوس اس کا ہے کہ اس جلیل القدر ذات کی علمی، ملی، اور سیاسی خدمات کا جس انداز سے اعتراف ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوسکا، اور آج حالت یہ ہے کہ نئی نسل ان کے تعارف اور خدمات کو قابلِ اعتناء ہی نہیں سمجھتی۔

میں نے جب تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے مولانا اور ان کے دیگر معاصرین علماء کا مطالعہ کیا تو مجھے مولانا کی شخصیت کئی حیثیتوں سے جاذبِ نظر معلوم ہوئی، جس کی وجہ سے میں نے محض اللہ

کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے مولانا کی حیات و خدمات کا انتخاب کرلیا۔ کیوں کہ ہندوستان میں مولانا کی شخصیت پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی اولیت کا شرف مجھے حاصل ہورہا تھا، اسی لئے یہ احساس بھی دامن گیر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مواد کی عدمِ فراہمی کے باعث موضوع سے دست کش ہونا پڑے، لیکن نصرتِ الٰہی پر توکل کرتے ہوئے میں نے اس کام کو اپنے لئے چیلنج سمجھتے ہوئے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، واقعۃً اللہ تعالی کی تائید وحمایت ہر ہر قدم پر شاملِ حال رہی، جس کی وجہ سے یہ طالب علمانہ حقیر کاوش، پیش کرنے کے لائق بنی، اس عنایت بے بہا پر بارگاہِ ایزدی میں سراپا سپاس ہوں۔

یہ مقالہ پانچ ابواب کی متعدد فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلا باب جسے ''مقدمۃ الکتاب'' بھی کہا جاسکتا ہے، اس میں عرب و ہند کے تعلقات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب کی ہندوستان میں جب بھی بات کی جائے گی تو لازماً ان حالات ومشاہدات کا مطالعہ کرنا ہوگا جن کے تناظر میں اس قدیم غیرملکی زبان کو اپنے رشتے استوار کرنے کے مواقع ملے۔

اس لحاظ سے ہم نے پہلے باب میں چھ فصلیں قائم کیں۔ پہلی فصل میں (ما قبل اسلام) عرب قوموں کے ہندوستانیوں سے تعلقات اور باہمی تجارتی رشتوں پر روشنی ڈالا گیا ہے، ہندوستان کے قدیم قبائل زط، تکاکرہ، میدوغیرہ اسلام کی آمد سے سینکڑوں سال پہلے سے عرب ملکوں میں آباد تھے، عرب کے باشندے تجارتی اسباب کی خرید وفروخت کے سلسلے میں ہندوستان آتے جاتے تھے، اسی وجہ سے اس زبان سے باشندگانِ ہند زمانۂ قدیم سے متعارف تھے۔

دوسری فصل مابعد اسلام عرب و ہند کے تعلقات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان تاریخی احوال کو پیش کیا گیا ہے، جب نبیِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نبوت سے سرفراز ہونے

کے بعد اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں صحابۂ کرام نے دیگر اقوام پر اپنے اثرات مرتب کئے۔ حیاتِ نبوی کے آخری عہد، اور خلفائے راشدین کے ابتدائی زمانوں میں مختلف تجارتی وفود ہندوستان حسبِ معمول آئے، یہاں کے تجار بھی عرب گئے۔ مسلمانوں کے معاملات، اخلاق، اور حسنِ معاشرت نے یہاں کے تاجروں پر مثبت اثرات ڈالے، جس کی وجہ سے اسلام کے ہندوستان میں آنے کے دروازے کھلے۔ اس کے علاوہ عربی زبان میں قرآن کریم کے نزول اور خود اس کی تلاوت کے باعثِ ثواب ہونے کی وجہ سے باشندگانِ ہند نے عربی زبان و ادب پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔

تیسری فصل ''عربی زبان وادب اور ہندوستان'' میں پہلی صدی ہجری سے ہندوستانیوں کی عربی زبان وادب کے تئیں دل چسپی، ان کی عربی علوم وفنون میں مہارت اور ہندوستان کے عہد بہ عہد مشہور و معروف شعراء کا نہایت مختصر تعارف کرایا گیا ہے

اور جہاں کہیں ضرورت محسوس کی گئی ان کا نمونۂ کلام بھی پیش کر دیا گیا ہے، تا کہ شعرائے ہند کی کی جانے والی عربی شاعری کا عہد بہ عہد اندازہ ہو سکے۔ یہ فصل لودھی عہد تک کے معروف ادباء و شعراء کے اجمالی تذکروں پر مشتمل ہے۔

چوتھی فصل کی ابتداء ''مغل حکمراں اور عربی زبان وادب'' سے ہوتی ہے۔ اس فصل میں مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کی عربی زبان وادب اور علوم وفنون کے تئیں دل چسپی، اس کے نتیجہ میں ہندستان میں ان علوم وفنون کی بے پناہ مقبولیت و شہرت اور اس عہد کے عربی زبان وادب سے متعلق کچھ اہم ہندوستانیوں اور ان کی کوششوں و کاوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

پانچویں فصل حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۲۴-۱۱۷۶ھ) اور ان کے خاندان کی اس قرآنی زبان سے خصوصی دل چسپی اور اس کی ترویج و اشاعت میں خاندانِ ولی اللہی اور درسگاہِ ولی اللہی کے تلامذہ کی مسلسل کی جانے والی کوششوں کا مختصر ترین تعارف ہے جو تقریباً ۱۸۵۷ء

کی انقلابی کوشش پر آ کر ختم ہوتی ہے۔

چھٹی فصل ''دینی مدارس کی نشأۃِ ثانیہ اور عربی زبان و ادب'' میں ۱۸۵۷ء میں ناکام خونیں انقلاب کے بعد مسلمانوں کو پیدا شدہ معاشی، معاشرتی و مذہبی مشکلات اور ان کے نتائج میں قائم شدہ دینی مدارس اور ان مدارس کے ذریعہ عربی زبان و ادب سے خصوصی تعلق کا تذکرہ ہے، یہی وہ سبب ہے کہ ماضی قریب میں ان مدارس سے عربی زبان و ادب کے مشہور ادباء و شعراء نے جنم لیا، جس کی ایک واضح مثال مولانا ظفر احمد عثمانی بھی ہیں۔ اس طریقہ پر پہلا باب چھ فصلوں پر تقسیم ہے۔

دوسرے باب کا تعلق مولانا کے حالاتِ زندگی سے ہے۔ اس باب کی پہلی فصل میں مولانا کے آبائی وطن دیوبند کے سلسلہ میں کچھ تاریخی معلومات فراہم کی گئی ہیں، نیز مولانا کے خاندان کے کچھ مشہور افراد کا مجمل تذکرہ و تعارف بھی ہے۔

دوسری فصل میں ''پیدائش اور تعلیم و تربیت'' موضوعِ بحث ہے۔ اس میں مولانا کی پیدائش، بچپن، تھانہ بھون منتقلی، تعلیم و تربیت، مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خصوصی تعلق کا تذکرہ ہے۔

اس باب کی تیسری فصل مولانا کی تدریسی مصروفیات سے متعلق ہے، جس میں مولانا کے مختلف مدارس و جامعات میں درس و تدریس اور ان سے فیض یافتگان نمایاں شاگردوں کا ذکر ہے۔ اس میں مولانا کی علمی قابلیت اور تدریسی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھی فصل ان کی عائلی زندگی پر مشتمل ہے۔ جس میں ان کی شادی، اولاد وغیرہ کا مختصر سرسری تذکرہ ہے۔ اس باب کو ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، کیوں کہ ان کے تفصیلی حالات جاننے کے لئے ''تذکرۃ الظفر'' دستیاب ہے۔ ہماری زیادہ تر کوشش یہ رہی ہے کہ مولانا کی حیات سے متعلق ان گوشوں پر زیادہ روشنی ڈالی جائے جو ان کی عملی زندگی سے متعلق

ہیں، اسی وجہ سے ہم نے مولانا کی سیاسی زندگی کو باقاعدہ باب کی شکل دی ہے۔

تیسرے باب کی پہلی فصل میں مولانا کی سیاسی زندگی کے پسِ منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فصل میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو جن حالات کا شکار ہونا پڑا اور اس کے نتیجہ میں جن مختلف سیاسی جماعتوں کا وجود عمل میں آیا اور پھر ان جماعتوں نے مسلمانوں پر جو اثرات مرتب کئے ان کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ تاکہ ایک علمی شخصیت کے اچانک سیاسی میدان میں کود جانے کی وجوہات کا پتہ لگ سکے۔

دوسری فصل ''مولانا ظفر احمد صاحب کی سیاسی خدمات'' کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس فصل میں مولانا ظفر احمد صاحب کی ان کوششوں اور کاوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے جو انہوں نے مسلم لیگ کے تئیں انجام دیں، جن کے نتیجہ میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا، سلہٹ ریفرینڈم اور لیاقت، کاظمی الیکشن کے موقع پر مولانا نے جو جدوجہد کی اس کو بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری فصل میں مولانا ظفر احمد عثمانی اور ان کے ہم خیال دیگر علمائے کرام کی قیامِ پاکستان کے سلسلے میں کی گئی مخلصانہ کوششوں نیز ان کے اس مطالبہ سے اختلاف رکھنے والے علمائے کرام کی اخلاص کے ساتھ کی گئی مخالفانہ مساعی کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے خصوصی طور پر مولانا کی مثالی کوششوں کا بے لاگ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھی فصل میں مولانا کی ان کوششوں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، جو انہوں نے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد موقع بہ موقع انجام دیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا اگرچہ یکسوئی کی زندگی اختیار کر کے اپنے دیرینہ علمی و ادبی ذوق کی آبیاری کرتے ہوئے درس و تدریس میں مشغول ہو گئے تھے، لیکن جب کبھی بھی انہوں نے مخالف طبقہ کی طرف سے کی جانے والی لا مذہبی یلغار کو محسوس کیا تو وہ اس کی مخالفت میں سدراہ بن گئے۔ اس سلسلہ میں کی گئی مولانا کی خدمات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں مولانا کی علمی وادبی خدمات کی وضاحت کی گئی ہے، جو تین فصلوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل میں مولانا کے مطبوعہ ان اردو مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے جو بحث ومباحثہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں سود، اسلام میں نظامِ جاگیرداری، شاہ ولی اللہ دہلوی کی حکمت، ہندو پاک میں رہنے والے شوہر بیوی کے درمیان طلاق وغیرہ کے مسائل وہ مضامین ہیں جو اپنے دور میں علماء کرام کے درمیان موضوعِ بحث بنے رہے۔ چونکہ نئے زمانہ کے ساتھ ان موضوعات کے تئیں نئے نئے مسائل جنم لے رہے تھے، اس لئے ان مسائل سے متعلق علماء نے اپنی اپنی فکر کے مطابق آراء پیش کیں، جنہوں نے بحث ومباحثہ کی شکل اختیار کر لی، جن کے نتیجہ میں بہت سے علمی نکات منظرِ عام پر آئے۔ مولانا نے ایک عالمِ دین ہونے کے ناطے شرعی حدود اور شرعی تقاضوں کے مدِّنظر یہ مضامین لکھے۔ اس فصل میں انہیں مضامین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس باب کی دوسری فصل مولانا کی اردو تصنیفات وتالیفات اور تراجم سے متعلق ہے۔ مولانا نے جب جب عوامی رہنمائی کی خاطر کسی کتاب کی تصنیف، تالیف یا کسی مفید عربی کتاب کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی تو اسے شبانہ روز کی محنت وکاوش سے عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ اس فصل میں انہیں مطبوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

تیسری فصل مولانا کی عربی تصنیفات وتالیفات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس فصل میں مولانا کی عربی مطبوعات خصوصاً فقہِ حنفی کی معتبر ترین ذخیرۂ احادیث پر مشتمل ان کی مشہور و معروف تالیف اعلاء السنن کا قدرے تفصیلی تعارف ہے، کیوں کہ بیرونِ ہند بالخصوص علمائے عرب کے علمی حلقوں کے درمیان مولانا کے تعارف کا ذریعہ یہی کتاب بنی، جس نے انہیں عالمی شہرت وقبولیت عطا کی۔ علاوہ ازیں تفسیر، فتاویٰ اور دیگر موضوعات پر مشتمل ان کی دوسری عربی مطبوعات کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔

پانچویں باب میں مولانا کی عربی شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ فی الحقیقت یہی باب اس

تحقیقی مطالعہ کا مقصد ہے۔ یہ باب پانچ فصلوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی فصل نعتِ نبوی پر مشتمل ہے۔ مولانا نے حضورِ اکرم ﷺ کی محبت سے سرشار ہوکر زبانِ رسول مقبول ﷺ (عربی) میں نعتیہ قصائد کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا، جو ''نورعلی نور'' اور ''وسیلۃ الظفر'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اول الذکر میں دو قصائد ہیں، جب کہ مؤخر الذکر ایک طویل قصیدہ ہے۔ جن کا اس فصل میں جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز مولانا کے فنی محاسن اور قصائد میں مذکورہ قرآنی تلمیحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری فصل مدحیہ قصائد پر مشتمل ہے۔ ان قصائد میں مختلف شخصیات کی خصوصیات کو منظوم کیا گیا ہے۔ ان میں سے جو قصائد ہمیں دستیاب ہوسکے ان کو ضروری تذکروں کے ساتھ اس فصل میں شامل کر دیا گیا ہے۔

تیسری فصل میں وہ مراثی پیش کئے گئے ہیں جن میں مولانا نے اپنے اعزاء، احباب اور پیرومرشد کی وفات پر مختلف اوقات میں اپنے رنج وغم کا اظہار کرنے کی خاطر نظم کئے ہیں۔ یہ مراثی بھی مولانا کی شاعری کا مرتبہ متعین کرنے میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔

چوتھی فصل میں وہ تقاریظ ہیں جو مولانا نے اپنے متعلقین کی کتابوں کی تعریف وتوصیف میں نظم کی ہیں۔

پانچویں فصل میں مولانا کی شاعرانہ خوبیوں کا تحلیل وتجزیہ ہے۔ اصلاً یہ ان کی شاعری کے محاسن ومعائب کا ایک طالب علمانہ تنقیدی مطالعہ ہے، جسے اس مقالہ کا تتمہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

بہر حال ہم نے اس مقالہ میں مولانا کی علمی خدمات کو ضمناً اور ادبی خدمات کو موضوعاً زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جو اس سے قبل ہماری معلومات کے مطابق نہیں کی گئی تھی۔ اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب رہے اور کہاں تک ناکام؟ اس کا فیصلہ تو قارئین

ہی کریں گے، ہمیں اس مقالہ کی تیاری میں جن مشکلات سے گذرنا پڑا ان کا تذکرہ بالکلیہ فضول معلوم ہوتا ہے، لیکن سب سے بڑا دقت طلب مسئلہ یہ رہا کہ مولانا سے متعلق علی گڑھ میں مواد دستیاب نہیں ہوا جس کی وجہ سے ہمیں دہلی، دیوبند، سہارنپور، کاندھلہ، تھانہ بھون وغیرہ کے مختلف اداروں اور متفرق ذاتی کتب خانوں میں ورق گردانی کرنی پڑی۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ کئی کئی دن کی محنت کے بعد بھی مطلوبہ چیز نہیں مل سکی، تاہم مختلف علمی حلقوں اور علم دوست حضرات کی رہنمائی سے یہ مقالہ تکمیل تک پہونچا، جو بہرطور شکریہ کے مستحق ہیں اور جن کے لئے صمیمِ قلب سے دعاؤں کی سوغات کے علاوہ کچھ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اخیر میں ہم اس حقیقت کا اعتراف لازمی تصور کرتے ہیں کہ پیشِ نظر مقالہ خالصۃً طالب علمانہ کوشش ہے، علم و تحقیق کی رو سے اس میں بہت سی خامیاں اور کوتاہیاں نظر آئیں گی۔ اس لئے ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ اسے اسی نظریہ سے دیکھیں اور جو نقائص نظر آئیں ان کی نشان دہی فرماتے ہوئے حوصلہ افزائی فرمائیں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

عبید اقبال عاصم

ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قسم اللغة العربية و آدابها
جامعة عليكره الاسلامية، عليكره (الهند)

التاريخ ....

External 709062
Unv Ex 700920
Internal 222
DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202002 (U P) INDIA

Dated 19.02.2002

TO WHOM IT MAY CONCERN

This is to certify that Mr. Ubaid Iqbal Asim En. No. Z-8737, Admission No. 949530 a *Research Scholar* in the Department of Arabic has completed his Ph.D. Thesis entitled "Maulana Zafar Ahmad- His life and works". Under my supervision. The work is original and satisfactory. Now it is forwarded for the award of Ph.D. degree in Arabic.

A.S. Islahi

(Dr. Abu Sufyan Islahi)
Supervisor

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ

تقدیم

اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور غیر معمولی احسانات و انعامات کے باعث اپنا تحقیقی مقالہ ''مولانا ظفر احمد۔ حیات و خدمات'' کے عنوان سے پیش کر رہا ہوں، جو میری چار سالہ کاوشوں کی ایک حقیر پیش کش ہے۔

۱۹۹۷ء میں پی، ایچ، ڈی کے رجسٹریشن کے لئے جب میں نے مختلف شخصیات کا مطالعہ کیا تو مجھے مولانا کی شخصیت اس حیثیت سے ممتاز نظر آئی کہ عربی زبان و ادب میں ان کی قابلِ قدر خدمات کے باوجود کم از کم ہندوستان میں اب تک ان کی طرف کسی محقق نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اگر اس کی وجہ ان کی عزلت پسندی اور گوشہ نشینی قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جب میں نے ان کی کچھ کتابوں اور قصائد پر نظر کی تو مجھے یہ شخصیت جاذبِ نظر معلوم ہوئی۔ نقلِ وطن کر جانے کی وجہ سے ہندوستان میں ان کی گراں قدر شخصیت نظروں سے اوجھل ہوگئی، اعلاء السنن (بیس ضخیم جلدوں میں) کی وجہ سے انہیں ایک مستند حنفی عالم کی حد تک محدود کر دیا گیا، جب کہ ان کو عربی شعر گوئی میں کمال درجہ کا درک حاصل تھا اور وہ فی البدیہہ شعر گوئی میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ ان کے شعری سرمایہ میں معنی آفرینی، ندرتِ خیال، جدتِ طبع، فکری گہرائی، منظر کشی اور صوری و معنوی حُسن پایا جاتا ہے، لیکن نہ جانے کیوں ان کے منظوم کلام کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اس گوہرِ یکتا کو عام کرنے کی غرض سے میں نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے مولانا پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا ارداہ کیا، حالانکہ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان میں اس کام کا قرعۂ فال اپنے نام نکلوانے کی وجہ سے مجھے کچھ نہ کچھ مشکلات سے گذرنا پڑے گا۔ میں ان تمام مشکلات کی پرواہ کئے بغیر اپنی منزلِ مقصود کی طرف چل پڑا۔

اس عظیم شخصیت کا تعلق چونکہ بیسویں صدی سے ہے، اس لئے قوی امید تھی کہ ان کی حیات و خدمات پر مواد فراہم ہو جائے گا۔ انہیں امیدوں کے سہارے ابتدائی سال میں مختلف شخصیات سے رابطہ قائم کیا، اس اثناء میں برِصغیر (ہند، پاک و بنگلہ دیش) کے مختلف مدارس و جامعات میں مولانا کے موجودہ اعزاء، متعلقین، مختلف علمائے کرام اور اصحاب ذوق کو خطوط لکھے گئے، بیشتر حضرات کی طرف سے مدد تو درکنار خط کا جواب بھی موصول نہیں ہوا، جس سے یک گونہ مجھے اپنی منزل کی تلاش و یافت میں مایوسی کا احساس ہوا۔ چونکہ مولانا کا تعلق دیرینہ روایات کے حامل مدارس سے رہا اور ان کا زیادہ تر کام بھی اسی نوعیت کا ہے، ان کے فیض یافتگان اور تلامذہ بھی انہیں روایات کے حامل رہے، اس لئے جن خطوط کے جوابات ملے وہ اکثر و بیشتر عقیدت سے تعلق رکھتے تھے اور میں اپنی تحقیق کو عقیدت تک محدود کر کے حقیقت سے غافل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے ان کی

حیات وخدمات بالخصوص ان کی منظومات کا تنقیدی جائزہ لینا تھا جس میں حقائق سے بحث کرنی تھی، اس لئے ان خطوط سے بھی میرا مقصد حل نہیں ہو پایا۔ اب مجھے واقعی مشکلات کا اندازہ ہوا، لیکن الحمد للہ، خداوندِ قدوس کی وسعتِ رحمت سے ایک لمحہ بھی مایوس نہیں ہوا، پر خطر پگڈنڈیوں پر چل پڑا، اور اپنے خاکے میں رنگ بھرنے کا آغاز کر دیا، اپنے محسنین ومعاونین کے حضور دستِ تعاون دراز رہا، اللہ تعالی کا شکر ہے کہ آج یہ مقالہ کسی نہ کسی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ مقالہ کے پانچ ابواب کو مختلف ذیلی عناوین کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب عرب و ہند کے دیرینہ تعلقات پر مشتمل ہے، کیوں کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب کے ارتقاء کی بنیادیں انہی مراسم سے مربوط ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان کے مختلف ادوار میں عربی زبان وادب سے متعلق جو خدمات انجام دی گئیں ان کا نہایت اختصار کے ساتھ سرسری جائزہ لیا گیا ہے جو مختلف زمانوں کی مختلف شخصیات سے ہوتا ہوا مولانا ظفر احمد صاحب تک پہونچتا ہے۔

دوسرا باب مولانا کی حیات کے تعلق سے ہے۔ جس میں ان کے خاندان، تعلیم وتربیت، درس وتدریس اور عائلی زندگی کو بالاختصار پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں ان سیاسی امور کو شامل کیا گیا ہے جن کی وجہ سے مولانا جیسے علمی مزاج رکھنے والے گوشہ نشین حضرات کو اس وادیٔ ''غیر ذی زرع'' میں اترنا پڑا۔ چونکہ قیام اور تشکیلِ پاکستان کے تناظر میں مولانا کی ان سیاسی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کو ایک باب کی شکل دی گئی۔ اس باب میں ضمناً کانگریس، مسلم لیگ اور اس وقت کی دوسری متحرک سیاسی، غیر سیاسی ملی تنظیموں کا تذکرہ بھی ضمناً شامل ہے۔

چوتھا باب مولانا کی علمی خدمات پر مبنی ہے۔ اس باب میں مولانا کی عربی اور اردو تصانیف، تالیفات اور تراجم کے ساتھ ساتھ ان اہم ترین علمی مقالات کا بھی تعارف کرایا گیا ہے جو اپنے علمی وتحقیقی زاویوں کی بناء پر اہلِ علم کے مابین مقبول ہوئے۔

پانچواں باب بطورِ خاص مولانا کی عربی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا کے نعتیہ قصائد، عمومی قصائد، مراثی اور تقاریظ وغیرہ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ آپ کے سامنے ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہر طرح مکمل اور غلطیوں سے پاک وصاف ہے یا میں نے اس کا مکمل حق ادا کر دیا ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ پیش کیا جائے ترتیب، قرینہ اور سلیقہ سے پیش کیا جائے، جس کا تمام تر سہرا استاذِ محترم، نگرانِ مقالہ، مشفق ومکرم ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب استاد شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے سر بندھتا ہے جن کا مجھے ہر ہر قدم پر دوستانہ تعاون حاصل رہا، ان کی کوشش ہر ممکن حد تک یہ رہی کہ یہ

مقالہ صحیح طریقہ سے مرتب ہو جائے، اسلئے اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو وہ ان کی مساعی جلیلہ کی بدولت اور اگر خامیاں ہیں تو راقم کی کم علمی اور تساہلی کے باعث۔ ناظرین سے اتنی گذارش ضرور ہے کہ وہ فروگذاشتوں پر متنبہ ضرور فرمائیں تاکہ ان کی اصلاح ہو سکے۔

اس سلسلہ میں جن دیگر حضرات کا مسلسل تعاون حاصل رہا ان میں میرے مشفق استاد مولانا مفتی فضیل الرحمان ہلال عثمانی (مفتی اعظم ریاست مالیر کوٹلہ)، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب اور مولانا شاہد صاحب استاد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور کا نام سرِ فہرست ہے۔ ان حضرات نے انتہائی شفقت ومحبت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزائی کی، بلکہ عملی تعاون بھی دیتے رہے۔ جب بھی کوئی ضرورت محسوس ہوئی یا ان حضرات کے علم میں مولانا کے تعلق سے کوئی نئی بات سامنے آئی، انہوں نے فوراً مجھے توجہ دلائی جس کی وجہ سے مجھے مقالہ کی تیاری میں بہت تقویت ملی۔

مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں معاونین کا شکریہ ادا کرنا فعلِ مستحسن ہے۔ اس استحسان کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے میں صمیم قلب سے ان تمام حضرات کا شکر گذار ہوں جو وقتاً فوقتاً مجھے اپنے ذرّیں مشوروں کے علاوہ عملی تعاون سے نوازتے رہے، یہ فہرست اگر چہ طویل ہے تاہم بڑی ناسپاسی ہوگی اگر کچھ اپنے محسنین کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ مذکورہ بالا معاونین کے علاوہ اپنے اساتذۂ کرام مولانا سید انظر شاہ، صدر المدرسین، دار العلوم وقف، دیوبند، مولانا خورشید عالم صاحب، استاد دار العلوم وقف، دیوبند، مولانا ریاست علی صاحب بجنوری، استاد دار العلوم، دیوبند، محترم پروفیسر عبد الباری صاحب، صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ذی وقار پروفیسر کفیل احمد قاسمی صاحب، ڈاکٹر محمد اعظم قاسمی صاحب، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب، محترم ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی صاحب اور مولانا احمد خضر شاہ، استاد دار العلوم (وقف)، دیوبند کا بطورِ خاص شکر گذار ہوں جن کا دستِ تعاون میرے لئے بہر آن وارہا۔ جب بھی کوئی مشکل درپیش ہوئی تو ان حضرات نے اسے آسان سے آسان تر کر دیا۔ ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا الفاظ میں ممکن نہیں، کیوں کہ صرف شکریہ ادا کر کے ان احسانات سے سبک دوش نہیں ہو سکوں گا جو ان حضرات نے میرے ساتھ فرمائے ہیں، اللہ تعالی ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

علاوہ ازیں میں اپنے ان تمام رفقاء کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن کا دوستانہ تعاون مجھے حاصل رہا۔ ان میں شعبۂ عربی کی لائبریری کے سبھی اراکین بالخصوص کبیر احمد صاحب، خالد صاحب، انیس صاحب اور مقیت صاحب وغیرہ کا، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے کتب بینی میں میری بھرپور مدد کی۔ برادرم ڈاکٹر شبیر احمد قاسمی صاحب، سید علیم اشرف جائسی، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، ڈاکٹر سرور عالم ندوی، توقیر احمد ندوی اور برادرم اصطفاء الحسن کاندھلوی بھی شکریہ کے بطورِ خاص مستحق ہیں جن کے دوستانہ انداز کے علمی مباحثے اور تیکھی نوک جھونکوں سے مقالہ کی تکمیل میں بہت مدد ملی۔ عزیز دوست سید سلمان احمد ترمذی نے اس دوران مجھے بہت سے گھریلو تفکرات سے آزاد رکھا وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

اخیر میں ان شخصیات کا ذکر بھی ان معاونین کی فہرست میں کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے اس مقالہ کو لکھنے پر نہ صرف یہ کہ اکسایا، بلکہ ڈھیل ڈالنے پر میری فہمائش بھی کی اور زجر وتوبیخ بھی۔ میری مراد اپنے والدین محترمین سے ہے۔ اللہ تعالی ان کا سایہ تا دیر عافیت کیساتھ قائم رکھے اوران کو صحت وسلامتی وتندرستی سے نوازے، آمین۔

شکریہ کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا، اس میں مجھے اپنی اہلیہ صالحہ ترمذی اور عزیز بچوں (عدیلہ، عمر، حلیمہ اور احمد) کو بھی شامل کرنا ہے، جو مجھے اس کے لئے مسلسل اکساتے رہے اور جب کبھی مجھے اس طرف سے غافل پایا تو پیار ومحبت کی فضا میں مجھے مجبور کر دیا کہ میں غفلت نہ برتوں، اہلِ خانہ نے مجھے اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں ہر قسم کی پریشانیوں اور افکار سے آزاد رکھ کر سکون واطمینان سے کام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے معاونین کا شکریہ کیسے ادا کیا جائے؟ دعاؤں کے علاوہ بالکل تہی دامن ہوں، اللہ تعالی ان سب حضرات کی دامے، درمے، قدمے، سخنے مدد فرمائے۔ میری یہ کوشش بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو اور قارئین کو پسند آئے، آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

عبید اقبال عاصم

شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰ردسمبر ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

عرب و ہند کے تعلقات

عربی زبان قدیم سامی النسل زبانوں میں سے ایک زندہ جاوید زبان ہے۔امتیازی خصوصیات کے باعث اس نے دنیا کے ہر ہر خطے کے انسانوں کو متاثر کیا۔مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآنِ حکیم کے عربی زبان میں نازل ہونے کی وجہ سے اس کو مزید مقبولیت حاصل ہوئی، اور فی الحقیقت اس کو دوام ملا۔عربی تہذیب وثقافت ایک گوشے سے نکل کر دوسرے گوشے تک جہاں بھی گئی تو اس نے وہاں کے ادب کو مالا مال کیا۔ یہ زبان اپنے اختصار وایجاز کے باعث ابتداء سے ہی اپنے اندر کشش لئے ہوئے تھی۔قرآن کریم کے معجز نما اثرات نے اس کو عمر لازوال عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

سرزمین عرب میں نشو ونما پانے والی عربی زبان اور اس کے ادب کے تعارف اور اس سے دلچسپی کا زیادہ تر انحصار قرآن کریم پر ہی ہے۔لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان اور اس کا ادب شروع ہی سے مالا مال تھا۔اور اسلام سے پہلے بھی اس کے اندر وافر مقدار میں ادبی سرمایہ موجود تھا۔چنانچہ زمانۂ جاہلی کے معلقات آج بھی عربی شعر وادب کی مایۂ ناز وقابل افتخار ادبی دولت ہے، جس نے ہر دور اور ہر جگہ کے ادب پر اپنے اثرات ڈالے ہیں۔

دنیا کے اور ممالک کی طرح ہندوستان بھی وہ ملک ہے جہاں اسلام آنے کے بعد اس کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انفرادی واجتماعی طور پر انجام دیا گیا۔اور اس تبلیغ سے باشندگانِ ہند متاثر ہوئے اور انہوں نے اسلام کی حقّانیت وصداقت پر ایمان لاکر اپنے کو مسلمانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔قرآن مجید کی تلاوت اور اس کی تفہیم وتشریح کے لئے ضروری تھا کہ عربی زبان سے کما حقہ واقف ہوا جائے۔ چنانچہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہاں پر عربی زبان وادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔لیکن جہاں تک عرب اور ہندوستان کے تعلقات کا سوال ہے تو حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلقات انتہائی قدیم ہیں۔ ماقبل اسلام کے ان تعلقات کو ہم تاجرانہ اور مابعد اسلام کے روابط کو برادرانہ نام تو دے سکتے ہیں لیکن ان قدیم تعلقات سے انحراف نہیں کر سکتے۔اسی لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً دونوں زمانوں کے تعلقات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔

پہلی فصل: ماقبل اسلام

ہندوستان اور عربوں کے تعلقات کی قدامت کا اندازہ لگانا ہر دور کے مؤرخین و محققین کے لئے بے انتہاء مشکل ہوا ہے، اگر اس تعلق کو ازلی تعلق کا نام دیا جائے یا نسل انسانی کی بقاء کا باعث قرار دیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ کیونکہ حضرت آدمؑ کو دنیا میں جس پہاڑی پر اتارا گیا وہ بعض مؤرخین کے نزدیک سراندیپ میں واقع ہے جو قدیم زمانہ میں غیر منقسم ہندوستان کا ہی ایک حصہ تھا، اور حضرت حوّاؑ جدّہ میں اتاری گئیں جو آج بھی سرزمینِ عرب کا حصہ ہے۔ آدم وحوّا علیہما السلام سے ہی نسلِ انسانی وجود میں آئی۔ اس لئے اس تعلق کو ازلی تعلق کہنا بہر طور مناسب ہے۔ غلام علی آزاد بلگرامیؒ، شیخ علی رومیؒ کے حوالے سے سبحۃ المرجان میں تحریر فرماتے ہیں۔

”قال الشيخ على رحمة الله عليه فى كتاب " محاضرة الاوائل و مسامرة الاواخر":اول موضع انفجرت فيه ينابيع الحكم الهند، ثم الحرم المكى، على لسان العلم الاول الى البشر آدم الصفى“(۱)

امام ابن حاتم رازی، امام عبداللہ حاکم، امام ابن جریر طبری اور امام سیوطی رحمہم اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے:

”ان اول ما اهبط الله آدم الى ارض الهند“(۲)

اور مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے یہ روایت بھی بیان کی ہے:

ان آدم هبط با رض الهند و معه اربعة اعوار من الجنة ، فهى هذه التى يتطيب الناس بها و انه حجّ هذا البيت“(۳)

مندرجہ بالا تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب اور ہند کے تعلقات نسلِ انسانی کی ابتداء سے چلے آرہے ہیں۔ اور سمندر کی طویل مسافت کے باوجود دونوں میں بہت سی باتیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی مرحوم:

”اس جل تھل سمندر کا ایک ہاتھ اگر عربوں کے ارضِ حرم کا دامن تھامے ہوئے ہے تو اس کا دوسرا ہاتھ ہندوؤں کے آریہ ورت کے قدم چھوتا ہے۔ دنیا کے کنارے کے ملک فطرتاً تجارتی ہوتے

---

(۱) سبحۃ المرجان/سید غلام علی آزاد بلگرامی/معہد الدراسات الاسلامیہ، علی گڑھ ۱۹۷۶ھ/ص: ۹۔

(۲) تذکرہ مشائخِ ہند/محمد اسلام الحق مظاہری/اسلامی دار المطالعہ، سہارنپور، ۱۳۹۸ھ/ج:۱/ص:۹۔

(۳) ایضاً/ص:۹۔

ہیں۔ یہی پہلا رشتہ ہے جس نے دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا۔ عرب تاجر ہزاروں برس سے ہندوستان کے ساحل تک آتے تھے اور یہاں کے بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے ذریعہ یورپ تک پہونچاتے تھے۔ اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائرِ ہند اور چین و جاپان تک لے جاتے تھے“۔[1]

ان تعلقات نے ہندوعرب کو نہ صرف یہ کہ تجارت کی لڑیوں میں ہی پرو دیا تھا بلکہ ان میں بہت سی مذہبی و تہذیبی باتیں بھی مشترک پائی جاتی تھیں۔ ہندوستانیوں کے بہت سے قبیلے ہزاروں سال پہلے عرب میں جا بسے تھے۔ اسی وجہ سے ہندی بستیاں اور ہندی قومیں عربوں میں معروف تھیں، دونوں میں مذہبی اشتراک اس بنا پر بھی تھا کہ اسلام کی آمد سے قبل تک دونوں ہی مشرکانہ رسومات کے پجاری تھے، چونکہ کعبہ اس وقت تک بُت پرستی کا عظیم مرکز تھا، اس لئے ہندوستانی الاصل عرب باشندوں کو بھی اُس سے عقیدت و تعلق تھا، اس تعلق کی نسبت سے علامہ عبدالکریم شہرستانی ”الملل والنحل“ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”ان العرب والهند يتقاربان على مذهب واحد. واكثر ميلهم الى تقرير خواص الاشياء و الحكم باحكام الماهيات و الحقائق و استعمال الأمور الروحانية“[2]

کعبۃ اللہ کے دوام و بقاء کے تعلق سے بت پرستوں کی ایک جماعت یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ وہ (کعبہ) زحل ستارے کے نام پر بنایا گیا ہے۔ اور قاضی اطہر مبارکپوری کی تحقیق کے مطابق ”ہندوستان کے ہندو بھی ان ہی بت پرستوں میں تھے جو کعبہ زحل ستارے کا ہیکل مان کر اس کی تعظیم و تکریم کے قائل تھے“۔[3] ہندوستانی باشندے نہ صرف یہ کہ خانۂ کعبہ کا ہی احترام کرتے تھے بلکہ ”وہ عرب کے بعض دوسرے بت خانوں کا بھی احترام کرتے تھے“۔[4]

ہندوستان کی جو قومیں عرب میں سکونت پذیر تھیں ان میں زُط، مید، سیابچہ، اساورہ، احامرہ، بیاسرہ اور تکاکرہ (ٹھاکر) مشہور تھیں، یہ لوگ وہاں پر اپنے کچھ اوصاف کی وجہ سے ممتاز تھے۔ چنانچہ جاٹ اپنے رنگ، نسل، قد وغیرہ کی وجہ سے دور سے ہی پہنچانے جاتے تھے۔ اُن کے اسی وصف کے پیشِ نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج کے واقعہ کے بعد جب اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے تفصیلات بیان فرمائیں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعارف صحابۂ کرام کے ذہن سے قریب تر کرنے کے لئے انؑ کا حلیہ بیان فرماتے ہوئے ارشاد

---

(۱) عرب و ہند کے تعلقات/سید سلیمان ندوی/مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء/ص: ٦۔

(۲) الملل والنحل/محمد بن عبدالکریم الشہرستانی/مطبوعہ جامعہ ازہر، مصر، ۱۹۴۷ء/ص: ٦۔

(۳،۴) عرب و ہند عہدِ رسالت میں/قاضی اطہر مبارکپوری/ندوۃ المصنفین، دہلی، بدون تاریخ/ص: ۱۲٦۔

فرمایا:''کانه رجل من الزّط''۔ (۱)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک سے پتہ چلتا ہے کہ زُط (جاٹ) جو ایک ہندوستانی قوم تھی، اپنے رنگ، جسامت اور قدوقامت میں عربوں سے ممتاز تھی۔ اور عرب میں رہنے کے باوجود اُن پر عربی زندگی اس طرح مسلّط نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی ہندی زندگی کو بالکل ہی بھول گئے ہوں، یا چھوڑ بیٹھے ہوں بلکہ انہوں نے عربوں کی معاشرت کو اپنی عادات واطوار اور امتیازات سے متاثر کیا تھا۔ عرب کے ہندوستانی باشندوں کو اپنی ملکی اور قومی خصوصیات قائم رکھنے کی مکمل آزادی حاصل تھی اور انہیں کوئی بھی عربی زندگی، اور وہاں کی تہذیب وثقافت مسلّط کرنے کے لئے مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ دونوں ہی قومیں ایک دوسرے سے ہمدردی، آشنائی اور برادرانہ محبت کے باوجود کہیں مشترک تو کہیں امتیازی خصوصیات رکھتی تھیں، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی پہچان بھی آسانی سے ہو جاتی تھی۔ الغرض ہند اور ہندی تہذیب وثقافت زمانۂ قدیم سے ہی عربوں میں متعارف تھی۔ مزید برآں تجارتی روابط نے ان دونوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ عرب صرف ہندوستان کے افراد سے ہی نہیں بلکہ یہاں کی اشیاء سے بھی انسیت رکھتے تھے۔ اور ان اشیاء کو استعمال بھی کرتے تھے، انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے اور اس کا اظہار فخریہ انداز میں کرتے تھے۔ ہندی تلواریں، بخورات وغیرہ عربوں میں بہت زیادہ مقبول تھیں اور عرب شعراء ان کا تذکرہ اپنے اشعار میں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ زہیر بن ابی سلمٰی کے اس شعر نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی:

كالهندوانى لا يخزيك مشهده ☆ وسط السيوف اذا ما تضرب السُهُم (۲)

اسی طریقہ پر طرفہ بن عبد کا شعر:

و ظلم ذوى القربى اشد مضاضة ☆ على المرء من وقع الحسام المهند (۳)

درید کا شعر:

و تخرج منه جرة القرّ جُرأة ☆ وطول السرّى دُرّىّ غضب المهنّد (۴)

ایک اور شاعر کا شعر:

أعن لى على الهندى مهلاً و كرّةً ☆ لدى برك حتى تدور الدوائر (۵)

(۱) بخاری: کتاب: ''احادیث الانبیاء''، باب: ''قول اللہ عزوجل: واذکر فی الکتاب مریم''۔

(۲) دیوان زہیر بن ابی سلمٰی / مطبوعہ: بیروت: ۱۹۵۳ء / ص: ۱۳۵۔

(۳) دیوان طرفۃ بن عبد / مطبوعہ: بیروت: ۱۹۶۱ء / ص: ۳۶۔

(۵/۴) عرب ہند عہد رسالت میں / ص: ۴۲۔

اور فرزدق کہتا ہے:

متــقــلـــدی قـــلــعية و صـــوارم ☆ هـــنــدية و قـــديــمة الآثـــــار [۱]

شاعرِ اسلام حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں جو قصیدہ کہا تھا، جس سے خوش ہو کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رداءِ مبارک بطورِ انعام حضرت کعب کو عطا فرمائی تھی اُس میں بھی ہندی تلوار کا تذکرہ ملتا ہے، اس کا مشہور شعر یہی ہے:

ان الـــرســول لسیف یستــضـــاء بــــه ☆ مهـنّد من سیوف الـلـه مسلـول [۲]

یزید بن قیس کلابی کا یہ شعر بھی شہرتِ دوام حاصل کر چکا ہے:

اذا التـــاجـــر الهـــنــدی جـــاء بـفـــارة ☆ من المسك ضحّت فی سوا الفهم تجری [۳]

ہندوستانی قبیلہ جاٹ (زط) اپنی شجاعت، وفاداری اور دیانتداری کے سبب عربوں میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا، بعد از اسلام ایران کی شکست کے بعد چند شرطوں کے ساتھ جاٹ لشکرِ اسلام سے مل گئے تھے، اور اسلامی سپہ سالار نے ان کی بڑی عزت کی تھی۔ حضرت علیؓ نے خزانۂ بصرہ کی حفاظت جاٹوں کے ہی سپرد کی تھی۔ [۴]

تجارتی سامان

ابن خردازبہ نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان سے خوشبودار لکڑیاں، صندل، کافور، لونگ، جائفل، ناریل، کباب چینی، تن کے کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی دانت، گجرات سے سیسہ، دکھن سے قم (بکم) اور وادئ سندھ سے بانس اور بید بر آمد کئے جاتے ہیں''۔ [۵]

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عرب اور ہندوستان کے تعلقات زمانۂ قدیم سے رہے ہیں، اس لئے ان کی بود و باش، رہن سہن اور طرزِ معاشرت ہی نہیں بلکہ مذہبی امور میں بھی بسا اوقات یگانگت نظر آتی ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت

---

(۱) دیوان الفرزدق/ابوفراس، ہمام بن غالب فرزدق (شرح وضبط: استاد علی فاعور)/دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۷/ص: ۲۶۷۔

(۲) شرح دیوان کعب بن زہیر/ابی سعید الحسن بن الحسین/مطبوعہ: مصر: ۱۹۵۰ء /ص: ۲۳، وہندوستان اسلام کے سائے میں/قاضی وجدی الحسینی/طبع: بھوپال بک ہاؤس، بھوپال: ۱۹۸۲ء /ص: ۱۰۲۔

(۳) ہندوستان اسلام کے سائے میں/ص: ۱۰۱۔ نیز ملاحظہ کیجئے: الاصابہ فی تمییز الصحابہ/حافظ احمد بن حجر العسقلانی/مطبوعہ مصر/۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء/ج: ۱/ص: ۱

(۴) تاریخ الطبری/الشیخ ابوجعفر الطبری/مطبعۃ الحسینیہ، مصر: ۱۸۹۰ء/ج: ۵، ص: ۲۰۲۔

(۵) المسالک والممالک/الشیخ ابوالقاسم خردازبہ خراسانی/طبع: مصر: ۱۳۰۶ھ / ص: ۷۰-۷۱۔

سرزمینِ عرب میں ہوئی تو انہیں کے حالات سے کافی حد تک ملتے جلتے گوتم بدھ کا جنم ہندوستان میں ہوا۔ دونوں کے حالات میں کافی حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ ایسے ہی متس اوتار کی کتھا میں راجائت برت کے حالات اور طوفانِ نوح میں ایک حد تک مناسبت ہے۔[1] دونوں کی اصنام پرستی کی شراکت تو مشہور و معروف ہے ہی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان تعلقات نے تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی کافی حد تک متاثر کیا۔ اور آج تک عربی زبان میں بے انتہا ایسے ہندی الفاظ ملتے ہیں جن کی تعریب کر لی گئی ہے یا بذاتہ موجود ہیں۔ ہندوستانی باشندوں کی علمی زبان سنسکرت تھی، عربی زبان سنسکرت ہی نہیں، دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اہلِ ہند کے لئے اجنبی اور مشکل تھی۔ اس کی نحو، صرف اور لغت میں سے کوئی بھی سنسکرت کے ساتھ کسی طرح کی مطابقت نہیں رکھتی، اس لئے یہاں کے باشندوں کو عربی زبان سیکھنے کی اگر چہ ضرورت تو نہیں ہوئی تاہم عربوں کی ہندوستان میں آمد، اور یہاں کے افراد سے ربط و تعلق اس کا متقاضی تھا کہ گفتگو کے لئے کوئی زبان ہو جس سے ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو سمجھا جا سکے۔ اس طرح یہاں کی مقامی بولی میں بہت سے عربی الفاظ رائج ہو گئے (جنہوں نے بہت آگے چل کر باقاعدہ ایک کھچڑی زبان کی شکل اختیار کر لی جس کو اردو کا نام دیا گیا)۔

یہ تصویر قبل از اسلام کے تعلقات کی تھی۔ جو کہ دورِ جاہلی کہلاتا ہے۔ اسلام آنے کے بعد ان تعلقات کی نوعیت اس طور پر بدلی کہ مسلمانوں کی فکر اور سوچ ہی بدل گئی، انہوں نے اپنا جینا، مرنا، کھانا، پینا سب کچھ اسلام پر نچھاور کر دیا۔ وہ جہاں بھی گئے وہیں پر اپنی تہذیب و ثقافت، فہم و فراست، فکر اور اخلاقیات کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ گئے کہ جس سے قوموں کی زندگی تبدیل ہو گئی، خوابیدہ و منتشر فکروں کو بیداری نصیب ہوئی اور ان میں کچھ پانے اور کرنے کی دُھن سوار ہوئی تو افکار کے سوتے بدل گئے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے تعلقات کو باقاعدہ ایک عنوان کی شکل دے کر قدرے تفصیلی بحث کی جائے کیونکہ یہی وہ دور ہے جب عربی کو بین الاقوامی شہرت و عظمت بھی حاصل ہوئی اور عربی زبان نے مسلمانوں کی مذہبی زبان کی جگہ پائی۔ اور آج بھی عربی کا بیشتر ذخیرہ اسلام کا ہی مرہونِ منت ہے۔

---

(۱) ہندوستان میں عربی شاعری: مقالہ پی، ایچ، ڈی غیر مطبوعہ/ حامد علی خاں/مولانا آزاد لائبریری، اے، ایم، یو، علی گڑھ ، ۶۲ء /ص:۳۰۔

دوسری فصل: مابعدِ اسلام

جیسا کہ اس سے پہلی فصل میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ عرب و ہند کے تعلقات کی قدامت کا اندازہ لگانا مشکل ترین امر ہے۔ان دونوں کے درمیان تعلقات ابتدا سے ہی چلے آرہے تھے اور تجارتی رشتوں نے ان تعلقات کو مضبوط ترین کر دیا تھا۔جس کے باعث دونوں قومیں ایک دوسرے کے رہن سہن سے بخوبی واقف ہی نہیں بلکہ ایکدوسرے کی تہذیب وتمدّن پر اثر انداز بھی ہوئیں۔

حضرت محمد مصطفی ﷺ خلعتِ نبوت سے سرفرازی کے بعد جب عرب کے ظلمت کدوں کو تاریکی سے اجالے کی طرف لائے تو عربوں کا شعور روشن ہوا،اور جب اُن کے سامنے حق اور باطل واضح ہوگیا تو انہوں نے پیغامِ حق کو اپنے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے دوسروں تک پہونچانا،اندھیروں میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو روشنی کی طرف لانا، جہالت میں غرق انسانیت کو علم سے منور کرنا اپنا مذہبی وتہذیبی شعار بنالیا،اس کالازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے تعلقات کے معیار بدل گئے۔ان کی معاشرت کے انداز میں تبدیلی رونما ہوئی، ان کے رہن سہن اور تجارتی طور طریق میں واضح فرق آ گیا۔وہ جہاں جاتے وہاں اپنی اس نئی تہذیب کے اثرات چھوڑتے،کوئی ان سے ملتا تو اس کو اپنی متانت وسنجیدگی اور دینِ اسلام کی خوبیوں سے متاثر کرتے، پہلے سے کہیں زیادہ ان کی باتوں میں وزن تھا،ان کے کاروبار میں ایمانداری اور دیانت ان کا جزوِ ایمان تھا۔اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات نے ان کی زندگیوں میں ایک خوشگوار انقلاب برپا کیا تھا۔اللہ، رسول، قرآن و حدیث پر ان کا پختہ ایمان تھا۔انہیں فکر یہ تھی کہ انسانوں کو دوزخ سے کیسے بچایا جائے؟ ہمیشہ کی زندگی (آخرت) میں انسانوں کا اچھا انجام کیسے ہو؟ ان میں ایک جوش تھا،تڑپ تھی،وہ اپنے ہر ہر کام کو تبلیغ اسلام سے جوڑے ہوئے تھے۔

اسی دھن میں سوار وہ تجارتی سامان لے کر ہندوستان آئے تو انہوں نے اپنے اخلاق و عادات اور اپنی صداقت و دیانت سے باشندگانِ ہند کو متاثر کیا۔اس طریقہ پر یہ کردار وعمل کے ذریعہ اسلام کا پہلا پیغام تھا جو جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں پہونچا۔ان کے عقائد وعبادات اور دینِ اسلام کی لائی ہوئی تبدیلیوں کا شہرہ ہوا تو وہ عوام الناس سے لے کر راجاؤں کے محلات تک پہونچا۔ یہاں تک کہ اس پیغام کی حقانیت سے متاثر ہوکر جنوبی ہند کے علاقہ ملابار[۱] کے چیرامن وپیرومن کا آخری راجہ بطیبِ خاطر مشرف بہ اسلام ہوگیا۔[۲] اس کی راجدھانی کوڈنگیلور تھی۔اسی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے

---

(۱) مؤرخین نے اس لفظ (ملابار) کو مختلف طریقوں سے تحریر کیا ہے،بعض نے ملابار،بعض نے مالابار اور کچھ حضرات نے ملیبار لکھا ہے، جو ایک ہی شہر کا نام ہے۔

(۲) ہندوستان کے سلاطین،علماء ومشائخ پر ایک نظر/سید صباح الدین عبدالرحمان/ ماہنامہ معارف،اعظم گڑھ: مئی ۱۹۶۴ء: ۹۳/۵۔

ایک عرب کو اپنے یہاں بلا کر کنانور کا راجہ بنا دیا تھا۔[۱]

ادھر ایک طرف تاجروں کی یہ کوشش تھی تو دوسری جانب قدرتی طور پر ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے کہ جس سے یہاں مذہب اسلام کی راہیں ہموار ہو رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ شق القمر کا معجزہ جب ظہور پذیر ہوا تھا تو ہندوستان کے ایک راجہ نے بھی اس معجزہ کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا، اس کا تعلق بھی جنوبی ہند کے ملیبار (مالابار) علاقہ سے ہی تھا، راجہ نے اس معجزہ کے بعد اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عرب دیس میں ایک پیغمبر وارد ہوا ہے جس نے یہ معجزہ دکھایا ہے۔ اس کے بعد راجہ مسلمان ہو گیا اور عرب چلا گیا، سیّد سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب پہونچا۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں پہونچا اور یمن ہی میں ان کا انتقال ہوا، اور وہیں دفن ہوا۔[۲]

المختصر جنوبی ہند میں اسلام کے اثرات اس انداز سے بڑھ رہے تھے تو دکھن اور گجرات کے ساحلی علاقوں پر مسلمان عرب تاجروں کے اخلاق و عادات کچھ کم اثر انداز نہیں تھے۔ وہاں کے باشندے بھی عرب تاجروں کے معاملات سے متاثر ہو رہے تھے اور اس نئے مذہب کے تئیں اپنی دلچسپیاں دکھا رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سندھ بھی ان کے زیرِ اثر آتا جا رہا تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ہندوستان کے ہر ہر کونے کو متاثر کر ڈالا، اور وہ تعلقات جو ہزارہا برس سے تجارتی نوعیت کے تھے اب اسلام کی تبلیغ واشاعت سے متاثر ہو کر مذہبی ہوتے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں کہیں سلیم الطبع ہندوستانیوں کی وسیع النظری نے اس دعوت پر لبیک کہا تو کہیں اسلام اور مسلمانوں کو تنگ نظر افراد کی مزاحمتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ حضورِ اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک اور آپ سے متصل دور میں ہندوستان میں اسلام کی اشاعت مختلف طریقوں پر محدود پیمانے پر ہونے لگی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین و تبع تابعین کے دور تک ہندوستان اور اسکے اطراف و جوانب میں اسلام کی قندیلیں روشن دکھائی دینے لگیں۔ اس خطّہ میں اسلام کی اشاعت اور فروغ کے سلسلے میں تجار، محدّثین اور صوفیاء کرام وغیرہ سبھی کا تعاون رہا۔ انہوں نے اس پیغام کو عوام تک پہونچانے کے علاوہ خواصانِ مملکت یعنی راجاؤں، مہاراجاؤں کو بھی محروم نہیں کیا۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جن میں مختلف راجاؤں نے از خود اسلام کی طرف توجہ کی، چنانچہ ملیبار کے راجہ سامری کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے قدمِ آدم کی زیارت کے سلسلے میں آئے ہوئے کچھ افراد سے متاثر ہو کر اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور خفیہ طریقہ سے مسلمان ہو کر ان افراد کے ساتھ عرب چلا گیا۔ لیکن عدن کے قریب صحار میں جا کر اس کا انتقال ہو گیا۔[۳] لیکن پروفیسر ٹی

---

(۱) ہندوستان کے سلاطین، علماء و مشائخ پر ایک نظر/ ...

(۲) ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی/ سید سلیمان ندویؒ/ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ: ۱/۱۳: جنوری ۲۴ء۔

(۳) ساتویں صدی تک کے رجال السند والہند/ قاضی اطہر مبارکپوری/ معارف، اعظم گڑھ: ۴/۸۱: اپریل ۵۸ء۔

ڈبلیو آرنلڈ کا ماننا ہے کہ اس راجہ نے حکومت اپنے نائبین کو سونپ کر عرب کا سفر کیا جہاں وہ کچھ زمانہ رہا۔ اور پھر وہ اپنے وطن واپس ہو کر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے مقصد سے چلا لیکن راستہ میں بیمار ہوا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ (۱) قنوج کے راجہ سوبا تک کے بارے میں ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس حضرت حذیفہ، حضرت اسامہ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہم اجمعین کو دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا تھا۔ اس نے اسلام قبول کیا یا نہیں اس کے بارے میں اگر چہ صراحت نہیں ہے تا ہم اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے ہی ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کی کوششیں جاری تھیں۔ اس روایت کو اگر چہ علماء کرام زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس پر کلام کرتے ہیں تا ہم مورخین اس کا ذکر کرتے ہیں، راجہ ملیبار، جوپٹن کے راجہ کے اجداد میں سے تھا اس نے بھی خود سے ہی اسلام قبول کیا تھا۔ (۲)

عرب تاجروں اور عجمی صوفیاء کے تعلقات اور مخلصانہ کوششوں سے اسلام ہندوستان کے لئے مانوس مذہب ہو گیا اور اس نے جنوبی ہند، گجرات اور سندھ وغیرہ کے ساحلی علاقوں کے باشندوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔

جنوبی ہند اور گجرات وغیرہ میں اسلام کی اشاعت افہام و تفہیم اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر ہوئی تھی لیکن سندھ میں اسلام کی تبلیغ میں رکاوٹیں پیش آئیں حالانکہ یہاں پر جو قومیں آباد تھیں وہ زیادہ تر وہی تھیں جو عرب کے جزائر میں بھی پائی جاتی تھیں جیسے بید، زُط (جاٹ) تکاکرہ (ٹھاکر) وغیرہ۔ مسلمانوں نے سندھ میں قدم رکھا تو ان کا سب سے پہلا ٹکراؤ بودھ مت سے ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صدی کے اندر اندر ہندوستان سے بودھ مت کا زوال ہو گیا۔ سیّد سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق ''سندھ قوموں میں سب سے پہلے جاٹوں میں اسلام پھیلا۔ یہاں تک کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں جاٹ اپنا بودھ مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے لگے تھے۔ اور نو مسلم جاٹ عراق جا کر بسنے لگے تھے''۔ (۳) اسی کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے ابن خلکان کے حوالے سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ عراق میں جاٹوں نے علمی میدان میں خوب ترقی کی اور یہ بات اہلِ ہند کے لئے فخر کا باعث ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ہندی الاصل جاٹ تھے جنہوں نے امامِ اعظم کا لقب حاصل کیا۔ (۴) امام ابو حنیفہ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا خاندان فتحِ سندھ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔

ادھر عربوں کی اسلام کی اشاعت کے لئے یہ مخلصانہ کوششیں تھیں تو دوسری طرف ہندوستان کے صحیح الفکر افراد کی اسلام کے تئیں دل چسپی نے بھی اپنے اثرات پوری طرح دکھائے۔ اسی دل چسپی کی وجہ سے عہدِ رسالت میں ہی ایک وفد

---

(۱) The preaching of Islam/T.W.Arnald/ Reprinted 1990/ Low Price Publications, Delhi/ p:264.

(۲) ساتویں صدی تک کے رجال السند والہند/ معارف، اعظم گڑھ: ۸۱/۴۔

(۳) ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی/ معارف: ۱۳/۵: مئی ۴۴ء۔

(۴) ایضاً۔

سراندیپ سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوا جو بعض رکاوٹوں کے باعث عہدِ فاروقی کے ابتدائی ایام میں وہاں پہونچا اور براہِ راست اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ [۱] جس کا ذکر عجائب الہند میں اس طرح ہے کہ:

"و کان اهل سرنديپ و ما والاها لما بلغهم خروج النبی صلى الله عليه وسلم فارسل رجلاً فهيما منهم و امروه ان يسير اليه فيعرف امره و ما يدعو اليه ـ فعاقت الرجل عوائق و وصل الى المدينة بعد ان قُبِض رسول الله وتوفى ابو بكر و جد القائم بالامر عمر بن الخطاب رضى الله عنه فسأله عن امر النبی صلى الله عليه وسلم فشرح له و بين، ورجع فتوفى الرجل بنواحی بلاد مكران و كان مع الرجل غلام له هندیّ فوصل الغلام الى سرانديپ"۔ [۲]

اس کے بعد اس کی بھی صراحت ہے اس کا اثر اہلِ سراندیپ پر بہت اچھا واقع ہوا اور وہ مسلمانوں سے محبت کرنے لگے اور ان کا میلان اسلام کی طرف بہت زیادہ ہو گیا۔ [۳]

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کے لئے ہندوستان کے دو پنڈتوں کا (جو ریاست بھوپال کے راجہ بھوج کے درباری تھے) عرب جانے کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ بھوج نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی خاطر ان پنڈتوں کو عرب بھیجا تھا اور اپنی وسعتِ معلومات کے مطابق کچھ سوالات بھی قائم کئے تھے۔ اور ان جوابات سے بھی پنڈتوں کو آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جوابات دیں تو تم ان کی رسالت کو مان لینا۔ اسی کے ساتھ اس نے کچھ تحفے بھی بھیجے تھے۔ جن میں انگرکھا، پان، چھالیہ کتھا، چونا، لونگ، الائچی وغیرہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تحفوں کو قبول فرمایا اور ان سوالات کے جوابات قاصدوں کو بالکل صحیح دیے تو یہ دونوں مسلمان ہو گئے اور انہوں نے ہندوستان آ کر راجہ بھوج سے ان جوابات کے بارے میں بتلا دیا تو راجہ بھوج نے دھار کے بڑے مندر میں سب سے اوپر والی سیڑھی پر بیٹھ کر مجمعِ عام میں اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ یہ واقعہ ۳ھ مطابق ۶۴۳ بکرمی کا بتایا جاتا ہے۔ [۴]

اس روایت کی تصدیق و تکذیب سے قطعِ نظر اتنا تو بظاہر معلوم ہی ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں اس کی معطر فضائیں ہندوستان میں بھی اپنی خوشبو بکھیر رہی تھیں۔ اتنی بات تو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں

---

(۱) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں/ قاضی اطہر مبارکپوری/ ندوۃ المصنفین، دہلی: ۶۷ء / ص: ۲۴۔

(۲) عجائب الہند/ بزرگ شہریار رامہرمزی/ لیڈن/ ای، جے: بریل ۱۸۸۳-۱۸۸۶ء/ ص: ۱۵۶۔

(۳) عجائب الہند/ ص: ۱۵۷۔

(۴) ہندوستان اسلام کے سائے میں/ ص: ۲۱۴۔

ہندوستانی تحفوں کی ایک سند مستدرک میں امام ابوعبداللہ حاکم نے بھی نقل کی ہے جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے۔ اس روایت سے اگر چہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تحفے راجہ بھوج نے بھیجے تھے یا کسی اور نے ،البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ تحفے ہندوستانی تھے۔روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

''اهدى ملك الهند الى رسول الله صلى الله عليه وسلم جرة فيها زنجبيل فاطعم اصحابه قطعة قطعة و اطعمني منها قطعة''۔ (۱)

لیکن اس روایت کے آخر میں حاکم نے اس پر کلام کرتے ہوئے اس کی صراحت کی ہے کہ ''اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زنجبیل تناول فرمانے کے سلسلے میں مجھے یاد نہیں ہے اس لئے اس کو بیان کیا ہے''۔ (۲)

مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عرب اور ہندوستان کے وہ قدیم تعلقات جو حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے شروع ہوئے تھے ان میں بتدریج ارتقاء ہوتا گیا۔ اور اسلام کے ظہور کے بعد ان میں مزید ترقی ہوئی۔ اور یہ تعلقات طرفین نے نہ صرف یہ کہ بخوبی نبھائے بلکہ پیغامِ حق وصداقت پر ہندوستان کے دیانتدار باشندوں نے آمنا وصدقنا کہا اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں وہ کسی بھی طور پر عربوں سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے اسلام کی ہی نہیں بلکہ قرآن اور قرآن کی زبان عربی کی بھر پور خدمت کی۔ اور اس خدمت کو اپنا مذہبی اور تہذیبی فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔ اور فی الحقیقت عربی علوم وادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ جن کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ اس طرح یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہندوستان میں عربی زبان وادب پر ابتداء سے ہی کام کا سلسلہ جاری رہے۔

---

(۱) المستدرک/ابوعبداللہ حاکم/مطبوعہ: حیدرآباد/۳۵/۴ ۔

(۲) پیغمبر اسلام اور ہندوستان کے باشندے/قاضی اطہر مبارکپوری/معارف،اعظم گڑھ/فروری ۶۴ء / ۹۳/۲۔

تیسری فصل: عربی زبان وادب اور ہندوستان

گذشتہ صفحات میں عرب وہند کے تعلقات کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کو ہم کسی بھی طور پر زبان سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے ۔ کیونکہ ان تعلقات کو نبھانے کیلئے رابطہ کی کوئی نہ کوئی زبان ضرور ہوگی ۔ یقینی طور ہم یہی کہیں گے کہ وہ زبان یا تو ہندوستانی ہوگی یا پھر عربی، یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ہندوستان کی کبھی بھی کوئی زبان مشترکہ طور پر نہیں رہی بلکہ وہ علاقوں کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہی ۔ البتہ یہاں کی قدیم زبان سنسکرت کو بلا شک وشبہ ہندوستان کی علمی زبان کہہ سکتے ہیں ۔ اس کے برعکس تمام عربوں کی زبان صرف عربی ہی رہی ۔ اس لئے ہم کو اس تناظر میں دیکھنا ہوگا کہ عرب وہند کے وہ تجار جو اپنی تجارت کے فروغ کے سلسلے میں دونوں ملکوں کا سفر کرتے تھے، انہیں اپنا سامان خریدنے اور بیچنے کے لئے عربی اور ہندوستانی زبانوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنا ضروری تھا اسی لئے ہندوستانی تجار عربی زبان باقاعدہ سیکھتے تھے ۔ زبان دانی جب اصحابِ ذوق تک پہونچی تو یقینی طور پر انہوں نے اس میں چار چاند لگائے ۔ ہندوستانی تجار عربی زبان میں اپنا مافی الضمیر ہی نہیں ادا کرتے تھے بلکہ وہ اس کا حق ادا کرتے تھے ۔ اور صحیح صحیح بولنے کی کوشش کرتے تھے ۔ بزرگ بن شہریاران تاجروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ عربی زبان اس خوبی سے بولتے ہیں کہ ہمارے یہاں کے اچھے اچھے مولوی ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں ۔ یہ لوگ زیادہ تر سندھی، ملتانی اور گجراتی ہوتے ہیں ۔

ہندو پنڈتوں میں بھی اسلام کی آمد سے قبل ہی عربی زبان سیکھنے کا ذوق تھا ۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سرزمینِ عرب پر نبیؐ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوگا ۔ اسلام سے متعلق بھی انہیں ویدوں اور پرانوں کے ذریعہ کافی معلومات تھیں ۔ چنانچہ سراندیپ کے راجہ یا راجہ بھوج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انہیں علوم کی بنا پر تحقیق وجستجو کی اور اس کے لئے انہوں نے ایسے علمی افراد کا انتخاب کیا جو عربی زبان سے کما حقہ واقف تھے تبھی افہام وتفہیم میں آسانیاں فراہم ہوئیں ۔

راجہ بھوج کے جو سفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسلام سے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ہندوستانی تحائف پیش کرنے گئے تھے، ان میں سے ایک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے نام دریافت فرمایا تو اس نے کہا: "ماتا دین" ۔ آپؐ نے اس کا عربی ترجمہ معلوم کیا تو اس نے بتایا: "مراہوادین" ۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا

کہ مردہ دین چھوڑ کر زندہ دین کی طرف کیوں نہیں آتے؟ اس فرمانِ مبارک نے اس کے دل پر اثر کیا اور وہ فوراً مسلمان ہوگیا۔ آپؐ نے اس کا نام محی الدین رکھا''۔ (۱)

(اس روایت کی تصدیق اگر چہ نہیں کی جاسکتی اور اس میں ظاہری طور پر بھی بہت سی چیزیں غلط معلوم ہوتی ہیں، مثلاً آپ نے ایک سفیر کا ہی نام کیوں معلوم کیا؟ دوسرے یہ کہ آپؐ نے ''ماتا دین'' کا اگر مطلب معلوم کیا تھا تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نام عربی نہیں، ہندی تھا۔ اور ہندی لفظ ''ماتا'' عربی لفظ ''مات'' کے معنی میں مستعمل نہیں اور نہ ہی دین کے وہ معنی ہیں جو مذہب کے مشابہ ہوں) تاہم اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ ہندوستانی پنڈتوں میں عربی دانی کا ذوق تھا، اسی لئے جب یہ زبان ہندوستان آئی تو ہندی الاصل الفاظ سے متاثر ہوئی اور بہت سے ہندی الاصل الفاظ کی تعریب کی گئی لیکن اس نے دوسری سامی النسل زبانوں کے مقابلے میں بیرونی اثرات کو بہت کم قبول کیا اور اپنی حیثیت کو برقرار رکھا اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ عربی زبان وادب سے دوسری قوموں سے مسلمانوں کے میل جول کے بعد مختلف غیر زبانوں کے سینکڑوں الفاظ اور اصطلاحیں بجنسہ یا تھوڑے تغیر کے ساتھ عربی زبان میں منتقل کرلیں۔ (۲) سنسکرت ہندوستان کی قومی اور علمی زبان تھی۔ عربی زبان نے اس سے بہت سے الفاظ مستعار لے کر عربی الاصل شکل دے دی تھی۔ مثلاً صندل، مشک، تنبول، کافور، قرنفل، زنجبیل، نیلوفر، جائفل، اطریفل، ہیل، شجرہ، بلیلج، قرفس، نیلج، نارجیل، اورانج وغیرہ ہندی الاصل الفاظ چندن، موشکا، تمول، کرن پھول، پپلی (سیاہ مرچ) زرنجا میر (سونٹھ)، نیلوپھل، جائے پھل، تری پھل، شنکھر (توتیا) ہڑ (ہلیلہ)، کرپاس، نیل، ناریل، اورآم کا معرب ہیں۔ (۳) ان میں مشک، زنجبیل، اور کافور کے الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ شاہ معین الدین کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں ''عربی زبان کی اس وسعتِ قلبی کا نتیجہ تھا کہ وہ کسی بھی زمانہ میں علم وتمدن کا ساتھ دینے سے قاصر نہیں رہی''۔ (۴)

سنسکرت اور عربی زبان کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو باوجود مختلف الجہات ہونے کے دونوں کے مابین کچھ چیزوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً کلمہ کی تقسیم یا تثنیہ کا صیغہ دونوں میں مشترک ہے۔ سنسکرت کے عظیم پروفیسر چن مائے دت کا خیال ہے کہ عربی زبان کے ہندی الاصل الفاظ میں سے بعض تو عربوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تجارتی تعلقات کی بنیاد پر داخل ہوئے اور بعض اس زمانہ کی یادگار ہیں جب عباسی خلفاء نے ہندو طبیبوں، نجومیوں اور ریاضی دانوں کو دعوت دے کر

---

(۱) ہندوستان اسلام کے سائے میں/ص:۹۸۔

(۲) اردو کی لسانی اہمیت/شاہ معین احمد/ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ: دسمبر ۱۷ء :۶/۶۹ /ص:۳۲۔

(۳) ایضاً۔

(۴) ایضاً /ص:۳۴۔

بغداد بلایا تھا۔[۱]

ان توضیحات کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ عرب و ہند کے قدیم تعلقات نے صرف عقائد اور معاشرت ہی نہیں، بلکہ زبان وادب کو بھی متاثر کیا تھا، اور عربی زبان کی شیرینی، اثر آفرینی اور سحر انگیزی نے ہی علم وادب کے شیدائیوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے ہندوستان میں اپنا مستقبل محفوظ کرنے کی داغ بیل ڈال دی تھی، اسی ذوق وشوق نے ہندیوں کو عربی کے بیش قیمت ادبی سمندر میں غوطہ زنی پر مجبور کیا تو ہندی الاصل ادباء وشعراء نے عربی زبان وادب کو مالا مال کیا۔ اور عربی زبان وادب پر اپنے لازوال اثرات چھوڑے۔

مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق وعقیدت، ان کا جزوِ ایمان ہے۔ آپؐ کے اقوال کو انہوں نے ہمیشہ حرزِ جان بنائے رکھا۔ ان پر عمل کرنا باعثِ فلاح قرار دیا، آپؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا اپنی سعادت وکامیابی تصور کیا، اسی بنا پر انہوں نے عربی زبان کی تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کو دین کا جز و بنا دیا۔ اسی بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ عربی زبان وادب کی توسیع واشاعت میں سب سے بڑا حصہ اسلام کا ہی ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں اسلام تین راستوں سے داخل ہوا، جنوبی ہندوستان جس میں کیرالا اور ملیبار وغیرہ کی ریاستیں شامل ہیں۔ مغربی ہندوستان کے ساحلی علاقے، جن میں گجرات کے بھڑوچ، سورت، اور چیمور وغیرہ کے علاقے داخل ہیں اور سندھ کا علاقہ جن میں دیبل (کراچی) ملتان وغیرہ مشہور شہر آتے ہیں، اول الذکر دونوں علاقوں میں اسلام تاجر حضرات کی کوششوں سے وسعت کی طرف بڑھا تو آخر الذکر علاقہ پر مجاہدینِ اسلام کو اسلام کا پرچم لہرانے کی خاطر مزاحمتیں برداشت کرنی پڑیں۔

مسلمان تاجروں نے جس طریقے پر اپنے اخلاق وکردار سے جنوبی ومغربی ہندوستان کے باشندوں کو متاثر کیا تھا۔ اسی طریقہ پر انہوں نے سندھ میں اپنے دشمن سے دادِ شجاعت وبہادری وصول کی تھی اور ان کی جرأت وحوصلہ مندی اسلام کے فروغ کا باعث بنی۔

یوں تو سندھ میں ۱۵ھ میں اسلام کی پہلی فوجی مہم کا پتہ چلتا ہے جو حضرت عثمان بن ابو العاص الثقفیؓ نے اپنے بھائی مغیرہ کی قیادت میں دیبل کی کھاڑی کی طرف روانہ کی تھی جسے فتح بھی نصیب ہوئی تھی۔[۲] چھوٹی چھوٹی ایسی کئی مہمات یکے بعد دیگرے ہوتی رہیں لیکن اصل فوجی مہم ۹۳ھ میں محمد بن قاسم کی قیادت میں پیش آئی، یہ دور حجاج بن یوسف ثقفی کا دور تھا۔

---

(۱) عربی کے ہندی الاصل الفاظ/ پروفیسر چمن مائے دت: ترجمہ عبدالروف/ معارف، اعظم گڑھ: دسمبر ۶۲ء: ۶/ ۹۰۔

(۲) فتوح البلدان للامام ابی العباس احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری/ دار النشر للجامعیین: ۱۹۵۷ء / ص: ۶۰۷۔

اس حملہ کی وجہ راجہ داہر کا وہ فعل تھا جس نے مسلمانوں کی غیرتِ اسلامی کو جوش دلا دیا تھا ہوا یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی عہد میں مالدیپ کے راجہ نے ان مسلمان عورتوں کو جن کے تاجر شوہروں کی وفات ہوگئی تھی عرق واپس بھیج دیا تھا، ابھی یہ راستہ ہی میں تھیں کہ سمندری لٹیروں نے راجہ داہر کے اشارے پر ان عورتوں کو لوٹ لیا، اس غارتگری نے مسلمانوں کی رگِ حمیت کو پھڑکا دیا، اس کا بدلہ لینے کی خاطر محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک فوجی جتھہ تشکیل دیا گیا، جس نے سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کے راجہ داہر کو قتل کر کے سندھ کو فتح کیا۔ [(۱)] بلاذری نے ابن کلبی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ راجہ داہر کو قتل کرنے والا محمد بن قاسم نہیں، بلکہ قاسم بن ثعلبہ بن عبداللہ بن حسن الطائی تھا۔ [(۲)] ہوسکتا ہے کہ یہ محمد بن قاسم کی فوج کا کوئی سپاہی ہو جس کے ہاتھوں راجہ داہر مارا گیا ہو۔

المختصر یہ کہ محمد بن قاسم نے ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد مفتوحہ علاقوں میں عربوں کو بسانے میں دل چسپی کا مظاہرہ کیا اور دیبل سے ملتان تک اہم بندرگاہوں اور شہروں میں عربوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ جنوبی ہند کے عربوں کی طرح ان عربوں نے بھی تجارت کا پیشہ اختیار کیا، علاوہ ازیں عرب سپاہی بھی سندھ میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اس طرح سے اس علاقہ میں اولین اسلامی علوم یعنی قرآن وحدیث کی اشاعت ہونے لگی۔ ایک تحقیق کے مطابق اس علاقہ کے شہر منصورہ، ملتان، دیبل، سندان، قصوار، اور قندابیل کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور یہ مقامات سندھ میں اسلامی علوم کے ابتدائی مراکز بن گئے۔ [(۳)] سندھ میں اسلامی علوم کی اشاعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عرب فوج میں قرآن شریف کے بہت سے قاری تھے جن کو حجاج نے یہ تاکید کی تھی کہ قرأت پابندی سے کیا کریں، اس کے علاوہ محمد بن قاسم کے ساتھ ایسے کئی اشخاص آئے تھے جن کو قرآن وسنت پر عبور حاصل تھا، اس کے بعد جب عرب بڑی تعداد میں سندھ میں آباد ہونے لگے تو یہاں ایسے عالم بھی آباد ہوگئے جن کی محنت اور علم سے محبت کی بدولت عربوں کی نوآبادیوں میں اسلامی علوم کے مراکز قائم ہوگئے۔ [(۴)]

انہیں علماء میں ایک عالم ابوحفص محدث بصریؒ کا نام تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے جو تبعِ تابعی تھے اور ایک سند کے مطابق کتاب تصنیف کرنے والوں میں پہلے مسلمان تھے۔ امکانات کے پیشِ نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں منصورہ (بھکر) دیبل (ٹھٹھ) اور ملتان اسلامی علوم کے مراکز بن گئے تھے اسی دور کے دو ہندی پنڈتوں نکا اور دھن کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن کی مدد سے چند سنسکرت کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا تھا۔ [(۵)]

---

(۱) ہندوستان میں اسلام کی اشاعت/ معارف اعظم گڑھ: ۱۳/۵ ۔

(۲) فتوح البلدان/ص: ۶۱۶ ۔

(۳) علم حدیث میں براعظم ہندوپاک کا حصہ/ ڈاکٹر محمد اسحاق: ترجمہ شاہد رزاقی/ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۳ء/ص: ۴۵ ۔

(۴) ایضاً/ص: ۴۶ ۔

(۵) عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ/ زبید احمد: ترجمہ شاہد رزاقی/ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۸۷ء/ص: ۱۰ ۔

سندھ کا عرب حکومت کے تحت صوبہ بن جانے کے بعد ہند اور عرب کے درمیان گہری راہ ورسم کا دروازہ کھل گیا، اور عباسیوں کے عہد میں بغداد کے دار الحکومت بننے کے بعد تو سندھ سے عربوں کا علمی، مذہبی اور سیاسی مرکز اور بھی قریب ہو گیا۔ اس قرب سے خلفائے بغداد نے بہت فائدہ اٹھایا اور ہندوستان کی علمی ترقیوں سے اپنے آپ کو پوری طرح باخبر کیا اور اس کے لئے انہوں نے محکوموں اور ماتحتوں سے سبق سیکھنے سے گریز نہیں کیا۔ اور کئی ہندوستانی کتب کو عربی میں منتقل کیا۔[۱] ہندوستان کی پہلی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ ہوا ''سدھانت'' ہے۔ یہ کتاب علمِ ہیئت پر مبنی تھی اور عربی میں ''السند ہند'' کے نام سے مشہور ہوئی۔[۲]

علمِ ہیئت کے علاوہ علمِ حساب میں بھی عرب ہندوستانیوں سے مستفید ہوئے، عربوں کا بیان ہے کہ انہوں نے حسابی رقم (ہندسے) لکھنے کا طریقہ ہندوؤں سے سیکھا اسی لئے وہ ہندسوں کو حسابِ ہندی یا ارقام ہندیہ کہتے تھے۔[۳]

علمِ ہیئت اور حساب کے علاوہ ہندوستانی طب عربوں میں بہت مقبول تھی۔ اس فن میں بھی سنسکرت سے عربی میں کتابوں کا ترجمہ ہوا، علم طب کی جو کتابیں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں ان میں سنترن اور چرک بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔[۴] حکمت و دانش کی کتابیں ''کلیلہ ودمنہ'' سنسکرت کتاب ''پنج تنتر'' کا عربی ترجمہ ہے جسے عبداللہ بن المقفع نے کیا، یہ ترجمہ اصل سے زیادہ مقبول ہوا اور دنیا کی دوسری زبانوں میں عربی سے ترجمہ کیا گیا۔

علمی سرمایہ کی اس منتقلی نے دونوں ہی قوموں کو نئی علمی جہت سے باخبر کیا۔ اس کے اثرات صرف سندھ تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ گجرات کے علاقہ میں بھی شیراز و یمن کے علماء نے درس وافادہ کی مسند بچھائی۔ اور ان کے مسند درس سے بڑے بڑے اہلِ کمال وفضل وکامیاب ہو کر نکلے اور اس طرح گجرات، دکن اور مالوہ کے چپہ چپہ میں علم کی شمعیں روشن ہو گئیں۔[۵]

گجرات کو جغرافیائی اعتبار سے بھی عربوں سے اس لئے قربت تھی کیونکہ گجرات کے مشہور شہر بھڑوچ اور سورت ہیں۔ بھڑوچ کے کنارے دریائے نربدا اور سورت کے کنارے دریائے تاپتی ہے۔ یہ دونوں دریا آگے چل کر بحرِ عرب سے مل جاتے ہیں۔ دریائے تاپتی کے دوسرے کنارے پر راندھیر ہے جس کو پہلے رانیر کہتے تھے۔ اس وجہ سے یہ شہر عربوں کی آمد ورفت کے مرکز بن گئے۔ عرب سے جو علماء دریا کے راستے ہندوستان میں آتے تھے وہ پہلے گجرات میں اترتے تھے موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے۔ اسی طرح ہندوستان سے جو تشنگانِ علوم عرب جانا چاہتے تھے وہ بھی اسی راستہ

---

(۱) آب کوثر/ شیخ محمد اکرم/ پانچویں اشاعت: تاج کمپنی، دہلی: ۱۹۸۷ء/ ص: ۳۱۔

(۲) ایضاً /ص: ۳۱۔

(۳) ایضاً /ص: ۳۲۔

(۴) ایضاً /ص: ۳۳۔

(۵) اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں/ حکیم سید عبدالحیٔ (ترجمہ: ابوالعرفان ندوی) دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۹/ ص: ۲۶۔

سے سفر کرتے تھے۔ [۱]

عرب مسلمانوں کا دستور تھا کہ وہ جہاں بھی جاتے وہاں علم کی اشاعت کا کام کرتے۔ یہ علوم توحید و قرآنیات و اسلامیات سے متعلق ہوتے تھے اور اس کے لئے وہ مرکز مسجد کو بناتے تھے۔ اسی لئے وہ جہاں بھی جاتے مساجد کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کرتے، یہ مساجد مذہبی فرائض کی ادائیگی کے علاوہ اتحاد بین المسلمین اور ثقافتِ اسلامی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ انہیں مساجد سے مکاتب کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں پہلی مسجد کب اور کہاں قائم ہوئی؟ اس سلسلے میں تاریخی طور پر اگرچہ کوئی حتمی بات نہیں ملتی تاہم ضمناً کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ مثلاً ۲۲/اکتوبر ۳۹ء کے روزنامہ ہندو مدراس میں ''ہندوستان کی پہلی مسجد'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس کے مطابق ریاست ''کوچین'' میں قدیم ''چیرا'' سلطنت کے پایۂ تخت ''کرینگ نور'' کے پاس ''اراکولم'' کے کنارے جو چھوٹی سی سادہ مسجد واقع ہے وہ ہندوستان کی پہلی مسجد ہے۔ مالابار میں عام طور سے یہ مشہور ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد ہے جس کی بنیاد پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند سال بعد ہی پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسجد اس وقت تعمیر کی گئی تھی جب کیرالا کے آخری باشاہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ [۲]

اس سلسلے میں مزید حوالے مالابار کی ایک کیرالول پٹی (Keralol Patti) اور شیخ زین الدین کی تحفۃ المجاہدین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ [۳]

لیکن یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے، مشہور مؤرخ سید سلیمان ندویؒ اس کے برخلاف گجرات صوبہ میں بھڑوچ کے قریب گندھار میں بنی ہوئی اس مسجد کو جو ہشام (گورنر سندھ) نے ۱۴۰ھ، ۷۵۹ء میں اپنی فتح کی یاد میں بنوائی تھی۔ پہلی مسجد قرار دیتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ''یہ (فتحِ گندھار) اس ملک (گجرات) میں اسلام کا پہلا قدم تھا اور سندھ کے علاوہ ہندوستان میں یہ پہلی مسجد تھی''۔ [۴]

مساجد کو اسلام نے چونکہ اہم مقام عطا کیا ہے اس لئے مسلمانوں کی علمی، مذہبی، تہذیبی، سماجی اور تمدّنی سرگرمیوں کا مرکز مساجد کو ہی بنایا گیا۔ اس لئے قدرتی طور پر مساجد کا علم و ادب کی اشاعت میں بڑا حصہ رہا۔ انہیں مساجد میں بڑے بڑے مشائخ، محدثین، فقہاء، علماء، ادباء اور شعراء نے زانوئے تلمذ تہ کئے اور یکتائے روزگار بن کر نکلے۔

ہندوستان میں عربوں کا زور کسی نہ کسی صورت میں ۹۳ھ سے ۳۸۸ھ تک تقریباً تین صدیوں تک رہا۔ اس کے بعد

---

(۱) سفر گجرات کی چند یادگاریں/سید سلیمان ندوی/معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۳۶ء: ۳/۲۳۸

(۲) ایضاً

(۳) تلخیص وتبصرہ/سید صباح الدین عبدالرحمان/ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، نومبر ۳۹ء: ۴۴/۵۔

(۴) عرب وہند کے تعلقات/ص:۱۷۔

۵۸۲ھ تک کم وبیش دوسو سال غزنویوں نے یہاں حکمرانی کی۔ اس خاندان کا عظیم حکمراں محمود غزنوی تھا جو علم وثقافت کا زبردست حامی تھا، اگرچہ سلطان محمود کو خاص دلچسپی فارسی سے تھی لیکن وہ عربی کا بھی زبردست عالم تھا۔ وہ حنفی اور شافعی مسلک کے پیرو علمائے کرام کے عالمانہ مباحثوں میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے فقہ پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ''الفرید فی الفروع'' ہے۔(۱)

محمود غزنوی کے بعد اس کے لڑکے مسعود غزنوی نے لاہور کو اپنی سلطنت کے ان علاقوں کا دارالحکومت بنایا جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہیں۔ اس کے بعد یہ شہر ہر زمانہ میں اسلامی علوم کا ایک اہم مرکز رہا اور یہاں بہت سے نامور اہلِ قلم اور علماء پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی و ہندی کا مشہور شاعر مسعود بن سعد بن سلمان جسے پہلا صاحبِ دیوان عربی شاعر ہونے کا فخر حاصل ہے، اسی دور کا شاعر ہے۔(۲)

اس شاعر کا اصل نام مسعود بن سعد بن سلمان ہے، یا سعد بن مسعود بن سلمان۔ اس بارے میں حکیم عبدالحئی صاحب نے سعد بن مسعود بن سلمان لاہوری لکھا ہے اور اس کے دیوان کو ناپید بتاتے ہوئے اس کا ایک شعر نقل کیا ہے۔

ثِق بالحسام فانه میمون ☆ وارکب و قل للنصر کن فیکون(۳)

مذکورہ بالا شاعر کو ہم ہندوستان کے عربی شعراء میں پہلا صاحبِ دیوان شاعر تو کہہ سکتے ہیں لیکن پہلا عربی ہندی شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ انکی پیدائش ۴۳۵ھ سے ۴۴۰ھ کے درمیان ہے جب کہ ہم کو تاریخ کی کتابوں میں ابوعطاء سندھی کا نام بھی ملتا ہے جن کا انتقال ۱۸۰ھ میں ہوا۔ اگرچہ ابوعطاء کے بہت کم اشعار دریافت ہوئے ہیں تاہم عربی ادب کے مشہور شعراء ابوتمام اور بحتری نے اس کو اپنے حماسات میں مقام دے کر عربی ادب کا لافانی شاعر بنادیا ہے۔(۴)

ایسے ہی ایک اور شاعر ابوضلع کا تعلق بھی سندھ سے ہی تھا۔ یہ چوتھے عباسی خلیفہ موسیٰ الہادی کا مملوک تھا۔ اس کے وجود کا زمانہ سید سلیمان ندویؒ کے بقول ۱۸۶ھ سے پہلے ہوگا۔ اور تعجب نہیں کہ تیسری یا چوتھی صدی ہجری میں اس کی پیدائش ہو۔ کیونکہ سندھ میں عربوں کی دور کا خاتمہ یہیں پر ہو جاتا ہے۔(۵) ابوضلع سندھی سچا محبِ وطن تھا۔ اسے سرزمینِ ہند کے ذرے

---

(۱) عربی ادبیات میں ہندو پاک کا حصہ/ص:۱۱۔

(۲) عربی ادبیات میں ہندو پاک کا حصہ/ص:۲۳۴۔

(۳) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند/عبدالحئی حسنی/المجمع العلمی العربی، دمشق؛ ۱۹۵۸م-۱۳۷۷ھ/ص:۴۴۔ شمس تبریز خاں صاحب اسکا نام سعد بن سلمان مانتے ہیں، شمس صاحب نے اس کا سنِ ولادت ۴۳۵ھ سے ۴۴۰ھ کے درمیان اور وفات ۵۱۵ھ میں بتلائی ہے اور اسکے درج بالا شعر کو اس طریقہ پر درج کیا ہے:

ثق بالحسام فعهده میمون ابداً و قل للنصر کن فیکون

(بحوالہ عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ/شمس تبریز خاں، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ ۱۹۸۹م/ص:۸۴-۸۵)۔

(۴) عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ/شمس تبریز خاں، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ ۱۹۸۹م/ص:۵۸-۵۷۔

(۵) عرب و ہند کے تعلقات/ص:۹۶۔

ذرے سے لگاؤ تھا۔ اسی نے اپنے ایک قصیدہ میں اپنی حب الوطنی کا اظہار کیا ہے جس کا مطلع مندرجۂ ذیل ہے:

لقد انكر اصحابی و ما ذلك بالامثل ☆ اذا ما مدح الهند و سهم الهند فی المقتل[۱]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ باشندگانِ ہند میں عربی زبان وادب کے تئیں دل چسپی روز بہ روز بڑھتی ہی گئی عربوں کے دورِ حکومت میں عربی ادب کا جو مذاق پیدا ہوا تھا اس کو محمود غزنوی کے عہد تک مزید جلا ملی جس سے نت نئے علوم کا اضافہ بھی ہوا اور ہندوستان میں عربی زبان کی جڑیں گہری ہوتی گئیں عربی قواعد کو سمجھنے اور صحیح استعمال کرنے کے لئے علم صرف ونحو وجود میں آئے تو شریعت کے اصولوں پر صحیح عمل پیرا ہونے کے لئے فقہاء کی کوششوں سے علم الفقہ میں نئی نئی راہیں کھلیں۔ علم الحدیث، علم القرآن، علم التفسیر، علم الفرائض، اصولِ حدیث، اصولِ تفسیر، اصولِ فقہ، علمِ تصوف اور پھر منطق وفلسفہ جیسے علوم سے باشندگانِ ہند متعارف ہوتے رہے جن کی اصل عربی زبان تھی۔ ہندی الاصل حضرات نے سبھی علوم میں اپنی دل چسپی دکھا کر عربی زبان سے اپنے قلبی تعلق کی مُہر ثبت کردی۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عربوں کے دورِ حکومت میں ہندوستان میں عربی ادب کے ارتقاء کا سفر نہایت سست رفتار رہا، اس کی وجہ یا تو ہم ادب کے تئیں مذہبی حضرات کی عدمِ دل چسپی مان سکتے ہیں یا پھر ایک یہ تاریخی حقیقت بھی کہ محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر جس لشکر نے حملہ کیا تھا اس میں عربی ادب کا کوئی قابلِ ذکر ادیب یا شاعر نہیں تھا۔ اور پھر یہ حملہ سندھ تک ہی محدود رہا، اسلم اصلاحی صاحب کے بقول ''اگر ان حملوں کا دائرہ دہلی اور اس کے اطراف وجوانب تک وسیع ہوتا تو صورتِ حال بڑی حد تک مختلف ہوتی اور ہندوستان ضرور بالضرور وہ ''اندلسِ ثانی'' بن جاتا جس کے نوجوانوں کے دلوں میں ازخود عربی پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا اور جو عربی زبان وادب کو حرزِ جان بنالیتے''۔[۲]

اس کے برخلاف انہوں نے علومِ قرآن وحدیث وفقہ کی طرف بھرپور توجہ مبذول کی۔ چنانچہ یہاں کے پہلے محدث جیسا کہ اوپر گذرا شیخ ابوحفص ربیع محدث بصریؒ تھے جو عرب فوج کے ہمراہ یہاں تشریف لائے اور ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ آپ کا تعلق اگرچہ پیدائشی طور پر ہندوستان سے نہیں تھا لیکن آپ نے سندھ کو ہی اپنا وطن بنالیا تھا۔ اور ایک روایت کے بقول آپ یہیں مدفون ہوئے۔[۳] لیکن شمس تبریز خاں کی تحقیق کے مطابق آپ کا مدفن شہر بھڑوچ سے تیس کلومیٹر دور نرمدا ندی کے کنارے ''بھاڑبھوت'' نامی جگہ میں ہے۔[۴]

---

(۱) عرب وہند کے تعلقات/ص:۹۶۔

(۲) ہندوستان میں عربی ادب کا ارتقاء (محمد اسلم اصلاحی کا مضمون مشمولہ ''ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات'') مرتبہ: عماد الحسن آزاد فاروقی/مکتبہ جامعہ، دہلی؛ ۱۹۸۶ء/ص: ۱۳۷۔

(۳) آبِ کوثر/شیخ محمد اکرم/حاشیہ؛ص:۳۵۔

(۴) عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ/ص : ۴۴۔

ہندوستانی نومسلموں میں ابومعشر نجیح سندھی اپنے زمانے میں فن سیر ومغازی کے امام تھے جنہوں نے ۱۷۰ھ میں وفات پائی اور آپ کی نمازِ جنازہ خلیفہ ہارون رشید نے پڑھائی۔ (۱)

دوسرے نومسلم محدث رجاء السندھی تھے جنہوں نے ۲۲۱ھ میں وفات پائی، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے محدثین کا تذکرہ ملتا ہے۔ سمعانی نے دیبلی، سندھی، لاہوری اور منصوری کے ذیل میں متعدد مسلمان علماء کے نام لکھے ہیں۔

اس عہد کے مشہور ترین ہندوستانی صاحبِ کلام شعراء میں تاریخی طور پر جن حضرات کا تذکرہ ملتا ہے ان میں ہارون بن موسی ملتانی، جن کی وفات ۱۲۵ھ سے ۱۵۰ھ کے درمیان ہوئی۔

افلح بن یسار المعروف بہ مرزوق المتخلص بہ ابوعطاء السندھی المتوفی ۱۸۰ھ، ابراہیم بن السندی شاہک المتوفی ۲۱۸ھ، ابوالضلع سندھی جن کی وفات ۲۴۰ھ کے قریب ہوئی، ابوالفتح محمود بن حسین بن شاہق الملقب بہ کشاجم السندی المتوفی ۳۳۰ھ وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ (۲)

غزنوی عہد

۳۸۸ھ میں عربوں کا دورِ حکومت ختم ہوکر غزنویوں کا عہد شروع ہوا۔ اس عہد کا پہلا فرماں روائے ہند یعنی سلطان محمود غزنوی علم وادب کا بڑا قدرداں تھا۔ اس نے دور دراز ایشیائی علاقوں سے آئے ہوئے علماء کی سرپرستی کی تھی۔ اس نے غزنی میں ایک عظیم الشان مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی اس کے بھائی نصر نے نیشاپور میں مدرسہ سعیدیہ تعمیر کیا۔ اسی کے عہد میں مذہبی علوم وفنون سیکھنے اور کتاب الہند کے لئے مواد جمع کرنے کے لئے البیرونی ہندوستان آیا۔ (۳)

اس دور کے مشہور شعراء میں مسعود بن سعد بن سلمان لاہوری کے علاوہ ابومحمد الحسن بن حامد الادیب الدیبلی البغدادی متوفی ۴۰۷ھ، عطاء بن یعقوب بن ناکل الغزنوی المتوفی ۴۹۱ھ وہ شعراء کرام ہیں جن کا کلام مؤرخین شعروادب نے تاریخ ادب عربی کی کتابوں میں محفوظ رکھا ہے۔

غوری عہد

۵۸۲ھ تا ۶۰۲ھ

یہ دور چونکہ صرف بیس سال کے قلیل عرصہ پر مشتمل ہے ملکی حالات میں بھی کوئی ٹھہراؤ نہیں پایا جاتا اسی لئے اس عہد

---

(۱) آب کوثر/ص: ۳۶۔

(۲) ہندوستان میں عربی شاعری (مختلف صفحات پر پھیلے ہوئے صاحب دیوان شعراء کے تذکرہ سے ماخوذ)۔

(۳) محمود غزنوی کی بزم ادب/ ابوالحسنات ڈاکٹر غلام محی الدین زور قادری/ ابراہیمیہ پریس، حیدرآباد؛ ۱۹۲۷م/ ص: ۹۰۔

میں شعر وادب پر توجہ کم دکھائی دیتی ہے۔البتہ اس دور میں تصوف کو خاص مقام حاصل رہا۔متعدد فضلاء ومشائخ ہندوستان میں آئے جن میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

حضرت خواجہ معین الدینؒ کا وطنی تعلق سیستان سے تھا وہ ۵۳۷ھ (۱۱۴۲ء) میں پیدا ہوئے۔پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے والد غیاث الدین کا انتقال ہوگیا۔وہ مختلف مقامات پر گھومتے ہوئے خرسان اور آخر میں بغداد پہونچے جہاں ان کا اپنے زمانہ کے مشہور ترین صوفیاء سے تعارف ہوا۔۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں وہ دہلی آئے لیکن وہ بہت جلد اجمیر منتقل ہو گئے جہاں ان کا انتقال ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں ہوا۔(۱)

اسی دور میں فخر الدین رازی کی تصانیف نے باشندگانِ علم کو علم کلام کی طرف متوجہ کیا اور اس کا رواج ہوا۔(۲)

غلام عہد

۶۰۲ھ تا ۶۸۹ھ
(۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء)

غوریوں کے بعد ہندوستان کی باگ ڈور ترکوں کے زیرِ انتظام آئی جو تاریخ میں غلام عہد کے نام سے مشہور ہے۔ غلام خاندان میں قطب الدین اور التمش خود بڑے فاضل اور علم کے قدرداں تھے۔ان کے دورِ حکومت میں منگولوں کی ہلاکت خیزیوں کے باعث ہزار ہا بے خانماں انسان ہندوستان بھاگ کر آئے جن میں علماء، فضلاء اور اربابِ صنعت وحرفت ہر قسم کے لوگ تھے۔انہوں نے سب کو پناہ دے کر ہندوستان کی شہرت کو دوبالا کر دیا۔چونکہ دہلی ان کا دارالحکومت تھا اسی لئے یہ شہر بہت جلد اپنے علمی کارناموں کے باعث ہمہ گیر شہرت کا مالک ہوگیا۔پھر قرونِ وسطی میں علم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو دہلی میں نہ ہو اسی لئے دہلی کو بجا طور پر قطب الاسلام کا لقب دیا گیا۔

غلام خاندان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس دور میں بکثرت ہندوستانی مصنف ہوئے، ان میں حسن صاغانی لاہوری کی متعدد تصانیف ہیں۔شیخ جمال ہنسوی کی ''الملہمات'' اور قاضی منہاج الدین جوزجانی کی ''طبقاتِ ناصری'' اسی دور کی یادگار ہیں۔فخر مدبر نے اسی عہد میں ''ادب الملوک'' نامی کتاب تصنیف کی تو عوفی نے اپنی مشہور کتاب ''جوامع الحکایات'' اسی عہد میں تحریر کی۔

غلام عہد میں جہاں ایک طرف علم ارتقائی منازل طے کر رہا تھا تو دوسری جانب روحانی تعلیمات کے فیوض بھی مستقل جاری تھے۔شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، شیخ فرید الدین گنج شکری، شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور شیخ علی بن علاؤ الدین بن احمد صابر کلیریؒ اس عہد کے مشہور روحانی پیشوا گذرے ہیں۔(۳)

(۱) Shorter Encyclopaedia of Islam/ H.A.R.Gibb and J.H.Karvans/ Leiden; E.J. Brill; 1953/ p:66.

(۲) ہندوستان میں عربی شاعری/ حامد علی خاں/ ص:۸۔

(۳) ہندوستان میں عربی شاعری/ ص: ۱۰۔

خلجی عہد

۶۸۹ھ تا ۷۲۰ھ

یہ بھی غلام خاندان کی مانند نسلاً ترک تھا اس خاندان کا سربراہ جلال الدین خلجی تھا جس نے سات سال حکومت کی۔ وہ بڑا نیک حکمراں تھا، مؤرخین کا ماننا ہے کہ اس کے دور میں کوئی مظلوم ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا ہو۔ (۱)

اس کے بعد اس کا بھتیجہ علاؤالدین خلجی حکمراں ہوا۔ علاؤالدین اگر چہ بذاتِ خود ایک ان پڑھ بادشاہ تھا لیکن اس کے باوجود اسے ادب وشاعری سے بہت دل چسپی تھی۔ اس کے زمانے میں اسلامی ہند میں اور خاص طور پر دہلی میں بزرگانِ دین، علماء، شعراء کی جتنی بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی اتنی دہلی کے کسی بادشاہ کے زمانے میں جمع نہیں ہوئی۔ (۲)

خلجی دور اس بات میں ممتاز مانا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے شہروں بیانہ، بھکر، کول، کٹرہ، ملتان، برن، سترکھ اور لاہور وغیرہ میں علم کا اتنا زور تھا کہ ہندوستان میں امام رازیؒ اور امام غزالیؒ کے ہم پلہ علماء وفضلاء پیدا ہونے لگے۔ (۳)

یمین الدین ابوالحسن ابن سیف الدین المتخلص بہ امیر خسروؒ دہلوی اس عہد کے ممتاز ترین شعراء میں سے ہیں۔ اگر چہ وہ بنیادی طور پر فارسی زبان وادب کے شاعر تھے لیکن فی الحقیقت وہ عربی کے ایسے قادر الکلام شعراء میں تھے جن کے اشعار میں سوز وگداز اور سلاست وروانی کے علاوہ ادیبانہ مہارت بھی ملتی ہے۔ ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی کیفیت اور تاثر محسوس کیا جاتا ہے۔

تغلق عہد

۷۲۰ھ تا ۸۱۵ھ

تغلق خاندان میں محمد تغلق اور فیروز تغلق دونوں عالم وفاضل ہونے کے ساتھ ساتھ علم وفن کے دلدادہ اور اہلِ علم کے مربی تھے۔ ان کی خواہش سے متعدد کتابیں لکھی گئیں، اس خاندان کے دورِ سلطنت میں نہ صرف دہلی بلکہ قرب وجوار کی تقریباً ہر مسجد اور خانقاہ سے عربی مدارس وابستہ تھے۔ صرف دہلی شہر میں ان مدارس کی تعداد ایک ہزار اور قرب وجوار کے ملا کر تقریباً دو ہزار تھی۔ (۴)

اس دور کے عربی شعراء میں رکن الدین ابوالفتح فیض اللہ بن صدر الدین، محمد بہاؤالدین زکریا ملتانی متوفی ۷۳۵ھ، قاضی عبد المقتدر ابن محمود ابن سلیمان ابن قاضی منہاج الدین ابن قاضی رکن الدین تھانیسری ثم دہلوی متوفی ۷۹۱ھ اور شیخ احمد بن محمد تھانیسری متوفی ۸۲۰ھ آسمانِ شعروادب پر چھا گئے۔

---

(۱) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ/ثروت صولت/طبع: سوم؛ دسمبر ۹۵م؛ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی/ج:۲/ص:۱۴۸۔

(۲) ایضاً/ص:۱۴۹۔

(۳) ہندوستان میں عربی شاعری/ص:۹۔

(۴) ایضاً/ص:۱۰۔

احمد بن محمد تھانیسری متوفی ۸۲۰ھ آسمانِ شعروادب پر چھا گئے۔

شیخ احمد بن محمد تھانیسری ادب وشاعری کے علاوہ فقہ اور اصولِ میں بھی ممتاز تھے۔ ۸۰۱ھ میں فتنۂ تیموری کے وقت دہلی سے نکل کر کالپی پہونچے۔ امیر تیمور انہیں سمرقند لے جانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔[1] ۸۲۰ھ میں انہوں نے کالپی میں وفات پائی اور اس کے قلعہ میں دفن ہوئے۔

قاضی عبدالمقتدر بن رکن الدین بھی تغلق زمانہ کی ممتاز شخصیات میں سے ہیں، انہوں نے اس میدان میں اپنے جن طبعی جوہروں کو پیش کیا اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔ اسلم اصلاحی صاحب تو سعد بن مسعود بن سلمان لاہوری کے بعد طویل زمانہ تک اس پایہ کا شاعر قاضی عبدالمقتدر کے علاوہ کسی کو نہیں مانتے۔[2]

شیخ رکن الدین ملتانی صاحبِ تصنیف و تالیف کے علاوہ عربی کے مشہور شاعر بھی تھے لیکن آپ کا سارا علمی سرمایہ ضائع ہو گیا۔ ان کا ایک نعتیہ مخطوطہ ''القصیدۃ الشوقیۃ'' کے نام سے رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔[3]

تغلق عہدِ حکومت میں جو شہر تعمیر کئے گئے ان میں جونپور نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس شہر کی بنیاد ۷۶۰ھ ، ۱۳۵۹ء میں ڈالی گئی۔ جونپور کے تذکرہ کے بغیر ہندوستان کی علمی تاریخ نامکمل مانی جاتی ہے۔ اس حکومت کو سلطنت شرقی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ آزاد ریاست تھی جس کا بانی ملک سرور تھا اور جسے ملک الشرق کا خطاب دیا گیا تھا۔[4] جونپور کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ شہرت ابراہیم شاہ شرقی کو حاصل ہوئی جس کے زمانے میں دہلی پر تیمور کا حملہ ہوا، دہلی کے اجڑنے کے بعد وہاں کے علماء وادیبوں نے جونپور کا رخ کیا جس کی وجہ سے یہ شہر علمی مرکز بن گیا۔ اور اس کی مرکزیت تین سو سال تک رہی۔[5]

سید عہد

۸۱۷ھ تا ۸۵۵ھ

اس عہد کا آغاز ۸۱۷ھ سے ہوتا ہے جو تقریباً اڑتیس سالوں پر محیط ہے۔ اس دور کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے آخری فرماں روا سلطان علاؤالدین بن محمد شاہ نے بدایوں کو دارالسلطنت بنایا اور تقریباً تیس سال تک اسے دارالحکومت بنا کے رکھا جس کی وجہ سے یہ شہر بھی اسلامی علوم کا مرکز بنا۔ سیدوں کا خاندان مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا

---

(۱) الأعلام (نزہۃ الخواطر/عبدالحیٔ حسنی) / مکتبہ دار عرفات، رائے بریلی ۱۹۹۲م / ج:۳، ص:۸۔

(۲) ہندوستان میں علوم اسلامیہ / ص:۱۳۸۔

(۳) ہندوستان میں عربی شاعری / حامد علی خاں / ص:۴۹۔

(۴) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ / ثروت صولت / ج:۲، ص:۱۹۰۔

(۵) ایضاً / ج:۲، ص:۱۹۱۔

جس کی وجہ سے علم وادب کی بھی سر پرستی نہیں ہوسکی۔

لودھی سلطنت

۸۵۵ھ تا ۹۳۲ھ

۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء

لودھی سلاطین نے ویسے تو عموماً علماء کی سر پرستی کی لیکن سکندر لودی کی ادب نوازی وقدر دانی سب سے زائد تھی اس کے زمانے میں ''فرہنگ سکندری'' وغیرہ کتابیں لکھی گئیں۔سکندر نے آگرہ شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کو پایۂ تخت بنایا تو وہ بہت جلد ترقی کے مدارج طے کر دہلی کا ہمسر ہوگیا۔لودی دور میں غیر مسلم اشخاص بھی عربی کی طرف عملاً متوجہ ہوئے۔ بدایونی کہتا ہے کہ ایک ہندو جس کا تخلص برہمن تھا وہ مسلمانوں کے مدرسے میں ایک اعلی استاد تھا۔[۱]

اس عہد کے مشہور شعراء میں زین الدین ابو یحیی ابن علی ابن احمد شافعی مالا باری متوفی ۹۲۸ھ،شاہ احمد شرعی چندیری متوفی ۹۲۸ھ ایسے شعراء ہیں جن کا کلام دستیاب ہے۔

سکندر کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم لودھی ۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء تخت پر بیٹھا۔ یہ نا اہل حکمراں تھا۔اس کو دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں کابل کے مغل حکمراں بابر نے شکست دے کر ۱۵۲۶ء میں دہلی پر قبضہ کرلیا۔[۲]

اس کے بعد ہندوستان میں مغل تہذیب نے اپنے اثرات دکھلائے جس نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت، زبان و ادب، اور یہاں کی سماجی وسیاسی زندگی پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے۔

فیروز شاہ تغلق کے بعد دہلی سلطنت کمزور ہو چلی تھی اور جگہ جگہ آزاد ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس سے اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کو نقصان پہونچا لیکن جگہ جگہ آزاد حکومتوں کے قائم ہونے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب وتمدن ہر ہر حصہ میں پہونچ گیا۔سری نگر، جونپور، ٹھٹھ، احمد آباد، مانڈو، آگرہ، بیدر، بیجاپور، اور احمد نگر کے نئے شہر وجود میں آئے۔ جن کی بدولت علم وادب کو بہت ترقی ملی، چھوٹی حکومتوں کا یہ زمانہ تقریباً دوسو سال ۱۴۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک قائم رہا۔اس کے بعد دہلی پھر ایک مضبوط مرکزی حکومت کا دار السلطنت بن گئی جو تاریخ کے صفحات پر عہد مغلیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

---

(۱) ہندوستان میں عربی شاعری/ص:۱۱۱۔

(۲) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ /ثروت صولت/ ج:۲،ص:۱۹۴۔

چوتھی فصل: مغل حکمراں اور عربی زبان وادب

تیموری خاندان کے چشم چراغ ظہیر الدین محمد بابر سے مغلیہ خاندان کی ابتداء ہوئی۔[۱] بابر کی پیدائش ۶ر محرم ۸۸۸ھ کو خلق نگار خانم کے بطن سے ہوئی، اس کی تاریخ پیدائش حسامی فراکوی نے اس طرح کہی ہے:

اندر شش محرم زاد آں کہ شہِ مکرم ☆ تاریخ مولدش ہم شش محرم[۲]

بابر انتہائی ذہین وفطین، خوش بیاں وخندہ رو، دل کش اور خوبصورت شخصیت کا مالک تھا، جود وسخا اور انسانی ہمدردی اس کی طبیعت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ حسن وادب کا دلدادہ تھا جس کی مثال اس کی ''توزک بابری'' ہے جو اصلاً ترکی میں ہے۔ ترکی اس کی مادری زبان ہے مگر فارسی اور عربی سے واقف تھا۔[۳] وہ علم دوست اور ادب کا شیدائی تھا، اصحابِ علم وفن سے استفادے کے لئے کوئی لمحہ ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ اس کا انتقال انچاس سال کی عمر میں (۹۳۷ھ) ہوا۔[۴] یہی علم و ادب کا ذوق وشوق وراثت میں اس کے لڑکوں کو ملا۔[۵]

بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تخت نشین ہوا جس کی ولادت ۴ر ذی قعد ۹۱۳ھ کو کابل کے قلعہ ارک میں ہوئی تھی۔ ''فیروز بخت شد'' اس کے سنِ ولادت کا تاریخی مصرعہ ہے۔[۶] علمی مذاق اور شعر وشاعری اسے بھی وراثت میں ملی۔ خالی اوقات میں وہ طبع آزمائی کرتا، اس کی تعلیم مذہب واخلاق سے آراستہ تھی وہ صوم وصلاۃ کا پابند اور احکامِ شرعیہ پر پابندی سے عمل کرنے والا تھا۔[۷]

بابر کے دوسرے بڑے بیٹے ہندال، عسکری اور کامران اور بیٹی گلبدن بیگم بھی شعر وشاعری اور تاریخ وتاریخ نویسی کا بلند ذوق رکھتے تھے۔[۸] ہمایوں اپنے بھائیوں اور شیر شاہ سوری سے جنگی مہمات میں الجھ کر کبھی داخلی اور کبھی خارجی فتنوں کا

---

(۱) ظہیر الدین محمد بابر: مسلمان ہندو مؤرخین کی نظر میں/ مرتبہ: صباح الدین عبد الرحمان/ مطبع معارف، اعظم گڑھ/ طبع: دوم ۱۹۸۶ء/ ص: ۱۔

(۲) تاریخ فرشتہ/ محمد قاسم فرشتہ (ترجمہ: عبد الحیٔ خواجہ)/ مکتبہ ملت، دیوبند؛ ۱۹۸۳ء/ طبع: اول؛ ج: ۱، ص: ۵۶۲۔

(۳) ظہیر الدین محمد بابر/ ص: ۳۸۳۔

(۴) تاریخ فرشتہ/ ص: ۶۰۹۔

(۵) تیموری شاہزادوں کا علمی ذوق/ صباح الدین عبد الرحمان/ معارف، اعظم گڑھ؛ ۴/ ۴۸، اکتوبر ۱۹۴۱ء/ ص: ۲۵۶۔

(۶) تاریخ فرشتہ/ ص: ۵۸۱۔

(۷) ہمایوں کا علمی ذوق/ صباح الدین عبد الرحمٰن/ معارف، اعظم گڑھ؛ ۳ر ۳۷؛ مئی ۱۹۳۶ء/ ص: ۱۸۶۔

(۸) ایضاً/ ۸۵-۱۸۴۔

شکار ہوتا رہا۔ جس کی وجہ سے اسے قرار نصیب نہیں ہوسکا اور وہ اپنے ذوقِ علمی کو اس انداز سے فروغ نہیں دے سکا جس کا وہ خواہش مند تھا۔ وہ خانہ بدوشوں کی زندگی گذار رہا تھا کہ اسی بادیہ نشینی میں اکبر کی ولادت ہوئی۔ ہمایوں کو سلطنت ملی تو موت نے اسے مہلت نہ دی۔ اکبر کو چند سال بھی اپنے بزرگ باپ کے ساتھ چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا، اس کے اثرات یہ ہوئے کہ اکبر کی باوجود ہمایوں کی خواہش وکوشش کے باقاعدہ تعلیم نہیں ہوسکی۔ اکبر ۴ سال ۴ مہینہ ۴ دن کا تھا کہ اس کی مکتب کی رسم ادا کردی گئی۔[(۱)] باپ کی موت کے بعد کم عمری میں یعنی تیرہ سال کی عمر میں اس کے کاندھوں پر سلطنت کا بوجھ رکھ دیا گیا۔

اکبر اگرچہ باضابطہ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن اس کے دل میں علوم وفنون کا شوق اور اس کی قدر دانی کا جوش اتنا تھا جو کبھی کسی عالم باشاہ کو بھی نہیں ہوا۔ وہ ہر فن کے اربابِ کمال کو جمع کرتا اور مختلف مسائل پر بحث کراتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور علمی حیثیت سے درخشاں دور ہے۔ اس دور میں عربی اور سنسکرت کی متعدد کتابوں کے فارسی تراجم ہوئے اور بہت سی تصنیفات وتالیفات منظر عام پر آئیں جو علم وفن اور عقل ودانش کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکیں۔[(۲)]

دمیری کی مشہور ومعروف کتاب ''کتاب الحیوان'' شہاب الدین یاقوت حموی کی ''معجم البلدان'' اور ''جامع رشیدی'' وہ گراں قدر کتابیں ہیں جن کے تراجم حکومت کی زیرِ نگرانی ہوئے۔[(۳)]

اس کے دربار سے وابستہ نورتنوں میں سے ابوالفضل اور فیضی نے عربی ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ فیضی کی غیر منقوط تفسیر قرآن ''سواطع الالہام'' ایک ایسا ادبی شاہ کار ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ فیضی کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے مختلف زبانوں میں ایک سو ایک کتابیں تالیف کیں۔[(۴)] ان کے علاوہ اکبری دربار میں عبدالرحیم خان خاناں عربی میں اعلیٰ لیاقت رکھتا تھا۔ دقیق اور مشکل عربی کے معانی اور مفاہیم کو نہایت آسان فارسی میں منتقل کرتا۔[(۵)] ملا عبدالقادر بدایونی عربی، فارسی اور سنسکرت کے جلیل القدر عالم تھے۔ خواجہ نظام الدین احمد، فتح اللہ شیرازی، شیخ عبدالنبی، شیخ عبدالحق دہلوی، قاضی نوراللہ شوستری، حاجی سلطان تھانیسری، قاضی جلال الدین ہندی وغیرہ جیسے جید علماء کے علاوہ حکیم سنائی، عرفی نظیری نیشاپوری، شکیب صفاہانی، حموی ہمدانی وغیرہ جیسے عظیم شعراء نے بھی عہدِ اکبری میں عربی ادب وزبان پر لافانی نقوش چھوڑے۔ اس طریقہ پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کا زمانہ عربی زبان وادب کے فروغ میں درخشاں حیثیت کا حامل ہے۔

---

(۱) اکبر کا علمی ذوق/ صباح الدین عبدالرحمٰن/ معارف، اعظم گڑھ؛ ۵/۳۷؛ مئی ۱۹۳۶ء/ ص: ۳۲۷۔

(۲) ایضاً/ ص: ۳۴۳۔

(۳) ایضاً/ ص: ۳۴۷۔

(۴) ایضاً؛ ۶/۳۷؛ جون ۱۹۳۶ء/ ص: ۴۳۴۔

(۵) ایضاً/ ص: ۴۳۹۔

اکبر کے ادبی ذوق کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی اسلامی علوم وفنون سے عدمِ دلچسپی کے باعث اگرچہ فکر وفن کا دھارا ہی بدل گیا تھا تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ عربی زبان وادب اس کی فیض بخشیوں سے محروم نہیں رہے۔ علماء و فضلاء ہمیشہ اس کے دربار کی زینت رہے۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے شیخ عبدالنبی اس عہد کے فقہ اور عربی زبان کے عالم تھے۔ اکبر ان کا اس درجہ ادب واحترام کرتا تھا کہ پیر کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔[۱] شیخ کی تصنیفات میں وظائف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الادعیۃ الماثورۃ، رسالۃ فی حرمۃ السماع اور سنن الہدی فی متابعۃ المصطفی، وہ علمی کارنامے ہیں جو انہیں علم و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔[۲] علاوہ ازیں شیخ علی متقی، شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی اور علامۃ العصر محمد بن طاہر پٹنی علم وادب کے وہ مینارے ہیں جنہوں نے صرف عہدِ اکبری میں ہی نہیں بلکہ اب تک اپنے فیوض و برکات سے دنیائے عربی ادب کو مالا مال کر رکھا ہے۔[۳]

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہاں گیر تخت کا وارث بنا جو بذاتِ خود فارسی کا ادیب تھا لیکن عربی ادب وزبان کے فروغ میں دلچسپی رکھتا تھا۔ جہاں گیر کو بابر کا ادبی ذوق اور اکبر کی علمی روایات ورثہ میں ملی تھیں۔ اکبر نے دینِ الٰہی کے ذریعہ علومِ اسلامیہ کو جس نہج پر پہونچا دیا تھا وہ سب کے سامنے ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں علومِ اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کا سہرا بھی جہاں گیر کے سر ہے۔ اسی کے عہد میں مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی اور محدث جلیل شیخ الحدیث شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہما الرحمۃ جیسی عبقری شخصیات نے اپنے باطنی وظاہری علوم وکمالات سے خلقِ خدا کو فیض پہونچایا۔

عہدِ جہانگیری میں یوں تو بہت سے اصحاب تصانیف پیدا ہوئے۔ عربی زبان وادب کو بھی فروغ حاصل ہوا لیکن مذکورہ بالا دونوں شخصیات کے تذکرے کے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی انہوں نے اپنے علم وعمل کے ذریعہ اس عہد کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ مستقبل کے ادب، معاشرت اور سیاست پر بھی ان کے افکار جلیلہ اثر انداز ہوئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (ماہِ محرم ۹۵۸ھ ، ۱۰۵۲ء) اسلام شاہ سوری کے عہد حکومت میں مولانا سیف الدین دہلوی کے گھر پیدا ہوئے۔ یہ گھرانہ دہلی کا ایک علمی گھرانہ تھا۔[۴] شیخ کے والد شیخ سیف الدین عربی شاعری سے انسیت وتعلق رکھتے تھے۔ وصال کے وقت آپ نے اپنے کفن میں جن چیزوں کو رکھنے کی ہدایت کی ان میں عربی کے یہ دو اشعار بھی تھے:

---

(۱) عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں/ شبیر احمد قادر آبادی/ دانش محل، لکھنؤ: ۱۹۸۲ء/ ص: ۹۷۔

(۲) ایضاً/ ص: ۹۹-۹۸۔

(۳) ایضاً/ ص: ۱۲۱۔

(۴) حیات شیخ عبدالحق/ خلیق احمد نظامی/ ندوۃ المصنفین، دہلی: ستمبر ۵۳ء/ ص: ۵۱۔

قـدِمـت عـلـى الـكـريم بغيـر زاد ☆ مـن الـحـسـنـات والـقـلـب السليم

فـحـمـل الـزاد اقبح كـل شيئ ☆ اذا كـان الـقـدوم الى الـكـريـم (۱)

شیخ عبدالحق تصوف میں حضرت باقی باللہ کے مرید تھے۔ مذہبی اقدار کو مستحکم کرنے کی خاطر انہوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی بے انتہا ذہین تھے چنانچہ دو تین مہینے میں ہی قرآن مجید کی تکمیل کرلی۔ (۲) پروفیسر عزیز صاحب شاہ ولی اللہ سے قبل کے تمام علمائے دین میں ان کا درجہ سب سے بلند مانتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں عالمانہ انداز میں علم حدیث حاصل کرنے کی بنیاد ہندوستان میں انہیں سے پڑی جس کی تکمیل شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف پر منتج ہوئی۔ (۳)

اکبر کے دین الٰہی کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے انہوں نے شب و روز محنت وجدوجہد کی اور اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کی خاطر شریعت اور طریقت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں عوام تک اسلام کا صحیح پیغام پہونچایا اس کے لئے انہوں نے مشکوٰۃ کی شرح عوام اور علماء کی ضروریات کے پیشِ نظر عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی۔ (۴)

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی کی ولادت (۱۴ رشوال ۹۷۱ھ، ۱۵۶۳ء) شہر سرہند میں ہوئی۔ (۵) آپ کا نسب عالی ۲۷ واسطوں سے حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ (۶) ابتدائی علوم کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی۔ طریقت میں بھی ان سے مرید ہوئے پھر ۱۰۰۸ھ میں دہلی جا کر خواجہ باقی باللہ سے مرید ہوئے۔ (۷) علوم شریعت اور معارف طریقت میں آپ کی بے شمار تصانیف ہیں جن میں گیارہ تصانیف اور ۶۳ مکتوبات غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں۔ آپ کے مکتوبات نے خلق خدا کو روحانی فائدے پہونچائے جس سے عوامی زندگی میں انقلاب برپا ہوا۔ ۶۳ سال کی عمر میں ۲۸ رصفر ۱۰۳۴ھ بروزِ دوشنبہ وفات پائی۔ آپ کا مزار مبارک سرہند میں ہے۔ (۸) آپ کی مقبولیت و شہرت سے آپ کے معاصرین میں سے کچھ حضرات آپ سے حسد کرنے لگے جس کے نتائج جہانگیر کی شیخ سے مخالفت کی صورت میں نکلے اور سجدۂ تعظیمی سے انکار کے جرم میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ (۹) لیکن

---

(۱) حیاتِ شیخ عبدالحق/ص:۱۷۔

(۲) رودِ کوثر/شیخ محمد اکرام/تاج کمپنی، دہلی ۱۹۸۷ء/ص:۹۴۔

(۳) ہندو پاک میں اسلامی کلچر/پروفیسر عزیز احمد (ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی)/ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۱ء/ص:۲۸۹۔

(۴) حیات عبدالحق/ص:۲۸۲۔

(۵) حضرت مجدد الف ثانی/مولانا سید زوار حسین شاہ/ادارہ مجددیہ، کراچی ۱۹۷۵ء/ص:۱۳۹۔

(۶) مکتوبات امام ربانی/ ترجمہ (اردو): قاضی عالم الدین/اللجنۃ العلمیہ، حیدرآباد، بدون سن/ص:۳۴۔

(۷) ایضاً/۴۶-۴۵۔

(۸) ایضاً/ص:۸۳۔

(۹) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ/ج:۲/ص:۳۱۳۔

انہوں نے اپنا مشن نہیں بدلا۔ جہانگیر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے انہیں ایک سال بعد رہائی دلائی[(۱)] دراصل جہانگیر نے حضرت مجدد صاحبؒ کو اپنے دربار میں قید کرنے کے لئے طلب نہیں کیا تھا بلکہ بعض ملکی اور مذہبی مصلحتیں تھیں۔ ان کے مکتوبات کے جو اندراجات جہانگیر نے اپنی توزک میں پیش کیے تھے ان پر مجدد صاحب کے ہم عصر علماء معترض تھے[(۲)] اور پھر جہانگیر نے صرف ان کی قید پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان کے گھر بار کو لوٹنے کا بھی حکم دیا لیکن صبر و رضا کے اس مجسمہ نے اُف تک بھی نہ کی[(۳)] ایک طرف مکتوبات کے ذریعہ مجدد صاحبؒ نے اپنے پیروؤں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ تمام اسلامی اداروں کو بشمول جزیہ بحال کرائیں،[(۴)] دوسری طرف انکی کوشش یہ تھی کہ مذہبی قانون (شریعت) اور صوفیوں کے باطنی نظریات (طریقت) میں جو بُعد ہے اسے ختم کیا جائے اور دونوں کو صحیح معنوں میں ایک دوسرے میں ضم کر دیا جائے۔[(۵)] وہ صرف ایک صوفی یا واعظ ہی نہیں تھے بلکہ واقعتاً اپنے زمانہ کے ممتاز ترین عالم تھے۔ عربی اور فارسی میں انہیں مہارتِ تامہ حاصل تھی، دونوں ہی زبانوں میں تقریر و تحریر کا ملکہ رکھتے تھے۔ آپ کے عربی رسائل اثبات النبوۃ اور رسالہ تہلیلیہ نے قبولیت و شہرت حاصل کی۔[(۶)]

اس عہد کے دوسرے مشہور علماء و ادباء میں مولانا شکر اللہ شیرازی، مولانا تقیا شوستری، مرزا قاسم گیلانی، خواجہ علی بنو کشمیری، صادق کشمیری، قاضی ابو القاسم سیالکوٹی وغیرہم عربی زبان و ادب کے مشہور و معروف علماء، فضلاء، ادباء و شعراء تھے۔[(۷)]

جہانگیر کے بعد زمامِ سلطنت شاہجہاں کے ہاتھ میں آئی جو اپنی مشہور عمارات کی وجہ سے مغل عہد کا نام روشن کئے ہوئے ہے اس لئے مؤرخین نے اس کے علمی ذوق کی طرف زیادہ التفات نہیں کیا حالانکہ اس کے زمانہ میں نہ صرف یہ کہ علماء و ادباء کی قدر افزائی ہی ہوئی بلکہ اہل علم کی سرپرستی کی گئی۔ وہ اپنے باپ کی طرح ادیب تو نہیں تھا لیکن ادب پرور ضرور تھا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا فیض یافتہ تھا، اس لئے اس کی فکر صالح تھی، اس کے وزراء میں ''علامۃ الوری'' اور فہامۃ العصر'' جیسے القاب سے یاد کئے جانے والے سعد اللہ خاں بھی تھے اور میر بخشی کے عہدے پر دانشمند خاں بھی، جنہوں نے ملا عبد الکریم سیالکوٹی جیسے جید عالم دین سے سورۂ فاتحہ کی چوتھی آیت پر مذاکرہ کر کے اپنے علمی تعمق کی داد وصول کی تھی[(۸)] اس عہد میں علماء، فضلاء اور شعر و ادب کے مشاقین کا جم غفیر تھا۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی صاحب جیسے صاحب علم و فضل، معدن عقلیات و نقلیات

(۱) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ/ص:۳۱۴۔

(۲) رودِ کوثر/ص:۲۷۰۔

(۳) انوارِ اولیاء/سید رئیس احمد جعفری/غلام علی اینڈ سنس، لاہور؛ طبع: دوم ۱۹۵۸ء/ص:۵۱۶۔

(۴) برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ (اردو ترجمہ: ہلال احمد زبیری)/کراچی یونیورسٹی، کراچی؛ طبع: سوم ۱۹۸۷ء/ص:۲۰۲۔

(۵) برعظیم پاک وہند کی میں اسلامی کلچر/ص:۲۸۴۔

(۶) عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں/ص:۱۷۸۔

(۷) ایضاً/ص:۱۸۲تا۱۸۴۔

(۸) ہندوستان کے سلاطین وعلماء/صباح الدین عبد الرحمٰن/ص:۲۷۔

عبدالسلام لاہوری، شمسِ بازغہ جیسی نادر کتاب کے مصنف ملامحمود جونپوری جیسے لوگوں نے مختلف میدانوں میں اپنے علمی جواہر دکھا کر ہندوستان کو علم و ہنر کا گہوارہ بنادیا تھا۔ اپنی ذاتی دل چسپی کے باعث وہ اپنے باپ دادا سے بازی لے گیا۔ شعراء وفضلاء کے ساتھ اس نے دادودہش کا جومظاہرہ کیا اس کی مثال شاید ہی کسی حکمراں خاندان میں ملے۔ (۱)

شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آتا ہے جو فطرتاً علمی ذوق کے حامل تھے جن کو ان کے اساتذہ مولانا عبداللطیف سلطانپوری، ہاشم گیلانی، ملا مومن بہاری، ملا شیخ احمد المعروف ملا جیون، شیخ عبدالقوی اور دانشمند خاں جیسے ماہرینِ فن وادب کی تربیت کے باعث خوب جلا ملی۔ (۲)

اس عہد کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب علوم وفنون کا سب سے زیادہ دلدادہ تھا۔ اس کا طبعی رجحان علومِ دینیہ کی طرف مائل تھا۔ چونکہ علوم دینیہ کی اساس عربی زبان ہے اس لئے اس زبان سے اسے خصوصی نسبت تھی، اسکی ایک وجہ اسے فاضل ترین اساتذہ میسر ہونا بھی تھی۔ مثلاً اورنگ زیب کے استاد ملا جیون عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے مشہور شاعر بھی تھے۔ انہوں نے قصیدہ بُردہ کی روش پر ۲۲۰ ر اشعار پر مشتمل ایک طویل قصیدہ لکھا، پھر سفرِ حجاز میں عربی زبان میں اس کی شرح بھی خود ہی لکھی، علاوہ ازیں حجاز کے قیام کے دوران تقریباً ۲۹ ر قصائد مزید لکھے۔ اسی طرح شیخ عبدالعزیز اکبرآبادی، شیخ قطب برہان پوری اور شیخ غلام علی نقشبندی لکھنوی عربی ادب کے بہترین نقاد اور شعراء تھے۔ (۳)

اورنگ زیب کا ذاتی علمی کارنامہ فتاوی عالمگیری ہے جو ان کے حکم پر اس وقت کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے مشہور ومعروف علماء کرام کی زیرِ نگرانی ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ عربی کی چھ ضخیم جلدوں میں ہے اور جس کے فتاوی ابھی تک بھی مستند مانے جاتے ہیں۔ فقہی مسائل کے استنباط کے سلسلہ میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ان کی تعداد ایک روایت کے مطابق ایک سو چوبیس ہے جو شاہی کتب خانہ میں موجود تھیں (۴) جس سے عالمگیر کے علمی ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس نے با قاعدہ فنِ خطاطی سیکھ کر اسے کسبِ معاش سے جوڑا، وہ اپنے ہاتھ سے کلام پاک لکھ کر انہیں فروخت کیا کرتا اور اس سے اپنے اخراجات چلاتا جو آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ (۵) اس نے اپنی بیٹی زیب النساء کی سرپرستی میں بیت العلوم (اکیڈمی) قائم کر کے علوم وفنون کو زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی۔ اس اکیڈمی میں نعمت خاں

---

(۱) عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں/ص:۱۸۹۔

(۲) عالمگیر کا علمی ذوق/ صباح الدین عبدالرحمٰن/ معارف، اعظم گڑھ ؛ ۳۹/۵ ؛ مئی ۳۷/ ص:۳۳۵۔

(۳) عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں/ص:۲۲۹۔

(۴) ایضاً/ص:۲۳۱-۲۳۰۔

(۵) عالمگیر کا علمی ذوق/ص:۳۳۸۔

عالی، ملاصفی الدین قزوینی اور مرزا خلیل جیسے ممتاز فضلاء وابستہ تھے[1] اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغل سلطنت کی روشنی مدھم ہوتی چلی گئی۔

المختصر مغلوں کے عہدِ حکومت میں عربی زبان وادب کا جو ارتقاء ہوا اس کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر چہ عربی ان کی مادری زبان نہیں تھی تاہم انہوں نے اسے جس انداز سے اپنایا اور اس سے اپنے تعلق کا اظہار جس انداز میں کیا وہ لائقِ تحسین ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''عربی ایک ایسی وسیع وہمہ گیر زبان ہے کہ ایک بار دنیا کے جس خطہ میں پہونچ گئی وہاں اس نے قدم جمالئے لوگوں نے اس میں لکھنا پڑھنا اور بولنا شروع کر دیا اور بسا اوقات اس کا جادو اس قدر چلا کہ غیر عربی زبانیں بھی عربی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔[2] مغلوں کی عام علمی سرپرستی کے باعث فضلاء کی اتنی کثرت تھی کہ مشہور اشخاص کے نام لکھنے کے لئے بھی رجسٹر درکار ہیں نہ صرف یہ کہ ان کے حکمراں بلکہ ان کی بیگمات، ماہم بیگم، گلبدن بیگم، سلطانہ بیگم، زیب النساء بیگم، زینت النساء بیگم وغیرہ نے بھی اپنی علمی سرگرمیوں اور تعلیمی دلچسپیوں سے زمانہ سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔[3]

اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ نے جس عظیم اور متحد ہندوستان کی باگ ڈور اپنے ورثاء کے سپرد کی تھی ان ورثاء نے اپنی تعیش پسندی، کاہلی، اور نااہلی کے باعث ملک کے تحفظ کے بجائے عالمگیر کے بخشے ہوئے استحکام اور رعب ودبدبہ کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا[4] جس کی وجہ سے پورے ملک میں سیاسی انتشار برپا ہو گیا۔ لیکن اس دورِ انحطاط میں بھی ایسی باکمال اور ممتاز شخصیتیں پیدا ہوئیں جو ہندوستان میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا سبب بنیں[5] جن میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جن کے والد شاہ عبد الرحیم صاحب دہلویؒ فتاوی عالمگیری کے مرتبین میں سے تھے اور اپنے وقت کے متبحر عالم دین تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کے عہد (۱۱۱۴ھ/۱۱۷۶ھ - ۱۷۰۳ء/۱۷۶۲ء) میں گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے جن میں کسی کی مدت حکومت دس مہینے، کسی کی چار مہینے سے بھی کم کسی کی برائے نام چند دن ہی رہی جس سے ان کے اقتدار کی کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے۔[6] ادھر مرہٹوں سکھوں کی تحریکیں مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کے تمام دروازے کھولے ہوئے تھیں، یہاں تک کہ بے گناہ مسلمانوں کو جلا کر اور تڑپا تڑپا کر مارا جاتا تھا۔[7]

---

(۱) مُلّا جیون کے معاصر علماء/ اشفاق علی/ نظامی پریس لکھنؤ؛ طبع اول، دسمبر ۸۲ء/ ص:۳۵۔

(۲) فن تحریر کی تاریخ/ محمد اسحاق صدیقی/ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۶۲ء/ ص:۲۱۱-۲۱۲۔

(۳) ہندوستان میں عربی شاعری؛/ ص:۱۳۔

(۴) تاریخ دعوت وعزیمت/ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ/ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۱۹۸۴ء/ ج:۵، ص:۴۵۔

(۵) ایضاً/ ج:۵، ص:۵۹۔

(۶) ایضاً/ ج:۵، ص:۴۷۔

(۷) خدا کا ایک وفادار بندہ/ مناظر احسن گیلانی/ الفرقان، بریلی؛ شاہ ولی اللہ نمبر؛ طبع: دوم ۱۳۶۰ھ/ ص:۱۲۸۔

پانچویں فصل: ولی اللّٰہی خاندان اور عربی علوم وفنون

شاہ ولی اللہ کی ولادت ۴؍شوال ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء بروز چہار شنبہ اپنے نانیہال پُھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد پندرہ سال کی عمر میں والد صاحب سے مشکوٰۃ کا درس لیا اور اسی سال ہندوستان میں رائج علوم سے فراغت حاصل کی[۱] تیس سال کی عمر میں حج کے لئے گئے۔ دو سال وہاں رہ کر شیخ ابو طاہر مدنی سے اور دوسرے مشائخ حرمین سے حدیث کی روایت کی پھر ہندوستان واپس آ کر اپنے والد کے مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کر دیا۔[۲]

شاہ صاحب علیہ الرحمۃ صرف قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر میں ہی مہارت تامہ نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ عربی ادب کے رموز سے بھی پوری طرح آشنا تھے۔ چنانچہ ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اہل زبان کی سی روانی وقدرت اور ادباء عربی کی سی عربیت ہے[۳] اس کتاب کے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی کی رائے ہے کہ ''حجۃ اللہ البالغۃ کو پڑھ کر دیکھئے تو شاہ صاحب کسی عمل، کسی خُلق اور کسی عقیدہ کی خوبی اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ اس میں عمومیت پیدا ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام افراد یعنی مشرق ومغرب اور عجم وعرب میں پایا جاتا ہے۔[۴]

شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے عربی کی متعدد کتب مختلف موضوعات پر تصنیف فرمائیں، ان کی عربی کتب کو ہر طبقہ اور ہر زمانہ میں شرفِ قبولیت حاصل رہی، آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں نعتیہ عربی قصائد بھی کہے جن کا مجموعہ ''اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم'' کے نام سے ملتا ہے۔[۵]

شاہ صاحبؒ نے مستقل تصانیف کے علاوہ عربی مکاتیب کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جن سے شاہ صاحب کی وسعتِ علمی، مجتہدانہ نظر اور انصاف پسندی پوری طرح نمایاں ہے[۶] شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کا انتقال ۲۹؍محرم ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء کو ہوا[۷] اور ایک قول کے مطابق ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء کی آخری تاریخ (۲۹ یا ۳۰ ذی الحجہ)[۸] کو ہوا انہوں نے اپنے علم و

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت/ ج:۵، ص:۴۷۔

(۲) ایضاً/ ج:۵، ص:۵۹۔

(۳) شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف/ سید ابو الحسن علی ندویؒ/ الفرقان، بریلی؛ شاہ ولی اللہ نمبر/ ص:۳۶۶۔

(۴) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ/ مولانا عبید اللہ سندھی/ سندھ ساگر اکادمی، لاہور، مئی ۱۹۴۴ء/ ص:۲۶۔

(۵) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات/ خلیق احمد نظامی/ ندوۃ المصنفین، دہلی ۶۹ء/ ص:۲۲۱-۲۱۵۔

(۶) رود کوثر/ شیخ محمد اکرام/ تاج کمپنی، دہلی ۸۷ء/ ص:۵۷۲۔

(۷) تاریخ دعوت وعزیمت (حاشیہ)/ ج:۵، ص:۱۱۸۔

(۸) سیاسی مکتوبات/ خلیق نظامی/ ص:۲۰۳۔

عمل سے جس فکر کو پیش کیا وہ انہیں کا حصہ ہے۔

مغلوں کے خاتمہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تیزی سے بڑھتے اثرات اور سیاسی رسوخ نے ہر فکر مند مذہب پسند مسلمان کو تشویش واضطراب میں مبتلا کر دیا تھا اس کے تدارک کی ہر ممکنہ تدبیر کے لئے ایک طرف شاہ صاحب نے سیاسی طور پر مجاہدے شروع کئے۔ اسی غرض سے شاہ صاحب نے نجیب الدولہ اور احمد شاہ درانی سے رابطہ قائم کیا، انہوں نے احمد شاہ سے جو مراسلت کی اس میں ان کا یہ جملہ ''بالجملہ ایں جماعت مسلمین قابلِ ترحم اند''[۱] یعنی مسلمانوں کی جماعت قابل رحم ہے۔ خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اس وقت ان کی سیاسی فکر چونکہ ہمارا موضوع نہیں ہے لیکن یہ بتلانا مقصود ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ ہمہ جہتی شخصیت کا مالک تھے۔ انہوں نے اپنی اور لا داور تلامذہ کی جس انداز سے تربیت کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کے مدرسہ رحیمیہ میں علماء کی ایسی جماعت تیار کر رہے تھے جو ایک طرف میدانِ عمل میں سرگرم ہو تو دوسری طرف مذہب اسلام اور اسلامی علوم وفنون کی بھی اشاعت کرنے والی ہو۔

اس فکر کو انہوں نے ہر جگہ ملحوظ رکھا، چنانچہ ان کے سیاسی رفیق نجیب الدولہ اور احمد شاہ درانی خود صاحب علم اور علم دوست حضرات تھے، نواب نجیب الدولہ کے دربار سے علماء کرام جڑے ہوئے تھے۔ جن میں سب سے نیچے درجے والے کو پانچ روپئے ماہانہ اور اعلیٰ کو پانچ سو روپئے ماہانہ ملتے تھے[۲] احمد شاہ خود علم وادب کا ذوق رکھنے والا تھا۔[۳]

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی وفات کے بعد شاہ عبد العزیز دہلوی علیہ الرحمۃ (جو ان کے بڑے بیٹے تھے) شاہ صاحب کے علمی جانشین ہوئے۔ شاہ عبد العزیز دہلوی کی ولادت ۲۵/رمضان ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء کو ہوئی، تاریخی نام غلام حلیم ہے[۴] آپ بھی علم وعمل کے امام تھے، آپ فطری ذہانت کے مالک تھے جس کے باعث لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لئے آتے۔ شعراء اپنا کلام دکھلانے اور اس میں اصلاح کی غرض سے آپ کے سامنے حاضر ہوتے[۵]

شاہ عبد العزیز دہلی میں درس وافادہ میں مصروف ہونے کے باوجود پورے ہندوستان کے حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے، انہیں حالات کا مطالعہ کرنے پر یہ نتیجہ نکالنے میں دیر نہیں لگی کہ اس وقت بچے کھچے اسلامی اقتدار اور اس ملک میں مسلمانوں کے لئے مستقبل کا خطرہ انگریز ہیں، اس خطرہ سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے وہ اپنے زمانہ میں ہر ممکنہ تدبیر کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک طرف اپنے ہونہار شاگردوں سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید علیہما الرحمۃ کو میدانِ کارزار میں بھیجا جن

---

(۱) سیاسی مکتوبات/ص:۱۱۔

(۲) تاریخ دعوت وعزیمت/ ج:۵،ص:۳۰۷۔

(۳) ایضاً/ ج:۵،ص:۳۱۳۔

(۴) ایضاً/ ج:۵،ص:۳۴۶۔

(۵) ایضاً/ ج:۵،ص:۳۵۱۔

کے ساتھیوں میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صادقپوری، مولانا احمد اللہ، ومولانا عبداللہ تھے۔[1] دوسری طرف وہ ان علماء کی تربیت میں مشغول تھے جن میں کا ہر فرد اپنی جگہ عربی علوم وفنون اور مذہبی اسلامی تعلیم وتربیت کا مدرسہ اور دبستان تھا۔ انمیں مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ (۱۱۶۲۔۱۲۴۵ھ/ ۱۷۴۹۔۱۸۳۰ء) مولانا امام الدین دہلوی، مولانا حیدر علی رامپوری ٹونکی، مولانا حیدر علی فیض آبادی، مولانا رشید الدین دہلوی اور مولانا مفتی صدر الدین دہلوی مشہور ومعروف ہیں۔[2] شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ عربی کے مسلم الثبوت ادیب تھے، نثر ونظم دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ عربی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے جو زمانہ کی نذر ہوگیا، اس کے باوجود خاصا مطبوعہ کلام ہے۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی آپ سے ہی اصلاح لیتے تھے[3] (مولانا فضل حق عربی زبان کے بہت بڑے ادیب وشاعر تھے جن کو سرسید نے بہت سراہا ہے، اوران کی عربی نثر ونظم کے نمونے آثار الصنادید میں نقل کئے ہیں)[4] شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین بھی اپنے وقت کے مشہور صاحب علم وفضل گذرے ہیں انہیں عربی زبان پر قدرت کاملہ حاصل تھی، انہوں نے بوعلی سینا کے ''قصیدۂ عینیہ'' کے جواب میں ''قصیدۃ الروح'' لکھا جس سے آپ کی قادر الکلامی اور عربیت کا پتہ چلتا ہے[5]۔ شاہ ولی اللہ کے تیسرے صاحبزادے شاہ عبدالقادر تھے، انہیں اردو کا پہلا مترجمِ قرآن ہونے کا شرف حاصل ہے، انہوں نے بھی عربی علوم وفنون کو اپنی شبانہ روز محنت سے تقویت بخشی،[6] چوتھے صاحبزادے شاہ عبدالغنی تھے جو جوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن اللہ نے ان کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کے ذریعہ جو کام لیا اس نے ان کی طرف سے تلافی کردی۔[7]

مجملاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کی طرح ان کی اولاد نے بھی ہندوستان کی امتِ مسلمہ کی ہمہ جہتی خدمات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے دہلی کے علاقہ مہندیان میں جس مدرسہ کی ابتدا کی تھی، اس کے فیوض اتنے جاری وساری ہوئے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے زمانہ تک اس میں طلباء کی خاصی تعداد ہوگئی۔ اور پھر اس کی مقبولیت اتنی ہوئی

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت/ ج:۵، ص:۳۷۲۔
(۲) ایضاً/ ج:۵، ص:۳۸۱۔
(۳) ہندوستان میں عربی شاعری/ ص:۱۵۱۔
(۴) آثار الصنادید/ سید احمد خاں (مرتبہ: خلیق انجم) اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۰ء/ ج:۲، ص:۹۷-۱۱۳۔
(۵) نزہۃ الخواطر/ سید عبدالحی حسنیؒ/ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد ۱۹۷۹ء/ ج:۷، ص:۱۸۸۔
(۶) ایضاً/ ج:۷، ص: ۲۹۶۔
(۷) تاریخ دعوت وعزیمت/ ج:۵، ص:۳۸۷۔

کہ شاہ عبدالعزیز کے دور میں مدرسہ رحیمیہ کے احاطہ میں تنگی محسوس ہونے لگی۔ اس کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے مغل حکمراں محمد شاہ نے شاہ عبدالعزیز کو مہندیان سے بلا کر دہلی میں ایک عظیم الشان مکان دیا جو محلّہ مدرسہ شاہ عبدالعزیز کہلایا۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء تک قائم رہا[۱] اس مدرسہ نے اسلامی علوم وفنون کی جو خدمت کی اس کی نظیر ناممکن ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے علمی جانشین ان کے نواسے شاہ محمد اسحاق دہلویؒ تھے جنہوں نے بیس سال تک فنِ حدیث کے ذریعہ "جدیدالفکر" طلباء کو پڑھایا اور پھر مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔[۲]

شاہ اسحاق کے بعد اس مدرسہ کی باگ ڈور شاہ عبدالغنی اور مولانا موسی نے سنبھالی لیکن ۱۸۵۶ء میں مولانا محمد موسی کی وفات اور شاہ عبدالغنی کی مدینہ منورہ ہجرت سے علم وعمل کی یہ چھاؤنی بے رونق ہوگئی۔ بالآخر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں یہ مدرسہ لوٹ لیا گیا۔ یہ مدرسہ ایک زبردست نیم سیاسی اور نیم مذہبی تحریک تھا، اس نے علماء کی ایسی جماعت دی جو قلم اور تلوار کے ذریعہ اشاعت علم کے ساتھ ساتھ ولی اللّٰہی تحریک کو بھی تقویت دینا چاہتی تھی۔[۳]

اسی تحریک کا ایک مدرسہ نواب نجیب الدولہ نے نجیب آباد میں قائم کیا تھا جہاں طلباء مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دوسرا رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ تھا جہاں سید احمد شہید کی ولادت ہوئی اور تیسرا مرکز سندھ میں ملا محمد معین کا مدرسہ تھا۔[۴]

لکھنؤ میں فرنگی محل کا دارالعلوم مدرسہ نظامیہ بھی قدیم مدارس میں شمار کیا جاتا ہے۔ ملا نظام الدین سہالویؒ اس کے بانی تھے (دینی مدارس میں عام طور سے جو نصاب رائج ہے اسے درسِ نظامی کہتے ہیں۔ اس کے بانی چونکہ یہی تھے اسی لئے ان کی طرف منسوب ہے) فرنگی محل کے اس دارالعلوم سے عربی زبان وادب، معقولات ومنقولات کے بڑے نامور علماء پیدا ہوئے جنہوں نے ہندوستان میں علوم کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ جن میں مولانا عبدالعلی (وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) مولانا عبدالحلیم (وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) ملاحسن (وفات ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) اور اخیر میں مولانا عبدالحئی (وفات ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) بہت مشہور ہیں۔[۵]

---

(۱) اسلامی نظام تعلیم/ پروفیسر سعید احمد رفیق/ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، سن ندارد/ص:۲۱۵۔

(۲) آثار الصنادید/ ج:۲، ص:۹۱۔

ضروری نوٹ: یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ کی جنگ آزادی میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے اکثر شاگردوں نے بحیثیت علماء اس تحریک میں حصہ لیا جن میں مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا عبدالجلیل علی گڑھی، مفتی صدرالدین آزردہ وغیرہم اہم ہیں اور شاہ اسحاق صاحب کے ہی شاگردوں کے شاگرد مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا مظہر نانوتوی اور مولانا محمد منیر نانوتوی نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ (تذکرہ علمائے ہند؛ مترجمہ: ایوب قادری/ پاکستان ہسٹریکل سوسائٹی، کراچی ۱۹۶۱ء/ص:۴۰۹)۔

(۳) اسلامی نظام تعلیم/ص:۲۱۵۔

(۴) ایضاً/ص:۲۱۶۔

(۵) تاریخ دارالعلوم، دیوبند/ سید محبوب رضوی/ مکتبہ دارالعلوم، دیوبند ۱۹۷۷ء/ ج:۱، ص:۷۹۔

رام پور کا مدرسہ عالیہ والیٔ رام پور نواب فیض اللہ خاں کی خصوصی توجہات سے بہت زیادہ نامور رہا۔ انہوں نے بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی کو صدر مدرس مقرر کیا، ملا حسن بھی اسی مدرسہ میں مدرس رہے، ان لوگوں کے فیض تعلیم سے رام پور میں مدتوں علم کی گرم بازاری رہی۔(۱)

دہلی میں غازی الدین خاں فیروز جنگ اول (وفات ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء) نے ایک مدرسہ اجمیری دروازے کے قریب قائم کیا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اسے دہلی کالج میں تبدیل کر دیا اور انگریزی وعلوم جدیدہ اس کے نصاب میں شامل کر دیا۔ مسٹر جے، ایچ ٹیلر اس کے پرنسپل مقرر کئے گئے۔ ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کو کشمیری دروازے کی ایک بڑی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسٹر ٹیلر کے ہلاک ہونے کے بعد یہ کالج بند ہو گیا۔ پھر ۱۸۹۰ء/ ۱۳۰۸ھ میں یہی کالج اینگلو عربک کالج کے نام سے از سرِ نو جاری کیا گیا۔(۲) (یہی کالج اب ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کے نام سے جانا جاتا ہے)۔

اسی دہلی کالج میں شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے ہونہار شاگرد مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ (وفات ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء) نے صدر المدرسین کے فرائض انجام دئے، یہ اپنے وقت کے عربی زبان وادب کے مسلم الثبوت ادیب تھے۔ آپ نے مولانا شاہ رفیع الدین سے خصوصی فیض حاصل کیا ان کی مرقع ومقفی عربی نثر کا نمونہ سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے بطورِ نمونہ آثار الصنادید میں دیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔(۳) مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ کی وفات کے بعد ان کے مایہ ناز شاگرد مولانا مملوک علی نانوتویؒ اسی عہدہ پر مامور ہوئے جو کہ نہایت ذہین وفطین تھے۔ سرسید علیہ الرحمۃ کا ان کے بارے میں یہ کہنا کہاں کی ذہانت کا ثبوت ہے کہ "اگر کتابوں سے علم کا خزانہ خالی ہو جائے تو ان کی لوحِ محفوظ سے ان علوم کی پھر نقل ممکن ہے"(۴) ان کی وفات ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء میں ہوئی، اسی کالج کے فیض یافتگان میں سرسید احمد خاں علیہ الرحمۃ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۴۸،۱۲۹۷ھ/ ۱۸۳۲،۱۸۸۰ء) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۲۴۹،۱۳۰۲ھ/۱۸۳۳،۱۸۸۵ء) مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۴۲-۱۳۲۳ھ/ ۱۸۲۶-۱۹۰۵ء)، مولانا ذوالفقار دیوبندی (وفات ۱۳۲۲ھ) مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا فضل الرحمٰن (۱۲۴۷-۱۳۲۵ھ/ ۱۸۳۱-۱۹۰۷ء) دیوبندی جیسے مشاہیر عربی زبان وادب اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔(۵)

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ نے ہندوستان میں علم کی جو مشعل روشن کی تھی اللہ نے اسے

---

(۱) ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں/ ابو الحسنات ندوی/ مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۵۵ھ- ۱۹۳۶ء/ ص:۳۳۔

(۲) واقعات دار الحکومت دہلی/ بشیر الدین احمد/ شمسی پریس، آگرہ ۱۳۳۷ھ - ۱۹۱۹ء/ ص:۵۶۲-۵۷۶۔

(۳) آثار الصنادید/ ج:۲، ص:۸۰۔

(۴) ایضاً/ ج:۲، ص:۱۱۵۔

(۵) تاریخ دار العلوم، دیو بند۔

برکتوں سے نوازا اور چراغ سے چراغ جل کر پورا برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے کو اسنے منور کیا۔ خصوصاً عربی زبان وادب کو اس مکتبِ فکر سے جو ترقی ملی، اس کا احاطہ دشوار ہے۔ یہاں تک کہ مجاہدینِ جنگِ آزادی نے غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی اس زبان کو ذریعہ بنایا۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی کے جنگ حریت سے متعلق بھی قصائد موجود ہیں۔[1]

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ نے مسلمانوں کے سامنے مستقبل کے لئے ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا تھا۔ کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ان کے مذہب وتہذیب اور تعلیم وثقافت کو مٹانے کے لئے کوشاں تھی۔ اس وقت مشنریز کا تعلیم کے فروغ کی آڑ میں سیدھا نشانہ مسلمان تھے۔ اس عہد کی برطانوی تعلیمی پالیسیوں کی رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشنریز ایسے کالج اور اسکول کھولنے میں سرگرم عمل تھیں جن سے دینِ اسلام سے بے رغبتی پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے جگہ جگہ مدارس کھولے جن کا خاص مقصد تبدیلی مذہب تھا۔ اور وہ مذہب بدلنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور خاص طور پر تبلیغی کام کو چلانے کے لئے مددگاروں کی تربیت کی خاطر وہ تعلیمی کام کرنے پر مجبور تھے۔[2] اس دور میں سنسکرت اور عربی ہندو اور مسلم عوام کی آئینی و مذہبی زبانیں تھیں جن کا تدارک مشہور انگریز ماہر تعلیم میکالے نے یہ تلاش کیا کہ ہندوستان میں تعلیمی پالیسی کا مقصد انگریزی زبان میں مغربی علوم کی اشاعت ہونا چاہئے اس نے یہ تجویز بھی رکھی کہ مشرقی علوم کے موجودہ اداروں کو فوراً بند کر دیا جائے اور اس طرح جو رقم بچے وہ انگریزی تعلیم کی ترقی پر صرف کی جائے۔[3] اور تو اور وہ دہلی کی مشہور شاہ جہانی مسجد کو گرجا گھر میں تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔[4]

---

(۱) ہندوستان میں عربی شاعری/ص:۲۶۵۔

(۲) تاریخ تعلیم ہند/سید نور اللہ و جے، پی، نائک؛ مترجمہ: مسعود الحق/نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی ۱۹۷۳ء/ص:۱۴۶۔

(۳) ایضاً/ص:۱۰۲۔

(۴) تاریخ جمعیت علمائے ہند/اسیر ادروی/الجمعیۃ بکڈپو، دہلی ۱۴۰۳ھ-۱۹۸۳ء/ص:۲۶۔

چھٹی فصل

دینی مدارس کی نشاۃ ثانیہ اور عربی زبان وادب

ان حالات کو علمائے دین اور مسلم دانشوروں نے بہت زیادہ محسوس کیا اس کے تدارک کے لئے ایک طرف سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ (۱۸۱۷، ۱۸۹۷ء) نے ایسے ادارہ کی منصوبہ سازی کی جہاں مسلمان کے ایک ہاتھ میں سائنس اور دوسرے میں فلسفہ اور سر پر قرآن کا تاج ہو وہیں دوسری طرف مسلم علمائے کرام نے میکالے کے منصوبہ کو چیلنج کی شکل میں قبول کرتے ہوئے ایسے اداروں کا وسیع تر ذہنی خاکہ تیار کیا جو حکومت کی امداد کے محتاج نہ ہوں اور ان سے نکلنے والے علماء وفضلاء حکومتِ فرنگی اور اس کی مذہبی مشنریز کا مقابلہ علمی و عملی سطح پر کر سکیں تا کہ مسلمانوں کا مذہب، ان کی تہذیبی شناخت اور دینی زبان عربی کی حفاظت اور اس کی نشو ونما بھی ہوتی رہے، اس سلسلہ کی پہلی با مقصد کوشش دار العلوم، دیوبند کی شکل میں سامنے آئی۔

دار العلوم، دیوبند

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں اہلِ وطن کو بھلے ہی ناکامی ہوئی ہو لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انگریزوں کے دلوں میں دہشت پیدا ہوگئی اور وہ اپنی مذکورہ بالا تجاویز سے مصلحتاً دست بردار ہو گئے لیکن مشائخِ وقت کو ہمہ وقت یہ فکر دامنگیر رہی کہ موجودہ دس بیس علماء اگر اس دارِ فانی سے چل بسے تو ہندوستان سے دینی علوم مفقود ہو جائینگے،[1] اسی بنا پر ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ (۱۹ر مئی ۱۸۶۶ء) دار العلوم، دیوبند کی بنیاد پڑی۔

دار العلوم، دیوبند کے قیام سے قبل تک مدارس کے قیام کا ذریعہ امراء وسلاطین ہوا کرتے تھے۔ دار العلوم کے قیام کے وقت یہ دور گذر چکا تھا، اس لئے اس کے اکابر نے غریب عوام کی جانب دست اعانت بڑھایا، اس کے بانیوں میں سے ایک حاجی عابد حسین نے سب سے پہلے خود چندہ پیش کیا اور رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں چار سو روپئے جمع ہو گئے۔ یہ قومی چندہ کی پہلی تحریک تھی جو عملاً کامیاب ثابت ہوئی، پھر اسی روش پر دوسرے مدارس یہاں تک کہ علی گڑھ کالج (۱۸۷۵ء/۱۲۹۱ھ) بھی اسی اصول پر قائم ہوا۔ اس طریقہ پر دار العلوم نے یہ مثال پیش کر کے ملک اور قوم کے لئے نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔[2] اس کے بانیوں میں سے حاجی عابد حسین (۱۲۵۰-۱۳۳۱ھ/۱۸۳۳-۱۹۱۳ء) کے علاوہ مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ،

---

(۱) تاریخ مظاہر/شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ/اشاعت العلوم، سہارنپور ۱۳۹۲ھ-۱۹۷۲ء/ج:۱/ص:۵۔

(۲) تاریخ دیوبند (قدیم نسخہ)/سید محبوب رضوی/ادارہ تاریخ دیوبند ۱۹۵۲ء/ص:۷۶-۷۷۔

مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ (۱۲۳۴-۱۳۲۲ھ/۱۸۱۹-۱۹۰۴ء) جیسے جلیل القدر حضرات تھے[1] جو عربی زبان وادب کے بھی درخشاں ستارے تھے۔

دارالعلوم، دیوبند جو ابتداء میں محمود نامی ایک استاد اور محمود نامی ایک شاگرد سے مسجد چھتہ دیوبند میں انار کے درخت کے نیچے شروع ہوا تھا، اس نے بہت جلد "محمودیت" کے عظیم مقامات طے کر لئے۔ اس کی روشنی سے عالم منور ہوا یہ اس کے بانیوں کے اخلاص کا ثمرہ تھا کہ اس کے فیض یافتگان ملک کے گوشے گوشے سے آ کر خوشہ چینی کرنے لگے اور پھر بیرونِ ملک کے تشنگانِ علم نے بھی یہاں آ کر سیرابی کی، اس ادارہ نے قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، اصول ومعانی، کلام وتصوف، منطق و فلسفہ کے علاوہ عربی زبان وادب کو بیش قیمت سرمایہ بہم پہونچایا، اس کے متعلقین کی اکثریت عربی شعر وادب کی دلدادہ تھی، ان میں بیشتر نے عربی شاعری میں طبع آزمائی کی، جن میں مولانا حبیب الرحمان عثمانی دیوبندیؒ (۱۳۴۸ھ/۱۹۲۵ء)، علامہ انور شاہ کشمیری (۱۲۹۲-۱۳۵۲ھ/۱۸۷۵-۱۹۳۳ء)، مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۲۹۲-۱۳۷۲ھ/۱۸۷۵-۱۹۵۲ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ/۱۸۶۳-۱۹۴۳ء)، مولانا اعزاز علی امروہوی (۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) وغیرہم عربی کے مشہور صاحبِ کلام وصاحبِ دیوان شعراء وعربی زبان وادب کی مشہور ومعروف شخصیات ہیں۔

مظاہر العلوم، سہارنپور

دارالعلوم، دیوبند کے بعد اسی طرز پر یکم رجب ۱۲۸۳ھ کو دیوبند کے ضلع سہارنپور میں چند مخلصینِ قوم نے مدرسہ مظاہر العلوم (ابتداءً عربی مدرسہ) کی بنیاد رکھی، اس میں سرِ فہرست نام مولانا سعادت علیؒ صاحب کا ہے، یہ مدرسہ شروع میں چوک کی مسجد میں قائم ہوا، بعد میں متصل کے محلہ میں ایک مکان کرایہ پر لے کر اس میں منتقل کر دیا گیا۔[2]

اس مدرسہ نے بھی ابتداء سے ہی عربی علوم وفنون کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا جمیل الرحمان تھانویؒ، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، مولانا سعد اللہ رحمہم اللہ نے عربی علوم وفنون اور شعر وادب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس مدرسہ کے ایک ہونہار طالب علم مولانا ظفر احمد عثمانی دیوبندی تھانوی ہمارا تحقیقی موضوع ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دہلی کالج کے نامور شاگرد، مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ذہین وفطین شاگرد، مولانا قاسم نانوتویؒ کے ممتاز ساتھی سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے ۱۸۵۷ء کے حالات کا مشاہدہ جس انداز سے کیا تھا۔ اس نے انہیں مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی

---

(۱) دارالعلوم، دیوبند کا بانی کون ہے؟ اگرچہ شروع میں یہ کوئی اختلافی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ اس کے بانیین اس کے اظہار کو اخلاص کے خلاف تصور کرتے ہوئے اپنے کو مخفی رکھ کر دوسرے کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس کے بانیوں میں حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ کو اہم مقام حاصل ہے۔ وہ ایک درویش صفت بزرگ تھے۔

(۲) تاریخ مظاہر/ج:۱/ص:۵۔

اور اقتصادی پسماندگی دور کرنے کے لئے بے چین کر دیا تھا۔ ان کا نظریہ حالات سے ٹکرانے کا نہیں بلکہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت انہوں نے زمانہ کی سخت ترین مخالفتوں اور مسلمانوں کی انتہائی شکایتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہائی اسکول (ایم، اے، او ہائی اسکول) کی بنیاد ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں رکھی جو بہت جلد ۸؍جنوری ۱۹۲۱ء سے علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔[1] اس درسگاہ نے شروع سے ہی انگریزی علوم کے ساتھ عربی علوم کو اپنے نصاب میں شامل کیا، قوم کے بہترین دماغوں اور لائق ترین فرزندوں مولانا حالیؒ (۱۸۳۷ء)، نواب محسن الملکؒ (۱۸۳۷-۱۹۰۷ء)، مولانا شبلیؒ (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء)، ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ء)، مولانا ذکاء اللہ (۱۸۳۲-۱۹۱۰ء) نے سرسید کی صوابدید کی صدا پر لبیک کہا۔[2] یہ سب عربی نثر و نظم کے میں تھے۔ عربی زبان و ادب کے ارتقاء کے لئے شعبۂ عربی نے روزِ اول سے آج تک وہ کار ہائے نمایاں انجام دیے جن کی نظیر دوسرے ہم عصر ادارے پیش کرنے سے قاصر رہے۔

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

دارالعلوم، دیوبند کے قدیم نصابِ تعلیم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جدید ترین نظامِ تعلیم میں مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے اس وقت کے جید ترین علماء مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ وغیرہم نے مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے وقت یہ طے کیا کہ علماء کی ایک مجلس قائم کر کے ہندوستان کے تمام علماء کو اس میں مدعو کیا جائے تا کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جا سکے جس میں ایسے علماء تیار ہوں جو روشن خیال ہوں، زمانہ کی نبض پر جن کا ہاتھ ہو، اور جنکی نگاہ قدیم و جدید کی مصنوعی اور سطحی تقسیم سے بالاتر ہو۔[3] اسی غرض سے اس مجلس کا نام ''ندوۃ العلماء'' رکھا گیا۔ اس مجلس کے محرک مولانا سید محمد علی مونگیریؒ تھے، انہیں کی تحریک پر اپریل ۱۸۹۴ء/ ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ فیضِ عام کی دستار بندی کے موقع پر کانپور میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا، اسی مجلس نے کئی سال گذرنے کے بعد ۱۸۹۸ء/ ۱۳۱۶ھ میں لکھنؤ میں اپنے تخیل اور مقاصد کے مطابق ایک تعلیمی تجربہ گاہ اور دینی درسگاہ کا ''دارالعلوم، ندوۃ العلماء'' کے نام سے آغاز کیا۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ساتھ مولانا سید عبدالحئی حسنیؒ کی عملی دلچسپی ندوہ کے قیام میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ وہ عربی زبان کے مستند مؤرخ و محقق ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے انشاء پرداز ادیب بھی تھے۔ ان کی عربی تصنیفات ''نزہۃ الخواطر''، ''معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف'' (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند) اور ''جنۃ المشرق و مطلع

---

(۱) تاریخ ندوۃ العلماء/ مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی/ ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۸۳ء/ ج:۱/ص:۵۰۔

(۲) ایضاً/ ج:۱/ص:۵۱۔

(۳) ایضاً/ ج:۱/ص:۱۱-۱۲۔

النورالمشرق' ہندوستان کے علمی حلقوں میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے عربی علمی حلقوں میں قبولیت عام حاصل کر چکی ہیں۔وہ زمانہ کا مشاہدہ کیے ہوئے تھے۔اسی لئے انہوں نے ندوہ کے قیام کے روزِاول سے ہی اسلام اوراس کے بقاء وتحفظ کی خاطر علماء کیلئے انگریزی زبان اور جدید علوم کونصاب میں داخل کرنیکی تجویز رکھی۔جنکو دینیات اور عربی علوم وفنون کے ساتھ پڑھایا جائے۔[۱] انہیں کے ساتھ ساتھ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس ادارہ کی جوخدمات کیں وہ نا قابلِ فراموش ہیں،ان حضرات کی مساعی سے ندوہ کے ذریعہ عربی زبان وادب کوفروغ ہوا۔

مدرسۃ الاصلاح،سرائے میر

ضلع اعظم گڑھ کی مردم خیز زمین میں ایک قصبہ سرائے میر ہے۔وہاں پر مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں مولانا محمد شفیع کی مخلصانہ تحریک پر رکھی گئی۔علامہ شبلی نعمانی نے اس کے ابتدائی اغراض ومقاصد اور طریقہ کار کا اجمالی خاکہ تیار کیا اور امام المفسرین مولانا حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۲-۱۹۳۰ء) نے اس کے ابتدائی دور سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات (۱۹۳۰ء) تک بحیثیت ناظم اس کی خدمت کی۔[۲] علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمۃ (۱۸۵۷/۱۹۱۴ء) اور علامہ حمید الدین فراہیؒ (۱۸۶۲/۱۹۳۰ء) دونوں ہی حضرات عربی ادب کے بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔اس مدرسہ کی بھی عربی زبان وادب کے ارتقاء میں نا قابلِ فراموش خدمات ہیں۔اس مدرسہ کے مشہور ترین فضلاء میں مولانا نجم الدین اصلاحی،مولانا امین احسن اصلاحی مولانا صدرالدین اصلاحی وغیرہم وہ قابل ذکر حضرات ہیں جنہوں نے عربی زبان پر کام کر کے اپنے لافانی نقوش چھوڑے۔

علاوہ ازیں جامعۃ الفلاح،بلریا گنج،جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ،الجامعۃ السلفیہ بنارس،مدرسہ قاسمیہ شاہی مرادآباد،دارالعلوم اہلسنت اشرفیہ،مصباح العلوم مبارکپور،جامع العلوم کانپور،جامعہ دارالسلام عمرآباد،معہد ملت مالیگاؤں،مدرسہ عالیہ کلکتہ وغیرہم وہ قابل ذکر عربی مدارس ہیں جنہوں نے عربی زبان کے تمام اہم فنون پر ایسے فضلاء تیار کئے جنہوں نے ہندوستان میں اس زبان کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔

انفرادی طور پر اگر ہم دیکھیں تو عبدالجلیل بلگرامی (۱۰۷۱ھ-۱۱۳۸ھ) حسان الہند سید غلام علی آزاد بلگرامی (۱۱۱۶-۱۲۰۰ھ) سید مرتضی بلگرامی (۱۱۴۵- ۱۲۰۵ھ) مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ (۱۱۶۲-۱۲۴۵ھ) فضل حق خیرآبادی (۱۲۱۲-۱۲۷۸ھ) مولانا فیض الحسن سہارنپوری (متوفی ۱۳۰۴ھ) نواب صدیق حسن خاں (۱۲۴۸-۱۳۰۷ھ) ڈپٹی نذیر

---

(۱) حیات عبدالحیٔ حسنی/مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ/ندوۃ المصنفین،دہلی ۱۹۷۰ء-۱۳۹۰ھ/ص:۱۳۴۔

(۲) ہندوستان کے اہم مدارس/محمد قمر اسحاق/انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز،نئی دہلی ۱۹۹۶ء/ج:۱/ص:۱۹۔

احمد دہلوی (۱۸۳۲-۱۹۱۲ء) خواجہ الطاف حسین حالیؔ (۱۲۵۳-۱۳۳۳ھ) علامہ احمد رضا خاں بریلوی (۱۲۷۲-۱۳۴۰ھ) سید سلیمان ندوی (۱۳۰۲-۱۳۷۳ھ) وہ مایۂ ناز ہستیاں ہیں جن کے وجود سے عربی زبان وشاعری کو ہندوستان میں پھیلنے، پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا، یہ حضرات اپنی ذات میں ایک ادارہ کی حیثیت سے اپنے زمانہ میں بھی متعارف ہوئے اور بعد میں بھی ان کی خدمات اور تذکرے ناقابلِ فراموش ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ ہندوستان اور عربی زبان وادب کے رشتوں کو بہ ہمہ وجوہ جو فروغ اور تقویت ملی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں حضرات اور ہزاروں اداروں نے عربی کو اظہارِ جذبات کا ذریعہ بنایا۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے، ملکی سیاسی حالات کو شاعری میں قلمبند کرنے، شیعی سنی اور اہلِ حدیث وغیرہ فرقوں کے عقائد وکلام تک میں عربی اشعار سے وقتاً فوقتاً کام لیا گیا۔ عربی نظم میں مستقل کتابیں لکھی گئیں،[1] یہ سلسلہ الحمدللہ تا ہنوز جاری ہے۔ موجودہ دور کے مشہور عربی ادیب مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) (جو ان سطور کے لکھتے وقت ہی مالکِ حقیقی سے جاملے) تک نے عربی فنون کے جن رموز سے ہندوستانیوں کو آشنا کرایا انہیں مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ عصری علوم کی درسگاہیں مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی جے۔ این۔ یونیورسٹی، دہلی، دہلی یونیورسٹی، دہلی، لکھنؤ یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی اور جنوبی ہند کے بیشتر عصری علومی ادارے بھی عربی زبان وادب کے اس سفر میں قدم بہ قدم ساتھ رہے اور ان سے بھی عربی زبان وادب کے گوہرِ نایاب برآمد ہوئے۔

انہیں شخصیات میں ایک شخصیت مولانا ظفر احمد عثانی دیوبندی ثم تھانوی کی ہے جنہوں نے قرآن وحدیث، شعر وادب، تحریر وتقریر، کلام وتصوف کو سمجھنے اور سمجھانے کا ذریعہ عربی زبان کو بنا کر اس لافانی زبان کی نمایاں خدمات انجام دیں، موصوف کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کی حیات وخدمات کو منظرِ عام پر لانے کی خاطر آئندہ صفحات میں تفصیلی تذکرہ پیش کیا جارہا ہے۔

---

(۱) ہندوستان میں عربی شاعری/ص: ۳۶۵۔

دوسرا باب

حالاتِ زندگی

مولانا ظفر احمد عثمانی

علمی دنیا میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا نامِ نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علم وعمل کے اس عظیم پیکر کو جس انداز سے خراجِ عقیدت پیش کیا جانا چاہئے تھا، یا ان کی علمی خدمات کو جس طرح منظرِ عام پر لانا چاہئے تھا اس طریقہ پر نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ مولانا مرحوم کی شرافت نفسی، عاجزی اور انکساری معلوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں بھی اپنے کو گوشۂ گم نامی میں ہی رکھا۔ حالانکہ وہ علمی دنیا کی ایک ممتاز ترین شخصیت تھے (جہاں انہوں نے اعلاء السنن کی بیس ضخیم جلدیں تیار کر کے فقہِ حنفی کی لازوال وکالت کی وہیں ان کے عربی قصائد اور مراثی، ان کی فطری ذہانت کی علامت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں)۔ اپنے نظریہ کے مطابق انہوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی بہبود وفلاح کا ضامن اور پاکستان کو ملّتِ اسلامیہ کی بقاء کی ضمانت جانا، تو اس کے لئے انہوں نے اپنا دن رات ایک کر کے پاکستان کے حق میں سلہٹ ریفرنڈم کی مہم سر کی۔ چنانچہ پاکستان کے مشرقی حصہ (ڈھاکہ) پر ۱۴راگست ۴۷ء کو پاکستانی پرچم کشائی کے لئے محمد علی جناح کی نظر انتخاب مولانا ممدوح پر ہی پڑی۔ جو ان کی خدمات کا کسی حد تک اعتراف تھا، ان کا بس چلتا تو وہ شاید اس وقت بھی اپنے کو مخفی ہی رکھتے، لیکن قدرت کو ان کے ہاتھوں سے یہ کام لینا تھا۔ آئندہ صفحات میں مولانا ظفر صاحبؒ کی حیات وخدمات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جارہی ہے۔

پہلی فصل: خاندانی پس منظر

مولانا ظفر احمد عثمانی دیوبندی ثم تھانوی، دیوبند کے عثمانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کے ذاتی حالات پر گفتگو کرنے سے قبل مختصراً دیوبند، ضمناً عثمانیوں کی دیوبند میں بود و باش اور پھر مولانا مرحوم کے خاندان پر ایک نظر ڈالی جائے تا کہ اپنی بات زیادہ واضح انداز سے کہی جا سکے۔

جہاں تک دیوبند کی قدامت کا تعلق ہے اس کے لئے مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندیؒ والدِ ماجد شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی مندرجہ ذیل عبارت جامع تعارف کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے:

"فکورة قديمة ،و قصبة عظيمة، و مدينة كريمة، و بلدة فخيمة، كانها اول عمران عُمِّر بعد الطوفان، ذات المعاهد الوسيعة و المساجد الرفيعة و معالم المشهورة و المقابر المزورة والآثار المحمودة و الاخبار المسعودة و ابنية مرصومة و امكنة مخصوصة"۔ (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آبادی طوفان نوح کے بعد کی ابتدائی بستیوں میں سے ایک ہے۔ دیوبند کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بہت سے اقوال پائے جاتے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے قلعہ میں دیو، بند کیا تھا، اسی واسطے دیوبند نام ہے (۲) کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ اس کا نام "دیوی بن" تھا یا دیوی بلاس تھا جو کثرت استعمال سے دیوبند ہو گیا۔ اس صورت میں دیوی بن کے معنی اس جنگل کے ہوئے جس میں دیوی موجود ہو کیونکہ یہاں کی جنگلاتی آبادی میں ایک بہت قدیم مندر پایا جاتا ہے جس کا نام "دیوی کنڈ" ہے اس لئے یہ نام بھی حقیقت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ "پانڈو نے ملک بدر ہونے کی پہلی مدت یہیں گذاری تھی، یہاں کا قلعہ سالار مسعود غازی کے اولین مفتوحہ قلعوں میں سے تھا (۳) دیوبند میں مسلمانوں کی آبادی کا پتہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) سے چلتا ہے۔ خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ایک مسترشد قاضی دانیال قطری، قطب الدین ایبک کے عہد (۶۰۲-۶۰۷ھ/ ۱۲۰۶-۱۲۱۰ء) میں یہاں عرصے تک مقیم رہے ہیں (۴) دیوبند میں کچھ مسجدیں اسلامی عہد حکومت کی تعمیر ہیں ان میں مسجد قلعہ، سلطان سکندر لودھی (۸۹۴-۹۲۳ھ/ ۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) مسجد خانقاہ، شہنشاہ اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ/ ۱۵۵۵-۱۶۰۵ء) اور مسجد، ابو المعالی اورنگ زیب (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ/ ۱۶۵۷-۱۷۰۶ء) کے عہد کی یادگار ہیں۔ یہ وہ مسجدیں ہیں جن میں کتبے لگے ہوئے ہیں۔

(۱) حیاتِ عثمانی / پروفیسر محمد نور الحسن شیر کوٹی / مکتبہ دار العلوم، کراچی ۱۹۸۵ء/ ۱۴۰۵/ ص:۴۸، نیز ملاحظہ کیجئے: الهدية السنية / مولانا ذوالفقار علی / مکتبہ مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۷ھ/ ص: ۱۰۔

(۲) تاریخ سہارنپور / پنڈت نند کشور / مطبوعہ سہارنپور ۱۲۸۵ھ-۱۸۶۸ء/ ص:۲۷ و ۱۶۰۔

(۳) امپریل گزیٹر آف انڈیا / مطبوعہ ۱۹۰۸ء/ ج:۱، ص:۲۴۲۔

(۴) تاریخ دار العلوم، دیوبند / محبوب رضوی / مطبوعہ ۱۹۷۷ء/ ج:۱، ص:۱۳۰۔

بعض مساجد اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں لیکن ان کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔[(۱)]

دیوبند کے قدیم مشہور ترین بزرگ افراد میں جو نام پائے جاتے ہیں ان میں شیخ علاء الدین مشہور بہ ''شاہ جنگل باش'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ علامہ ابن جوزی علیہ الرحمۃ کے شاگرد، شیخ شہاب الدین سُہروردی کے خلیفہ اور شیخ سعدی شیرازی کے ہم درس تھے ان کی وفات ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء میں دیوبند میں ہوئی، دیوبند میں ہی ان کا مزار ہے۔[(۲)]

دوسرے مشہور بزرگ شیخ شہاب الدین معروف بہ شاہ ولایت ہیں جن کو شیخ جلال الدین کبیر اولیاء پانی پتی سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ۷۸۰ھ/ ۱۳۷۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اور دار العلوم کے متصل ان کا مزار ہے۔ تیسرے بزرگ قالو قلندر ہیں، جن کا مزار تحصیل کے قریب ہے، ان کی وفات ۸۲۵ھ میں ہوئی اور دار العلوم کے متصل ان کا مزار ہے۔ تیسرے بزرگ قالو قلندر ہیں جن کا مزار تحصیل کے قریب ہے، ان کی وفات ۸۲۵ھ میں ہوئی۔ دیوبند کے صدیقی شیوخ کے جد امجد شیخ معز الاسلام شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے صحبت یافتہ تھے یہ بھی ساتویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئے ان کا مزار محلہ بڑے بھائیان میں ادینی مسجد کے قریب ہے۔

پانچویں بزرگ خوجہ ابو الوفاء شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی کے چچا زاد بھائی ہیں اگرچہ ان کی صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں ہوتی تاہم یہ آٹھویں صدی ہجری کے کسی حصہ میں دیوبند میں سکونت پذیر ہوئے۔ محلہ محل میں ان کا مزار ہے۔[(۳)]

یہی شیخ ابو الوفاء عثمانی ہیں جن کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے بہت برکت دی۔ دیوبند کے تقریباً تمام ہی عثمانی شیوخ ان کی اولاد میں ہیں۔[(۴)]

شیخ ابو الوفاء عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل میں دسویں پشت پر ایک صاحب لطف اللہ نامی پیدا ہوئے، جنہوں نے عہد شاہجہانی میں منصبِ دیوانی (خزانچی) کے عہدہ پر فائز ہونے کے باعث عزت و شہرت بھی پائی اور اپنے کارناموں کے باعث نیک نامی اور جاہ و حشمت بھی، ان کے تمول کی شہادت دیوبند کا محلہ دیوان ہے جس کا سر بفلک دروازہ شکستگی کے باوجود آج بھی بڑی عظمت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔[(۵)]

دیوان لطف اللہ کے خاندان نے جو شہرت و عظمت پائی اسمیں ان کی جود و سخا، علم پروری و علم پسندی کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نیک نامی ان کے مقدر میں لکھی تھی اسی وجہ سے دار العلوم، دیوبند ان کے ورثاء کی عطا کردہ زمین پر بنا، اور تو اور دار العلوم، دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسی گھر کی مرہونِ منت ہے۔[(۶)] دیوان

---

(۱) تاریخ دار العلوم، دیوبند/ ج:۱/ص:۱۳۱۔

(۲) تاریخ دیوبند/ سید محبوب رضوی/ ادارۂ تاریخ دیوبند؛ ۱۹۵۲ء/ص:۲۷۔

(۳) ایضاً/ص:۲۸۔

(۴) وضاحت کے لئے دیکھئے، ایضاً/ص:۲۹۔

(۵) ایضاً/ص:۴۸۔

(۶) سوانح قاسمی/ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ/ مکتبہ دار العلوم، دیوبند ۱۳۷۳ھ/ ج:۱/ص:۱۸۶۔

لطف اللہ کی اولاد میں شیخ کرامت حسین نامی ایک شخصیت گذری ہے جنہیں تعلیم سے دل چسپی تھی، اسی دل چسپی کے باعث انہوں نے اپنے گھر میں ایک مکتب قائم کر رکھا تھا، جس میں مولوی مہتاب علی صاحب (شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے تایا) مدرس تھے۔ جب مولانا نانوتوی مختلف وجوہات کی بنا پر نانوتہ چھوڑ کر اپنی نانیہال دیوبند تشریف لائے تو اسی مکتب میں جو شیخ کرامت حسین کے گھر پر قائم تھا، مولوی مہتاب علی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا[1] دارالعلوم، دیوبند کے قیام کے وقت تک یہ مکتب کامیابی کے ساتھ چلتا رہا[2] اسی مکتب میں شیخ کرامت حسین کے صاحبزادے شیخ نہال احمد صاحب (دارالعلوم، دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اولین ممبروں میں سے ایک (۱۲۸۳ تا ۱۳۰۴ھ)[3] بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انہیں کی بہن یعنی شیخ کرامت حسین صاحب کی صاحبزادی سے مولانا قاسم نانوتویؒ کا نکاح ہوا۔[4]

شیخ نہال احمد بھی اسی خانوادہ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ دیوبند کے متمول اور صاحب حیثیت افراد میں شمار کئے جاتے تھے، مہمان نوازی کا یہ عالم تھا بہت سی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ اس طرف سے گذرنے والی بارات کو اپنے یہاں ٹھہرا لیتے اور پوری بارات کی دعوت کر دیتے[5] علم وفضل کا عالم یہ تھا کہ ۱۳۰۱ھ میں دارالعلوم، دیوبند کے دستار بندی کے اجلاس میں مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، صدر مدرس دارالعلوم، دیوبند، اور مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم دارالعلوم، دیوبند جیسی باوقار و باکمال شخصیات کو انہوں نے دوشالہ پیش فرمایا جو اپنی نوعیت کا پہلا ہدیہ تھا۔[6]

شیخ نہال احمد صاحب کے صاحبزادے شیخ لطیف احمد صاحب بھی اپنی گوناگوں علمی دل چسپیوں اور جدید افکار ونظریات قبول کرنے کے باعث مشہور معروف رہے، شیخ لطیف احمد صاحب کی شادی مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حقیقی ہمشیرہ سے ہوئی تھی، اس وقت جب کہ انگریزی زبان وادب یا انگریزی تہذیب وثقافت کا نام لینا دشنام طرازی کے مترادف تھا، یہ انگریزی تعلیم کے حامی تھے انگریزی زبان سے دل چسپی کے باعث انہوں نے وطنِ عزیز دیوبند کو خیر باد کہہ کر آگرہ میں سکونت اختیار کر لی اور وہاں ایک مشنری اسکول میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ مشنری اسکول کی ملازمت نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا اور ان کے وہ مخالفین جو انہیں انگریزی علوم کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے نفرت وحقارت سے دیکھتے تھے، انہیں اسلام مخالف ہی نہیں بلکہ

---

(۱) سوانح قاسمی : ج ۱ : ص ۱۸۷

(۲) تاریخ دیوبند/ص:۶۷۔

(۳) اگرچہ ان کی تاریخ وفات کا کوئی صحیح علم نہیں ہے لیکن چونکہ یہ دارالعلوم، دیوبند کی اولین شوریٰ کے ممبروں میں سے تھے اور ان کی ممبری ۱۳۰۴ھ تک رہی اس بنا پر غالب گمان یہی ہے کہ انتقال کے باعث ان کی ممری کی جگہ خالی ہوئی۔ ماخوذ از: دارالعلوم، دیوبند کی صد سالہ زندگی/مولانا محمد طیب/دفتر اہتمام، دارالعلوم، دیوبند/طبع اول: جون ۶۵ء/ص:۲۰۱۔

(۴) سوانح قاسمی/ج:۱/ص:۵۰۱۔

(۵) مسلمانوں کا شاندار ماضی/مولانا محمد میاں/مکتبہ الجمعیۃ، دہلی/ج:۵/ص:۵۹۔

(۶) تذکرۃ الرشید/مولانا عاشق الٰہی/اشاعت العلوم، سہارنپور ۱۹۷۷ء/ج:۱/ص:۲۴۹۔

العیاذ باللہ مرتد تصور کرنے لگے۔ دیوبند میں ان کے عیسائی مذہب قبول کرنے کی شہرت عام ہوگئی، لیکن واقعۃً ایسا نہیں تھا، وہ پابندِ شرع، صوم وصلوٰۃ وتہجد کے پابند اور پکے سچے مسلمان تھے، ان کا انتقال آگرہ میں ہی ہوا اور وہیں پر تدفین بھی ہوئی۔ (۱)

اس طریقہ پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دیوبند کے شیوخ عثمانی کے خاندان کے اس حصہ کو عرصۂ دراز سے شہرت ومقبولیت حاصل تھی، دیوان لطف اللہ جو محلّہ دیوان کے جد امجد ہیں اپنے عہدۂ ومنصب کی بنا پر مقبول ومعروف رہے تو شیخ کرامت حسن اپنی علم دوستی وعلم نوازی کے سبب مشہور زمانہ ہوئے۔ شیخ نہال احمد صاحب اپنی جود وسخا کے لحاظ سے بھی ممتاز رہے اور دار العلوم کی ابتدائی شوری کی رکنیت کی وجہ سے بھی اور اس وجہ سے بھی علمی دنیا ان کا احسان نہیں بھلا سکتی کہ ''دار العلوم، دیوبند والی زمین شیخ نہال احمد عثمانی ہی کی عطا کردہ ہے'' (۲) اور شیخ لطیف احمد اپنی آزادیٔ فکر اور وسیع النظری کے باعث ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

شیخ لطیف مرحوم کے صاحبزادوں میں مولانا سعید احمد عثمانی صاحب اور مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی نے علم وفضل میں اپنا نام روشن کیا اور تقوی وطہارت اور تحریر وتقریر کی وجہ سے مشہور ومقبول ہوئے۔ مولانا سعید احمد عثمانیؒ ۱۳۰۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے اور نہایت کم عمری میں یعنی صرف ۲۵ سال کی عمر میں ۱۳۳۰ھ میں بمرضِ طاعون انتقال فرما گئے (۳) ان کو دیکھنے اور سننے والوں کا ماننا ہے کہ اگر یہ زندہ ہوتے تو علوم ومعارف میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ثانی ہوتے۔ ان کے انتقال پر مولانا تھانویؒ بھی غمزدہ ورنجیدہ ہوئے۔ (۴)

مولانا ظفر احمد کی پیدائش

شیخ لطیف احمد صاحب کے دوسرے صاحبزادے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھے، ان کی پیدائش مؤرخہ ۱۳/ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ مطابق ۵/ اکتوبر ۱۸۹۲ء (۵) کو دیوبند کے محلّہ دیوان کے مذکورہ بالا مکان میں ہوئی، ان کا نام ظفر احمد تجویز ہوا، ایک نام ظریف احمد اور تاریخی نام مرغوب نبی بھی رکھا گیا، جس سے سن پیدائش ۱۳۱۰ھ کی تخریج ہوتی ہے (۶) مولانا ظفر

---

(۱) شیخ لطیف احمد صاحب کے تفصیلی حالات وواقعات وسنین پیدائش ووفات باضابطہ کہیں نہیں ملتے۔ ان کے ارتداد کے متعلق بھی زبانی ہی روایتیں ہیں۔ مجھے ان کے حالات کی جان کاری کے لئے انکی حقیقی بھانجی کے صاحبزادے شیخ نثار احمد صاحب (کاتب) سے رجوع کرنا پڑا جو دیوبند کے محلہ دیوان کے اسی گھر میں رہتے ہیں جو مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا جدی مکان ہے۔ شیخ نثار احمد صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی والدہ حلفیہ طور پر ان کے ارتداد کا انکار کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ وہ تہجد کے اور نماز روزے کے پابند تھے۔ انگریزی تعلیم ضروری سمجھتے تھے، لیکن کسی پر اپنے نظریات کو تھوپتے نہیں تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی اولاد پر بھی اس سلسلہ میں کوئی زور زبردستی نہیں کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دونوں صاحبزادے مولانا سعید احمد عثمانی اور مولانا ظفرِ احمد عثمانی علم دین وعربی زبان وادب کی تحصیل میں مشغول رہے اور مشہور علماء دین ہوئے۔

(۲) کاروانِ تھانوی/ محمد اکبر تھانوی/ ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۷ء/ ص:۵۸۔

(۳) ایضاً/ ص:۲۴۷۔

(۴) تذکرۃ الظفر/ مولانا عبد الشکور ترمذی صاحب/ مطبوعات علمی کمالیہ، پاکستان، ۱۹۷۷ء/ ص:۵۵۔

(۵) عیسوی تاریخ پیدائش کہیں درج نہیں ہے، لیکن ۱۳/ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو تقویم کے مطابق ۵/ اکتوبر ۱۸۹۲ء ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے: تقویم ہجری و عیسوی/ مرتبین: ابو النصر محمد خامدی، مولوی محمود خاں، زیڈ، اے، ڈیسائی/ انجمن ترقی اردو، دہلی۔

(۶) تذکرۃ الظفر/ ص:۵۳۔

احمد صاحب عثمانی النسل خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب سے خواجہ ابوالوفاء تک کا شجرہ حسب ذیل ہے:

ظفر احمد بن لطیف احمد بن نہال احمد بن کرامت حسین بن نبی بخش بن حیات اللہ بن عنایت اللہ بن لقاء اللہ بن احسان اللہ بن نصیر اللہ بن دیوان لطف اللہ بن خواجہ اویس بن مولانا احمد بن مولانا عبدالرزاق بن مولانا محمد حسن بن خواجہ حبیب اللہ بن خواجہ عثمان بن علی بن قاضی شیخ محمد بن قاضی فضل اللہ بن خواجہ شیخ ابوالوفاء رحمہم اللہ۔[1]

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مولانا ظفر صاحب کے والد شیخ لطیف احمد کی شادی تھانہ بھون میں شیخ عبدالحق صاحب کی صاحبزادی (مولانا اشرف علی تھانوی کی حقیقی ہمشیرہ) سے ہوئی تھی، اس طریقہ پر مولانا تھانویؒ مولانا ظفر احمد صاحب کے حقیقی ماموں تھے[2] ابھی مولانا اڑھائی سال کے ہی تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ جب آپ سات سال کے ہوئے تو آپ کو مکتب میں قرآن مجید پڑھنے کے لئے بٹھا دیا گیا۔ آپ نے دار العلوم، دیوبند میں حافظ نامدار صاحب سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا[3] ناظرہ قرآن مجید مکمل کرنے کے بعد آپ کو درالعلوم دیوبند میں داخل کر دیا گیا، جہاں آپ نے فارسی کی ابتدائی کتابیں مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ کے والد مولانا محمد یاسین صاحب دیوبندی سے پڑھیں۔ (مولانا محمد یاسین صاحبؒ بذات خود دار العلوم، دیوبند کے قرن اول کے طالبعلم اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے براہ راست شاگرد تھے۔ مولانا یاسین صاحب کی وفات ۹ رصفر ۱۳۵۵ھ کو دیوبند میں ہوئی)۔[4]

---

(۱) فقہ القرآن/عمر احمد عثمانی/ادارۂ فکر اسلامی، کراچی، ۱۹۷۷ء/ص:۲۶۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ص:۵۳۔

(۳) ایضاً/ص:۵۹۔

(۴) چند عظیم شخصیات/مفتی محمد شفیع عثمانی/کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، ۱۴۱۷ھ - ۱۹۹۷ء/ص:۳۸۔

دوسری فصل: تعلیم وتربیت

مولانا کے والد شیخ لطیف احمد چونکہ انگریزی زبان کو پسند کرتے تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ مولانا ظفر صاحب انگریزی وعصری علوم کی تحصیل میں مصروف رہیں، لیکن مولانا کو انگریزی زبان سے طبعی تنفر تھا اور حد یہ تھی کہ انگریزی کی جو کتاب بھی پڑھتے اسے پڑھتے ہی جلا دیا کرتے تھے جب اس بات کا علم والد صاحب کو ہوا تو انہوں نے اس کی وجہ دریافت کی، مولانا نے جواب دیا کہ مجھے اس زبان سے نفرت ہے، اسی کے ساتھ آپ نے اپنے عالم بننے کی خواہش ظاہر کی جسے ان کے والد صاحب نے منظور فرمالیا اور آپ کو تحصیل علم کی خاطر دیوبند بھیج دیا، جہاں سے آپ اپنے ماموں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان کے حکم پر وہیں تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر صرف بارہ سال تھی۔[۱]

تھانہ بھون، دیوبند سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر جانب شمال واقع ہے۔ قدیم زمانہ سے علمی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ صاحب کشاف العلوم قاضی عبد الاعلی مولانا شیخ محمد تھانوی کی بدولت شہرت کے آسمان پر پہونچا ہوا ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حافظ ضامن شہید جیسی زندۂ وجاوید ہستیاں سرزمینِ تھانہ بھون مسلمانوں کو عطا کر چکی تھی۔ اخیر زمانہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو تھانہ بھون کو اسلامی مرکزوں میں سے ایک مستقل مرکز بنادیا تھا[۲] اسی قصبہ میں اسی جلیل القدر شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت میں مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی جو ابتداءً صرف حصول علم کی خاطر تھانہ بھون تشریف لائے تھے اسی سرزمین کے ہو رہے، اور مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی کہلائے جانے لگے۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے ماموں، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے مصلح امت تھے، اصلاح امت کے لئے ان کی کوششیں انتہائی بارآور ثابت ہوئیں، دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۳۰۱ھ میں مدرسہ جامع العلوم، کانپور میں درس وتدریس سے منسلک ہو گئے[۳] حضرت تھانویؒ نے تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، علم کلام، علم تجوید وغیرہ سبھی شعبہ ہائے علوم فنون میں تقریباً سات سو یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔[۴] مولانا ظفر صاحب نے ایسے جلیل القدر وعظیم المرتبت شخصیت کے زیرِ سایہ تعلیم وتربیت حاصل کی، خود مولانا تھانویؒ سے آپ نے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ خود تحریر فرماتے ہیں کہ: ''میں نے جب کہ میری عمر ۱۲-۱۳ سال تھی مولانا اشرف علیؒ سے قرأت وتجوید کی کتاب اپنے بڑے بھائی مولوی سعید احمد کے ساتھ ''تنشیط الطبع''

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۶۱۔

(۲) سوانح قاسمی/مولانا مناظر احسن گیلانی/ج:۱/ص:۴۹ کا حاشیہ۔

(۳) ایضاً/ج:۱/ص:۶۸۔

(۴) ایضاً/ج:۳/ص:۸۱۔

سبقاً سبقاً پڑھی، مولوی عبد اللہ گنگوہی صاحبؒ کے ساتھ حضرت تھانویؒ سے مثنوی رومی پڑھی، علاوہ ازیں ''تلخیصات العشر'' بھی مولانا تھانویؒ سے ہی پڑھی''۔[۱]

مولانا اشرف علی تھانوی کے ادارہ کا نام ''خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون'' تھا وہیں پر مولانا ظفر صاحب کی ابتدائی عربی کی تعلیم ہوئی، مولانا عبد اللہ صاحب گنگوہیؒ سے آپ نے ابتدائی کتابیں پڑھیں، مولانا عبد اللہ صاحب کا طریقہ تعلیم اتنا عمدہ تھا کہ ابتداء میں ہی استعداد کامل ہو جاتی تھی، چنانچہ جب مولانا ظفر صاحب عربی کی ابتدائی کتاب نحو میر پڑھ رہے تھے تو آپ کے اندراتنی استعداد پیدا ہو چکی تھی کہ آپ بلا تکلف اشعار موزوں کر لیتے تھے، چنانچہ آپ کا اسی وقت کا یہ شعر کافی مشہور ہے جو آپ نے اپنے کسی دوست کو خود ساختہ لکھا تھا:

انـــا مـــا رأيتك مـــن زمـــن ☆ فـــازدادنـــي قـــلبـــي الشـــجـــن[۲]

ترجمۂ قرآن پاک آپ نے مدرسہ امدادیہ میں ہی مولانا شاہ لطف رسول صاحب سے پڑھا، عربی ادب کا رسالہ ''الطریف للادیب الظریف'' پڑھا، ۱۳۲۳ھ میں جب مولانا اشرف علی صاحبؒ تفسیر بیان القرآن لکھنا شروع کر رہے تھے تو مولانا ظفر احمد صاحب کو وہ ازخود اپنے ساتھ کانپور لے گئے، تاکہ یہاں پر وہ تصنیف کا سلسلہ اطمینان وسکون کے ساتھ کر سکیں اور مولانا ظفر صاحب کا علمی سفر بھی جاری رہے، یہاں مدرسہ جامع العلوم میں داخلہ کرا دیا، آپ نے یہاں مشکوٰۃ، جلالین اور ہدایہ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ چونکہ آپ کو عربی ادب سے شروع ہی سے رغبت تھی اس لئے آپ نے اسی سال ''سبعہ معلقہ'' بھی شروع کر دی جو کہ نصاب میں اگلی جماعت میں داخل تھی[۳] کانپور میں آپ کے خصوصی استاد مولانا محمد اسحٰق صاحب بردوانی تھے جو مولانا اشرف علی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، اور اپنے وقت کے متبحر عالمِ دین تھے۔ مولانا ظفر صاحب نے مولانا اسحاق صاحب سے صحاحِ ستہ مع مؤطا امام مالکؒ سبقاً سبقاً پڑھیں، بعض ناگزیر وجوہات کی بناپر مولانا اسحاق صاحب کانپور سے استعفا دے کر مدرسہ عالیہ کلکتہ تشریف لے گئے تو آپ نے مشہور محدث مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی منشا کے مطابق مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں دورۂ حدیث میں داخلہ لے لیا۔ یہ واقعہ محرم الحرام ۱۳۲۷ھ کا ہے[۴] یہاں آپ نے کتب حدیث، بخاری، شمائل ترمذی، کے علاوہ میر زاہد، امور عامہ، شرح چغمینی، شمس بازغہ، صدرا، قاضی مبارک، میر زاہد ملا جلال، حمد اللہ وغیرہ جیسی علوم وفنون کی کتابیں بھی پڑھیں۔[۵]

---

(۱) اشرف السوانح/خواجہ عزیز حسن مجذوب/مطبوعہ: لاہور ۱۳۷۸ھ/ج:۱،ص:۳۴۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ص:۶۲۔

(۳) ایضاً/ص:۶۵۔

(۴) علمائے مظاہر علوم، سہارنپور اور ان کی تصنیفی وتالیفی خدمات/سید محمد شاہد/اشاعت العلوم، سہارنپور، ۱۴۰۳ھ - ۱۹۸۳ء/ج:۲،ص:۱۵۸۔

(۵) ایضاً/ج:۲،ص:۱۵۸۔

تدریس سے وابستگی

دورانِ تعلیم آپ کی کارگردگی نہایت عمدہ رہی، مدرسہ مظاہرعلوم، سہارنپور کی روداد کے مطابق آپ نے سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔[۱] ۱۳۲۸ھ میں فراغت کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو حج کی دولت سے مالا مال کیا، اس سال مدرسہ مظاہرعلوم کے اساتذہ کی اکثریت حج کے لئے گئی تھی، آپ بھی ان کے ہمراہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔[۲] ۱۳۲۹ھ کی ابتدا میں آپ حج مبارک سے واپس تشریف لائے تو آپ مدرسہ مظاہرعلوم میں استاد بنادیے گئے، جہاں آپ نے اپنے علمی جواہر وقابلت اور فطری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ابتدا میں آپ کو شرح وقایہ، نورالانوار، سبعہ معلقہ، دیوانِ متنبّی ملی تھیں، جب اساتذۂ کرام نے آپ کی صلاحیتوں کو آزمالیا تو آپ کو ہدایہ، مشکوٰۃ شریف، میبذی، شرحِ عقائد مع حاشیہ خیالی وغیرہ پڑھانے کو ملیں،[۳] جنہیں آپ نے بحسن وخوبی پڑھایا۔

مظاہرعلوم، سہارنپور کے زمانۂ قیام میں آپ کے مشہور ترین شاگردوں میں ہندوستان کے مستقبل کے جید ترین علماءِ کرام مولانا بدر عالم میرٹھی صاحب، مولانا ادریس کاندھلویؒ، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کاملپوری، مولانا محمد اسعد اللہ صاحب، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہم جیسے بلند پایہ اصحاب نے شرفِ تلمذ حاصل کیا[۴] (مشہور شامی محدث وفقیہ اور نامور عالم ومحقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کو بھی مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب کا شاگرد ہونے کا فخر حاصل ہے، انہوں نے ۱۳۸۲ھ میں باقاعدہ سفر کر کے علامہ عثمانی سے تحریری اور زبانی اجازت حدیث لی، پھر ان کے گلشنِ علمی کو سجایا اور مولانا ظفر صاحب کی مشہور تالیف اعلاء السنن کے مقدمہ کو اپنی تعلیقات کے ساتھ اپنے موضوع پر ایک اچھوتی اور بے مثال کتاب ''قواعد فی علوم الحدیث'' کے نام سے پیش کی۔[۵]

۱۳۳۶ھ میں آپ بیمار ہوئے تو اطباء نے آپ کو آب وہوا کی تبدیلی کی غرض سے سہارنپور شہر چھوڑ کر دیہات منتقل ہونے کا مشورہ دیا، چنانچہ آپ تھانہ بھون کے قریب ایک دیہات گڑھی پختہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے مدرسہ ارشاد العلوم میں اپنا علمی سفر جاری رکھا اور تشنگانِ علوم کو سیراب کیا۔[۶] یہاں پر آپ نے ۱۳۳۸ھ تک دوسری کتابوں کے علاوہ بخاری شریف اور مسلم شریف کا بھی درس دیا۔ ۱۳۳۸ھ میں آپ دوسرے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حج سے واپسی کے

---

(۱) روداد مدرسہ مظاہرعلوم، سہارنپور ۱۳۲۸ھ - ۱۹۱۱ء/ مطبع قاسمی/ مدرسہ اسلامی عربی، دیوبند، ناشر: مظاہرعلوم سہارنپور/ ص: ۱۴۰۔

(۲) علمائے مظاہرعلوم اور ..../ ج:۲، ص: ۱۵۸۔

(۳) تاریخ مظاہرعلوم، سہارنپور/ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا/ مطبوعہ سہارنپور / ص: ۲۴۷۔

(۴) علمائے مظاہر/ ج:۲، ص: ۱۵۸۔

(۵) شیخ ابوالفتاح ابوغدۃ/ بدرالحسن القاسمی کا مضمون/ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم، دیوبند؛ جلد: ۴، شمارہ: ۱۲ر مئی ۹۷ء/ ص: ۴۰۔

(۶) علمائے مظاہر/ ج:۲، ص: ۱۵۹۔

بعد ۱۳۳۹ھ میں آپ کا مستقل قیام تھانہ بھون کی خانقاہ امدادیہ میں ہو گیا اور آپ مدرسہ امداد العلوم، تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے، جہاں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے علاوہ فتویٰ نویسی کا کام بھی مولانا کے سپرد ہوا۔ مولانا ان تمام شعبوں میں بھی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زیرِ نگرانی علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ مدرسہ امداد العلوم میں آپ نے بیضاوی شریف اور دورۂ حدیث کی کتابوں کا درس دیا اور تمام علوم فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ دور علمی اعتبار سے زریں دور ہے، کیونکہ آپ کی علمی و ادبی تالیفات و تصنیفات زیادہ تر اسی زمانہ میں ہوئیں۔ (۱)

مولانا ظفر صاحب کے شیخِ طریقت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری کے انتقال (۱۳۴۶ھ) کے بعد مولانا کو جو دلی صدمہ پہونچا اس کا علاج اطباء نے یہ تجویز کیا کہ آپ کو کچھ دن کے لئے کسی ساحلی مقام پر بھیج دیا جائے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں برما کے شہر رنگون سے مولانا تھانویؒ کے پاس خط آیا کہ مدرسہ راندیریہ کے لئے کسی ناظم کا انتخاب کر دیجئے۔ اس طرح آپ رنگون پہونچ گئے جہاں آپ ڈھائی سال تک رہے۔ ۱۳۴۹ھ میں پھر تھانہ بھون واپس پہونچ گئے اور درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی کے شعبوں میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اور یہ سلسلہ ۱۳۵۸ھ تک جاری رہا۔ (۲) اس درمیان آپ کو ۱۳۴۸ھ میں تیسرے حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ (۳)

۱۳۵۸ھ میں آپ کے احباب نے آپ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بلانے کی تحریک چلائی۔ احباب کے اصرار اور اپنے مربی و سرپرست مولانا تھانویؒ کے حکم سے آپ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ میں تھانہ بھون سے ڈھاکہ پہونچ کر ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے اور یہاں بخاری شریف، مسلم شریف، کتاب التوحید اور ہدایہ وغیرہ جیسی اہم کتابوں کا درس دینے لگے۔ لیکن یونیورسٹی کا ماحول مولانا مرحوم کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اس لئے وہ یہاں اپنے علمی ذوق کو مطمئن نہ کر سکے۔ اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ خارج اوقات میں مدرسہ اشرف العلوم، ڈھاکہ (جو آپ کی ہی سرپرستی میں آپ کے احباب نے قائم کیا تھا) سے وابستہ ہو گئے، جہاں آپ بلا معاوضہ علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہاں کے آپ کے مشہور تلامذہ میں ڈاکٹر شہید اللہ مرحوم، ڈاکٹر سراج الحق صاحب اور پروفیسر جیلانی صاحب وغیرہ ہیں۔ (۴)

اس کے بعد آپ نے لال باغ، ڈھاکہ کی شاہی مسجد میں جامعہ قرآنیہ کی سرپرستی فرمائی اور یہاں سے تدریسی تعلق باقاعدہ قائم رکھا۔ آپ اس عظیم دینی درسگاہ سے کم و بیش دس پندرہ سال تک وابستہ رہے اور بخاری شریف کا درس پابندی سے دیتے رہے۔ حالانکہ ڈھاکہ کے سیاسی حالات سے دل برداشتہ ہو کر آپ، ڈھاکہ کو خیر باد کہہ کر مغربی پاکستان منتقل ہو گئے

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۱۴۱۔

(۲) ایضاً/ص:۱۴۱۔

(۳) ایضاً/ص:۷۵۔

(۴) تذکرۃ الظفر/ص:۲۲۱۔

تھے، لیکن اس مدرسہ سے آپ کا تعلق بدستور اس طرح رہا کہ آپ شعبان میں ڈھاکہ تشریف لے جاتے اور اس مدرسہ میں مکمل رمضان قیام فرماتے اور پھر شوال میں مغربی پاکستان تشریف لے آتے۔ اس طریقہ پر بخاری شریف کی ابتداء (شوال میں) اور اختتام (شعبان میں) آپ ہی کے ذریعہ انجام پاتا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی سے اگرچہ آپ کا تعلق رسمی ہی سا تھا تاہم ۱۹۴۸ء میں آپ نے اس سے یہ رسمی تعلق بھی منقطع کرلیا اور مدرسہ عالیہ (جو تقسیم ہند کے بعد کلکتہ سے منتقل ہوکر ڈھاکہ آ گیا تھا) سے اپنی علمی خدمات کا سلسلہ جوڑلیا۔ یہاں آپ صدر مدرس کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور بخاری شریف، الاشباہ والنظائر اور اصول بزوری کے اسباق بھی دیتے رہے۔ اس درسگاہ سے آپ کا تعلق ۱۹۵۴ء تک رہا، اس کے بعد آپ نے سیاسی حالات سے متنفر ہوکر مشرقی پاکستان کو خیر باد کہکر مغربی پاکستان کو اپنا مستقر بنالیا اور اخیر عمر تک دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہیار سے وابستہ رہتے ہوئے علمی وادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ اور شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز رہ کر مسلسل بیس سال تک قرآن وحدیث کی خدمت اور علوم قرآن وحدیث کی تعلیم و نشر واشاعت میں مصروف رہے، اور پاکستان کے اس غیر معروف سے قصبہ میں گمنامی کی زندگی گذارتے رہے۔ ۸؍دسمبر ۱۹۷۴ء (۲۲؍ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) بروز اتوار بوقت صبح کراچی شہر میں داعئ اجل کو لبیک کہا[۱] اور پاپوش نگر، ناظم آباد میں مدفون ہوئے۔[۲]

آپ کے انتقال سے صرف برصغیر کے علمی و دینی حلقوں میں ہی نہیں بلکہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے سیاسی حلقوں میں بھی صفِ ماتم بچھ گئی، کیونکہ آپ نے سیاسی طور پر پاکستان بننے، مسلم لیگ کو تقویت دینے، سلہٹ ریفرینڈم، اور قائداعظم محمد علی جناح کے حکم پر مشرقی پاکستان میں آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر سرکاری سطح پر پاکستان کا پرچم لہرانے کی رسم انجام دی تھی، جس کا تفصیلی تذکرہ مولانا کی سیاسی زندگی کے ضمن میں آئے گا انشاء اللہ۔

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص: ۴۴۸۔

(۲) ایضاً/۴۵۰۔

تیسری فصل: عائلی زندگی

آپ کی پہلی شادی ۳۰ر ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ کو پیر جی ظفر احمد صاحب (مقیم تھانہ بھون) کی بڑی صاحبزادی کیساتھ ہوئی تھی، انہیں کی ایک صاحب زادی مولانا اشرف علی تھانویؒ کی دوسری اہلیہ تھیں۔ اس طریقہ پر آپ اپنے ماموں کے ہم زلف بھی ہوئے۔ ان سے مولانا مرحوم کے دو صاحبزادے مولانا عمر احمد عثمانی اور مولانا قمر احمد عثمانی اور تین صاحبزادیاں ہوئیں۔ دونوں صاحب زادے بڑے ذہین، ذی استعداد، صاحبِ تصنیف وتالیف اور دینی ودنیاوی علوم کے حامل ہوئے۔

مولانا ظفر احمد صاحب کی پہلی اہلیہ اکتالیس سال مولانا کی رفاقت میں رہنے کے بعد ۱۳ر محرم ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۰ء کو انتقال کر گئیں۔ مولانا کی طبیعت پر ان کے انتقال سے بہت اثر ہوا، جس کا اظہار آپ نے ایک عربی مرثیہ میں اس طرح کیا:

اف لفرقة مونسي و أنيسي ☆ بدر البدور نعم و شمس شموس

اس وقت مرثیہ کا تذکرہ مقصود نہیں، وہ تو انشاءاللہ مولانا مرحوم کی ادبی خدمات کے ضمن میں آئے گا۔ بہر حال مولانا نے، پہلی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح کیا لیکن وہ بھی زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکیں کچھ ہی عرصہ میں ان کا انتقال ہوگیا اور ان سے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔ تیسرا نکاح مولانا حکیم محمد مصطفے بجنوریؒ کی بیوہ صاحب زادی سے ہوا، ان سے ایک صاحبزادے مولانا محمد مرتضی صاحب ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت دار العلوم ٹنڈو الہیار میں اپنے والدِ مرحوم کے زیرِ سایہ ہوئی۔ قیام بنگال کے زمانہ میں مولانا مرحوم کا چوتھا نکاح ضلع اعظم گڑھ کی رہنے والی ایک مسماۃ سے ہوا جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔[1]

علمی حیثیت

مولانا اشرف علی تھانویؒ کو مولانا ظفر احمد عثمانی کے علم وفضل پر زبردست اعتماد تھا، چنانچہ اہم ترین مسائل پر وہ آپ سے ہی لکھواتے۔ یہی وجہ ہے کہ احکام القرآن، اعلاء السنن، امداد الفتاوی جیسی قرآن وحدیث وفقہ پر نہایت ضخیم وعظیم کتب سے امتِ مسلمہ مستفیض ہوئی۔ علمی حلقہ نے ان کاوشوں کو ہمیشہ خراجِ عقیدت پیش کیا، علمی تصنیفات نے ہندوستان کے مشہور علماء ومحققین کو مولانا تھانویؒ کی عقیدت سے منسلک کر دیا۔ چنانچہ مشہور محقق علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ جو مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت بھی ہوئے، ان کے مولانا تھانویؒ کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بھی مولانا ظفر صاحب ہی

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص: ۱۳۷-۱۳۸۔

بنے۔ ہوا یہ کہ حیدر آباد کے مفتی عبداللطیف صاحب نے سود اور قرض کے تعلق سے ایک رسالہ شائع کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ربا (سود) صرف بیع وشراء ہی میں محقق ہوتا ہے، قرض کی صورت میں نہیں۔ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ جس سے عام مسلمانوں کے گمراہی میں مبتلا ہونے کا خوف تھا، اس لئے مولانا تھانویؒ نے مولانا ظفر صاحب سے اس کا جواب لکھنے اور اس پر معاصر علماء کی تائید لینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحب نے اس کا جواب ''کشف الدجی عن وجہ الربوا'' نام سے لکھا اور اس کا ایک نسخہ سید صاحب کی خدمت میں بھی تصدیق کے لئے بھیجا، مولانا تھانویؒ سے سید سلیمان صاحب کے تعلق کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ پھر یہ تعلق اس حد تک بڑھا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ مولانا تھانویؒ کے حلقۂ ارادت وبیعت میں شامل ہو گئے اور خلافت سے سرفراز ہوئے،[۱] سید صاحب مولانا ظفر صاحب کی علمی تحقیقات کو بڑی پسندیدگی اور توصیفی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جب کبھی ان کا کوئی مقالہ یا منظوم کلام معارف میں چھپنے کے لئے جاتا تو اسی پر خصوصی نوٹ لگاتے جس میں ان کے ذوقِ ادب اور قدرتِ کلام کی تعریف فرماتے۔[۲]

مولانا ظفر احمد صاحب کے انتقال پر نہ صرف پاکستان بلکہ برصغیر کے علمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اگر ایک طرف اعلاء السنن جیسی ضخیم کتاب آپ کے تبحر فی الحدیث اور اندازِ تحقیق کی داد دے رہی تھی تو دوسری طرف آپ کی عربی ادب وشاعری سے مناسبت اور عربی شاعری پر بھرپور قدرت، ادب کے متوالوں سے خراجِ تحسین وصول کر رہی تھی، تیسری طرف آپ کی سیاسی زندگی تھی جس نے پاکستان بننے میں بہت بڑا رول ادا کیا تھا۔ آپ کی سیاسی زندگی ایک مستقل باب کا متقاضی ہے، اس لئے اس پر فی الحال روشنی ڈالنی مقصود نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ مصلح بھی تھے اور رہنما بھی، ادیب بھی تھے شاعر بھی اور عالمِ دین بھی تھے محقق بھی، اسی وجہ سے آپ کے انتقال پر مختلف مکاتب فکر نے اظہارِ افسوس کیا، ہزار ہا علمائے کرام نے ان کی علمی، ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا، سینکڑوں جرائد، اخبارات ورسائل میں ان کی جدائی پر اداریے تحریر کیے گئے، عربی، اردو، فارسی میں بہت سے مرثیے کہے گئے۔[۳]

مختصراً ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ واقعۃً مولانا ظفر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ علم وعمل، رشد وہدایت، شعر وادب خصوصاً عربی علوم پر یکساں قدرت رکھنے والے متبحر عالمِ دین تھے جن کی وفات کا غم حقیقی غم تھا۔ یہ ان کا بہت مختصر سوانحی خاکہ ہے، آگے قدرے تفصیلی گفتگو ان کے سیاسی افکار اور اس وقت کے ملکی، سیاسی حالات پر کی جائے گی، کیونکہ ان کی اس فکر نے پاکستان سازی

---

(۱) بزمِ اشرف کے چراغ / پروفیسر احمد سعید / مصباح اکیڈمی، لاہور، اگست ۱۹۹۲ء/ص: ۷۷ تا ۸۱۔

(۲) ملاحظہ ہوں معارف کے وہ شمارے جن میں مولانا کے مقالات وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔ مولانا نے اپنی اہلیہ کی وفات پر عربی میں جو مرثیہ کہا ہے وہ معارف میں شائع ہوا اور اس میں بھی خصوصی نوٹ درج ہے۔ دیکھئے: معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۵۱ء؛ جلد: ۶۷، شمارہ: ۴۔

(۳) تفصیلات تذکرۃ الظفر میں صفحہ ۴۵۶ تا ۵۲۸ دیکھی جاسکتی ہیں۔

میں اہم کردار ادا کیا تھا اور ان کی انہیں خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو محمد علی جناح نے جہاں مغربی پاکستان میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے پرچم کشائی کرائی وہیں مشرقی پاکستان میں اس قومی اعزاز کے لئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا انتخاب کیا اور آپ نے سورۂ فتح کی آیات کی تلاوت کرتے ہوئے ڈھاکہ میں ۱۴ راگست ۴۷ء کو پہلے پاکستانی پرچم کی رسمِ پرچم کشائی انجام دی۔

تیسرا باب

سیاسی زندگی ...... اسباب وعوامل

پہلی فصل

پس منظر

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو ایک سادہ لوح، سچے اور مخلص عالمِ دین تھے۔ درس وتدریس ان کا محبوب مشغلہ اور تصنیف وتالیف ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت مسلمانوں کی سچی خدمت اور تعلق مع اللہ کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی میدانِ سیاست میں صحیح راہ نمائی کی جائے تو انہوں نے وقتی تقاضوں کے تحت اس میدان میں قدم رکھا، اب یہ ان کے اخلاص اور مسلمانوں کے تئیں ان کی سچی محبت اور دلی تڑپ کا اثر تھا کہ ان کی آواز ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سنی گئی اور ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں کا جمِ غفیر ہو گیا۔ جس نے انہیں ان مقاصد میں کامیابی سے ہم کنار کرایا جن کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ تج دیا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مختصراً اس پسِ منظر کا جائزہ لیں جس کی وجہ سے ایک ایسے عالمِ دین کو سیاست کے گلیاروں میں داخل ہونا پڑا کہ جس نے کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا ہوگا۔

۱۷۰۷ء (عالم گیر کی وفات) کے بعد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے دور اندیش، صاحبِ فکر ونظر، صائب الرائے مسلم دانشور وعلمائے کرام مستقبل کے اس بھیانک منظر کا مشاہدہ تصوراتی آنکھوں سے کر رہے تھے کہ جب ان کا عزیز وطن ان کے لئے وطنِ غیر کی مانند ہو جانے کے خطرات سر پر منڈلانے لگیں گے۔ وہ اس روح فرسا منظر کو بھی بغور دیکھ رہے تھے کہ جب اس ملک پر سینکڑوں سال حکمرانی کرنے والے مسلمان محکوم و بے بس ہو جائیں گے، اور ان کی تہذیب و ثقافت اور مذہبی شناخت بھی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اگر چہ اس وقت یہ صرف خدشات تھے جو بظاہر کسی خطرہ کی علامت نہیں تھے لیکن ان کی دوررس نظروں کی سچائی آنے والے سو سالوں میں کافی حد تک سچ ثابت ہوگئی۔ انگریزوں کی دبے پیروں آمد نے ہندوستانی مسلمانوں اور مذہبِ اسلام کے سامنے اتنے مسائل کھڑے کر دیئے تھے کہ جن کا تصور بھی محال ہے۔ مسلمانوں کے لئے ان کے ہی ملک میں مشکلات کا انبار تھا۔ ایک طرف انگریز مسلمانوں کا تشخص اور وجود مٹانے کے درپے تھے تو دوسری طرف سکھ اور مرہٹے ان کے لئے ازلی دشمن ثابت ہو رہے تھے۔ ہر چہار طرف کے حملوں اور مسلمانوں کے اندرونی انتشار نے انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔

انگریزوں کے اس طرح ملک پر مسلط ہو جانے اور ہندوستانیوں کے ان کے دستِ نگر ہو جانے کا جو قلق اور افسوس

تمام محبِ وطن افراد کو تھا وہ تو اپنی جگہ۔ سب سے بڑا مسئلہ مسلمانوں کے سامنے ان کے اپنے تشخص کی حفاظت اور اپنے وجود کی بقاء کا تھا، کیونکہ عیسائیت نے ہندوستان میں اپنے دست و بازو پھیلانے شروع کر دیے تھے اور وہ اپنی راہ میں اسلام کو سب سے بڑا سدّ راہ تصور کرتی تھی، اسی لئے انگریزوں کی شروع سے یہ کوشش رہی کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لے لیا جائے، اور اسلام پر قدغن لگا دی جائے، تاکہ عیسائیت فروغ پا سکے۔ علماء دین وحق نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے انگریزوں سے فکری و عملی جنگ چھیڑ دی، اور شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ سے لے کر مولانا ظفر احمد عثانی تک ہر ایک نے انگریزوں کے خلاف جہاد اپنا مقصدِ حیات اور ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنا اپنا مشن بنالیا۔ اس کے لئے طویل ترین جنگیں بھی لڑنی پڑیں، جس کی وجہ سے مختلف تحریکیں وجود میں آئیں، انہیں تحریکوں کی بدولت آج ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں جو تحریکیں منظر عام پر آئیں ان میں ایک تحریک ''تحریک دیوبند'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ تحریک بظاہر تو ایک خاموش علمی تحریک تھی جو ایک مدرسہ کی چار دیواری اور چند نیک نفوس علماء اور کچھ مقدس و پاکیزہ روح طلباء پر مشتمل تھی، لیکن اس تحریک نے ہندوستان کو آزادی سے ہم کنار کرانے میں وہ کردار ادا کیا کہ جس کا اعتراف ہر مکتب فکر کو ہے۔

انگریزوں کے ظلم واستبداد کے مزاج اور قدیم اسلام دشمنی کے سبب تحریکِ دیوبند کے علماء کرام، ان کی آمد سے نہ صرف یہ کہ تشویش میں مبتلا تھے، بلکہ ان سے چھٹکارا پانے کی عملی تدابیر بھی انجام دے رہے تھے۔ دارالعلوم، دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتویؒ کا جہادِ شاملی میں بذاتِ خود حصہ لینا[۱] ان کے شاگرد مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کا ریشمی رومال تحریک چلانا[۲] مولانا عبید اللہ سندھی کا کابل میں جلاوطن حکومت قائم کرنا[۳] اور مولانا حسین احمد مدنی کے انڈین نیشنل کانگریس سے وابستہ ہونے کو[۴] انہیں تدابیر کا حصہ کہہ سکتے ہیں۔

اس نظریۂ آزادی کو علمائے دیوبند، صرف ایک مکتبِ فکر تک ہی محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ایسے متحدہ پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ جس میں مسلمانوں کے سبھی طبقوں کے علماء کی نمائندگی ہو اور آزادی کی مشترکہ جدوجہد ہو، چناں چہ اس کے نتیجہ میں ہی نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔[۵]

جمعیۃ علمائے ہند حصولِ آزادی کے سلسلہ میں کانگریسی نظریات سے قریب تر تھی۔ وہ اس مشن میں سبھی برادرانِ وطن

---

(۱) تاریخ دارالعلوم، دیوبند/ ج:۱، ص:۱۲۱۔

(۲) تحریک شیخ الہند/ مولانا محمد میاں/ الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۷۵ء/ ص:۶۵۔

(۳) ایضاً/ ص:۶۵۔

(۴) مولانا حسین احمد مدنی---- ایک سیاسی مطالعہ/ ابوسلمان شاہ جہاں پوری/ مجلس یادگار شیخ الاسلام، پاکستان ۱۹۹۳ء/ ص:۱۲۴۔

(۵) تحریک خلافت/ قاضی عدیل عباسی/ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۱۹۷۸ء/ ص:۲۲۔

کوساتھ لے کر پریقین رکھتی تھی۔ اگرچہ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ہندوستان کے آزادی پسند عوام کے اس طبقہ کے ذریعہ رکھی گئی تھی جو انگریز حکومت سے شہری مراعات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے روحِ رواں فادر ہیوم اور اس کے پہلے صدر ڈبلیو سی بنرجی تھے۔ اس کی بنیاد دسمبر ۱۸۸۵ء میں پڑی۔[۱]

انڈین نیشنل کانگریس سے جمعیۃ علمائے ہند کی قربت اور اس میں علمائے دیوبند کی شمولیت کو ملتِ اسلامیۂ ہند کا ایک طبقہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ نظریاتی طور پر کانگریس کو ہندونواز جماعت تصور کرتا تھا۔ یہ طبقہ دیوبند کی علمی تحریک کے متوازی چلنے والی علی گڑھ علمی تحریک سے وابستہ جوانوں کی اکثریت پر مشتمل تھا۔

علی گڑھ تحریک کے نواب وقار الملک کی سرکردگی میں ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن قائم ہوئی، جس کا اہم مقصد مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکنا تھا[۲] یہی تحریک آگے چل کر مسلم لیگ کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی، جس کا سنگِ بنیاد ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں رکھا گیا جس کے پہلے صدر آغا خان ہوئے[۳] مسلم لیگ خودمختاری حاصل کرنا چاہتی تھی، لیکن بایں طور کہ اس میں مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی حقوق کا تحفظ ہوسکتا ہو۔ جب کہ کانگریس مسلمانوں کے الگ حقوق کی بات کو فرقہ وارانہ اتحاد کے مخالف اور علیحدگی تصور کرتی تھی[۴] (یہ اختلاف ابتداء میں بہت چھوٹا تصور کیا جاتا تھا، لیکن آگے چل کر یہی سیلِ رواں کی شکل اختیار کر گیا)۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کی مختلف تنظیمیں جن میں سے بیشتر کی قیادت علماء کے ہاتھوں میں ہی رہی، وقتاً فوقتاً مختلف عوارض کی بنا پر وجود میں آتی رہیں، ان میں ثمرۃ التربیت (۱۸۷۸ء) جمعیۃ الانصار (۱۹۰۹ء) نظارۃ المعارف (۱۹۱۳ء) اور تحریک خلافت (۱۹۱۲ء) مشہور ہوئیں۔ مؤخر الذکر تنظیم نے مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو آزاد کرانے کے لئے ہندوستان سے تحریک چلائی۔

ان تمام تحریکات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں علماء کی ایک جماعت انگریزوں سے برسرِ پیکار رہی اور علماء کسی بھی طریقہ پر انگریزوں کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیں مولانا ظفر احمد عثمانی کی سیاسی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔

حقیقت یہی ہے کہ وہ رموزِ سیاست سے ناواقف، علمی موشگافیوں میں مصروف اور خانقاہی مزاج رکھنے والی گوشہ

---

(۱) مومن کانفرنس اور کانگریس پارٹی/امانت علی انصاری/مشمولہ مضمون ''کانگریس۔جشن صد سالہ'' مطبوعہ آل انڈیا مومن کانفرنس، دہلی ۱۹۸۵ء/ص:۱۳۔

(۲) تاریخ مسلم لیگ/مرزا اختر حسن/مکتبہ لیگ بمبئی، بدون تاریخ/ص:۳۴-۳۵۔

(۳) ایضاً/ص:۳۶۔ ''آغا خان جداگانہ حق رائے دہی کے زبردست حامی تھے، لیکن اس وقت تک محمد علی جناح اس نظریہ کے شدید مخالف تھے اور اسے قوم کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ جناح اس وقت دادابھائی نوروجی (صدر کانگریس) کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کررہے تھے اور کانگریس کا خطبۂ صدارت ۱۹۰۶ء انہیں کا تیار کردہ تھا، جس کے مطابق انہوں نے جداگانہ حق رائے دہی کی زبردست مخالفت کی تھی''۔ ماخوذ از ''جناح، بانیٔ پاکستان''/اسٹینلے ولبرٹ؛ اردو ترجمہ: تنویر انجم/آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۹۹۸ء/ص:۲۸۔

(۴) کانگریس اور اقلیتیں/ایم، ایم، زیدی/انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اپلائیڈ پولیٹیکل ریسرچ، نئی دہلی ۱۹۸۴ء/ص:۳۴۔

نشین شخصیت کے مالک تھے۔لیکن جب انہوں نے حالات کا مطالعہ کیا اور پانی کو سر سے اونچا ہوتا ہوا دیکھا تو انہوں نے اپنے لئے ضروری سمجھا کہ وہ مسلمانوں کے ملی تشخص، مذہبی حقوق کے تحفظ اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے پیشِ نظر گوشہ نشینی کی زندگی سے باہر نکال کر قائدین ملت کی صحیح سمت میں رہنمائی کریں۔ تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کے تشخص کو تحفظ حاصل ہو۔اور پھر جب بات تقسیم وطن کی چلی تو وہ پاکستان بنوانیکے لئے اس قدر شدت اختیار کر گئے کہ اپنے قدم واپس نہیں لاسکے۔

آزادی کا مطالبہ کرنے والی مسلم تحریکوں، خصوصاً علماء سے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے اپنے پلیٹ فارم سے جو تنظیمیں چلائی جارہی تھیں وہ کسی نہ کسی طرح انڈین نیشنل کانگریس کی ہم نوائی کررہی تھیں۔ اور انڈین نیشنل کانگریس بنیادی طور پر ہندوؤں کی ایک جماعت تھی اگر چہ اس میں مسلمان تھے تاہم وہ اتنی قلیل مقدار میں تھے کہ جن کی موجودگی مسلمانوں کے حقوق کی خاطر خواہ حفاظت میں کوئی اہم رول ادا کرنے والی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ ۱۸۵۷ء کے تلخ ترین تجربات مسلمانوں کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے، جب کہ انگریزوں کے خلاف چلائی جانے والی تحریک آزادی میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے تھے اور اکثر برادرانِ وطن نے وہ ذمہ داریاں پوری نہیں کی تھیں جن کی ان سے توقعات کی جارہی تھیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو معاشرتی، معیشتی، تعلیمی وتہذیبی سطح پر زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس اپنی بنیادی فکر کے اعتبار سے انگریز مخالف جماعت نہیں تھی (بلکہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اسے انگریزوں سے مخالفت مول لینی پڑی تھی) اسی وجہ سے دوراندیش، صاحبِ فکر وبصیرت مسلم دانشور و علماء اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے۔ دوسری جانب مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی تو اگر چہ اس نے اپنا نصب العین مسلمانوں کے مذہبی وسماجی حقوق کا تحفظ بتلایا لیکن اس میں جس طبقۂ فکر کی نمائندگی تھی اس سے بھی اصحاب الرائے کوئی خاص امیدیں نہیں باندھتے تھے اسی درمیان مسلم لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔

مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی کے نہ صرف یہ کہ شاگرد تھے بلکہ معتمد ترین اور قابلِ ذکر جانشین بھی تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے قابل فخر شاگردوں میں سے تھے، باوجود شیخ الہند سے انتہائی عقیدت ومحبت وتعلق کے وہ اپنے استاد کی سیاسی تحریک سے تو مطمئن تھے لیکن اس سیاسی تحریک کے جو دوررس اثرات مرتب ہورہے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے اس تحریک نے جس طریقہ پر کانگریس کے ساتھ پینگیں بڑھائی تھیں اس سے انہیں مسلسل تشویش لاحق تھی۔ چونکہ بنیادی طور پر ان کا میدان سیاسی نہیں تھا اس لئے اس کا اظہار بھی نہیں کرپاتے تھے۔ لیکن کچھ واقعات ایسے رونما ہوئے کہ جن کی وجہ سے انہیں اظہار حق کی خاطر اس میدان کو عبور کرنا اور اس میں شریعت کیمطابق رہنمائی کرنا ناگزیر ہوگیا، اس کے لئے انہوں نے مولانا ظفر احمد عثمانی کو اپنے نمائندہ یا ترجمان کی حیثیت سے عام مسلمانوں کو

شریعت اسلامیہ کی روشنی میں صحیح راستہ دکھانے کے لئے منتخب کیا۔ اس سے قبل انہیں خیالات کا اظہار سر سید احمد خاںؒ کر چکے تھے، لیکن وہ چونکہ عام مسلمانوں کی نظر میں اپنے کچھ متنازعہ مذہبی نظریات کے باعث اتنے مقبول نہیں تھے اس لئے ان کے یہ خیالات ایک مخصوص جماعت تک محدود رہے اور واقعی بات یہ ہے کہ یہی مخصوص جماعت مسلم لیگ کے بانیوں میں ہے۔

سر سید احمد خاں مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے اس لئے روک رہے تھے کہ ''کانگریس بغیر کسی شرط کے برطانوی حکومت پر مکمل اعتبار و اعتماد کا اظہار کر رہی تھی''[۱] علاوہ ازیں وہ کانگریس کی تنظیم و تشکیل اور کردار و انداز کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، اس کی بڑی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ''کانگریس خالصۃً ہندو ادارہ تھی جس میں ہندو، علم و شعور اور دولت و ثروت کی وجہ سے حاوی تھے اور وہ کانگریس کے ذریعہ اپنے مطالبات پیش کرا سکتے تھے کانگریس کا منشا یہ تھا کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کے حصے میں اضافہ کیا جائے۔ ہندوستان کی انتظامیہ کے سلسلے میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر ہندوستانیوں کا ہو، مگر کانگریس کے نزدیک ہندوستانی سے مراد ''ہندو'' تھی''[۲] اسی وجہ سے سر سید نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنیکی مہم چلائی تا کہ مسلمان اس ملک میں عزت و افتخار کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ کانگریس نے اس موقع پر سادہ لوح مسلمانوں کو ورغلانے کے لئے ''ہندوستانی --- ایک قوم'' کا خوشنما پُر فریب نعرہ دیا لیکن سر سید جیسے عظیم مفکر نے اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے اس خیال کے خلاف بڑا جہاد کیا اور آپ نے کہا کہ کانگریس کی تجویزیں نا قابلِ عمل ہیں، کیونکہ یہاں دو قومیں آباد ہیں ''ہندو اور مسلمان''، اسی وجہ سے سر سید نے کانگریس کی حمایت کو مسلمانوں کے خاتمہ کے مترادف قرار دیا،[۳] لیکن مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جس میں علمائے دین بھی شامل تھے سر سید علیہ الرحمۃ کے ان خیالات سے متفق نہیں تھا اور وہ کانگریس سے نہ صرف یہ کہ امیدیں لگائے ہوئے تھا بلکہ پوری طرح جانتا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس میں قتل و قتال اور تشدد سے بچتے ہوئے امن و امان کے ساتھ خوش تحریک ہندو مسلم متحد ہو کر چلائیں یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کانگریس کی ہمنوا نظر آنے لگی۔ کانگریس کے پہلے اجلاس کے بعد مسلمانوں نے کانگریس میں دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے اجلاس میں کل تعداد ممبران ۸۷ تھی جو ۱۸۸۶ء میں ۴۳۶ ہوگئی جس میں ۳۳ مسلمان تھے۔ ۱۸۸۷ء میں تیسرا اجلاس مدراس میں بدرالدین طیب جی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا جس نے اور مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جس میں کل ممبر ۶۰۴ اور مسلمان ۸۳ تھے۔[۴]

ان کانگریسی مسلمانوں کی اکثریت سر سید علیہ الرحمۃ کی تحریک کو انگریزوں کی حامی تصور کرتی تھی، کیونکہ ان کے خیال

---

(۱) مسلم لیگ ایک قومی تحریک میں شامل، مضمون بعنوان: ''انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمان'' / پروفیسر محمد مظفر مرزا / مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۱ء / ص: ۵۵۔

(۲) ایضاً / ص: ۵۶ء

(۳) ایضاً / ۵۷۔

(۴) نقشِ حیات (خود نوشت سوانح) / مولانا حسین احمد مدنی / الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی ۱۹۵۴ / ج: ۲، ص: ۷۰۔

کے مطابق اس کے پسِ پشت علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کے توسط سے انگریز حکمراں محب وطن افراد کے خلاف سرسید کے ذریعہ اشتعال پھیلانا چاہ رہے تھے، جس کی وجہ سے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی بنیاد پڑی۔ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کا مشورہ بلکہ کانگریس میں شرکت حرام قرار دیے جانے کا فتوی دلا رہی تھی تو دوسری جانب مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمود الحسن کانگریس کی شرکت کی حمایت اور انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی ممانعت میں فتوے دے رہے تھے۔[1] اس سلسلہ میں پیش پیش علمائے لدھیانہ مولانا محمد صاحب اور ان کے دو بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا عبداللہ صاحبؒ تھے انہوں نے اطراف وجوانب ہندوستان سے فتوے منگائے، اور ان سب کو ایک رسالہ ''نصرۃ الابرار'' میں جمع کیا، اس رسالہ میں تقریباً سو علمائے ہند کے فتاوے نقل کیے گئے۔[2]

فتوے بازی کی اس گھٹیا سیاست سے اپنے کو بے پرواہ ثابت کرتے ہوئے سرسیدؒ نے اپنے مشن سے یک سرِ مو انحراف نہیں کیا اور اپنا تعلیمی مشن جاری رکھا۔ سرسید کے دل میں مسلمانوں کی ترقی کی لگن تھی، اس لئے انہوں نے ان باتوں کا اثر نہیں لیا۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا ذمہ دار مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کو سمجھتے تھے، اسی لئے انہوں نے علماء سے ٹکر لی۔ مگر اسی کے ساتھ علماء پر جب غیروں کے حملے ہوئے تو سرسید ان کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔[3] یہ تو سرسید کی اپنی بات تھی، لیکن ان کے مخالفین انہیں تعلیمی نظریہ کی آڑ میں انگریزی تہذیب وثقافت کا علمبردار مانتے تھے، اس لئے ہر اس نظریہ کی مخالفت کرنا ''جزو ایمان'' سمجھتے تھے جن کو وہ اپناتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ اسی وجہ سے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور ''محمڈن اینگلو اورینٹل ایسوسی ایشن'' کو زہریلے اثرات مانتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسی وجہ سے ''مسلمان سیاسیات میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ جس کا احساس مسلمانوں کو بہت بعد میں ہوا، اسی زہریلی پالیسی کے تحت ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی،[4] یہ تو ایک الگ بحث ہے کہ مسلم لیگ کیسے وجود میں آئی۔ مختصراً یہ کہ مسلم لیگ وجود میں آ گئی جو سرسید علیہ الرحمۃ کے خیالات کی ہمنوا تھی۔

مسلم لیگ کے قیام سے مسلمانوں میں بیداری کی کچھ جھلک نظر آنے لگی تھی۔ سیاسی پستی اور دشمنوں کے مظالم نے ان کو کافی سبق سکھا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم جدید کا نسخہ مردہ لاش میں رفتہ رفتہ زندگی پیدا کر رہا ہے۔[5] بقول اے، بی، راجپوت ''مسلم لیگ کا قیام ایک اہم حقیقت تھا جس نے یہ بلا شک وشبہ ثابت کیا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم ہی آباد

---

(۱) نقشِ حیات، ج ۲: ص ۱۷

(۲) ایضاً/ ج:۲، ص:۱۷۔

(۳) مسلمانوں کا روشن مستقبل/ طفیل منگلوری/ ص:۲۰۰۔

(۴) نقشِ حیات/ ج:۲، ص:۷۳۔

(۵) مسلمانوں کا روشن مستقبل/ ص:۸۵۔

نہیں ہے، اور نہ ہی ہندو اور مسلمان کو ایک قوم میں ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ دو مختلف دھارے تھے جنہیں ایک اکائی میں متحد کرنا ممکن نہیں تھا''۔(۱)

لیکن دسمبر ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ نے اپنے اغراض و مقاصد میں تبدیلی پیدا کی۔ اب اس کے اغراض و مقاصد میں حصول حکومت خود مختاری شامل ہو گیا۔ ۱۹۰۶ء میں کانگریس نے اپنے کانسٹی ٹیوشن میں جو تبدیلیاں کی تھیں قریب قریب وہی تبدیلیاں ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ بھی لے آئی،(۲) اور اس طریقہ پر کانگریس اور مسلم لیگ میں کچھ چیزیں ایسی مشترک ہو گئیں جن پر دونوں کا اتحاد ممکن تھا۔ چنانچہ ۳۰/۳۱ دسمبر ۱۹۱۵ء اور یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو مسلم لیگ کا آٹھواں اجلاس اس لحاظ سے تاریخی اور غیر معمولی نوعیت کا حامل تھا کہ اس میں نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے اکابر ایک جگہ جمع ہوئے، ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اختلافات بُھلا دئے اور اس محبت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل کیا کہ دشمنوں کے دل دہلنے لگے۔(۳)

اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگریس خاص طور سے کوئی خاص اسکیم تیار کریں جس میں مسلمانوں کے مفاد اور ضروریات کے تحفظ کا خاص طور پر خیال رکھا جائے،(۴) اس اجلاس میں کانگریس کے جن رہنماؤں نے شرکت کی انمیں صدر کانگریس ایس، پی سنہا صاحب کے علاوہ سریندر ناتھ بنرجی، مسز اینی بیسنٹ، پنڈت مدن موہن مالویہ، سروجنی نائیڈو اور مہاتما گاندھی جیسی قابل ذکر شخصیات ہیں۔(۵) اس کے بعد کانگریس اور لیگ کے اجلاس ایک ساتھ ہوتے رہے۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس کا اجلاس حکیم اجمل صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا، جس میں کانگریس نے سول نافرمانی کا ریزولیوشن پاس کیا اور مہاتما گاندھی کو اس کا قائد مقرر کیا، اسی مقام پر مسلم لیگ کا اجلاس مولانا حسرت موہانیؒ کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں اراکین مسلم لیگ کے علاوہ کانگریس کے مہاتما گاندھی، مسٹر پٹیل، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ بھی شریک تھے، جس میں مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبۂ صدارت میں اول سوراج حاصل کرنے اور پھر مسلمانوں کے حقوق کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا، جس کے لئے مسلم لیگ تیار نہیں تھی،(۶) اس طریقہ پر سول نافرمانی کے معاملہ پر کانگریس اور لیگ کا گذشتہ سات آٹھ سالہ اتحاد ٹوٹ گیا اور اسی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں اس کا کوئی اجلاس نہیں ہو سکا۔ ۱۹۲۳ء کے بعد کے اجلاس میں مسلم لیگ نے کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ

---

(۱) مسلم لیگ: ایک قومی تحریک/ پروفیسر محمد مظفر مرزا/ مقبول اکیڈمی، لاہور/ ص: ۸۷۔

(۲) تاریخ مسلم لیگ/ ص: ۷۲۔

(۳) ایضاً/ ص: ۹۸۔

(۴) تاریخ مسلم لیگ/ ص: ۱۱۱۔

(۵) ایضاً/ ص: ۱۰۲۔

(۶) روشن مستقبل/ ص: ۴۰۳۔

العلماء سے اپنے کو الگ کرلیا۔ ۱۹۲۳ء کا اجلاس مسٹر غلام محمد بھرگری کی صدارت میں لکھنؤ میں ہوا۔ جو بے جان رہا، اس کے بعد لیگ کے چار اجلاس مئی ۲۴ء میں لاہور محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ دسمبر ۲۴ء لاہور میں ہی سید رضا علی کی صدارت میں دسمبر ۲۵ء میں علی گڑھ اجلاس سر عبدالرحیم کی صدارت میں اور دسمبر ۲۶ء میں دہلی اجلاس سر عبدالقادر کی صدارت میں منعقد ہوئے جو بے جان سے ہی رہے۔[(۱)]

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا جو ہندوستان میں جدید اصلاحات دیئے جانے کی تحقیقات کے لئے آرہا تھا لیکن چونکہ اس کے تمام ممبران انگریز تھے، جس کی وجہ سے ہندوستانیوں میں عام ناراضگی کی لہر پیدا ہوگئی۔ دسمبر ۲۷ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز پاس ہوئی، اسی طرح پشاور میں جمعیۃ العلماء نے اور کلکتہ میں خلافت کانفرنس نے نیز مسلم لیگ نے اجلاسِ کلکتہ میں سائمن کمیشن بائیکاٹ کی تجاویز پاس کیں۔ ادھر مخلوط انتخابات اور جداگانہ انتخابات کے تنازعہ نے شدت اختیار کرلی تھی، مسلم لیگ ایک دفعہ پھر کانگریس کے ساتھ آئین بنانے پر اس شرط پر راضی ہوگئی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت ہو اور سندھ علیحدہ کیا جائے تو مخلوط انتخابات کا اجراء منظور کیا جاسکتا ہے۔[(۲)] ادھر مسلم لیگ اور کانگریس میں پینگیں بڑھنے کے آثار رونما ہورہے تھے، اور دوسری طرف فرقہ پرست حضرات ایک دوسرے سے بیزاری ونفرت کا اظہار کررہے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات ملک کے مختلف حصوں میں رونما ہوچکے تھے۔ اب مسلمانوں کو اپنے ہی وطن میں اپنے اجنبی ہونے کا احساس ہونے لگا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، جس کی صدارت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ فرمارہے تھے۔ اس اجلاس میں علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا خیال پیش کیا،[(۳)] یہ اپنی نوعیت کا اپنے ظاہر کے اعتبار سے پاکستان متعلق پہلا خیال تھا۔ اسی خیال کی بنیاد پر پاکستان کے قیام کا ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں ملی نصب العین کے طور پر ایک قرارداد کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔[(۴)]

۲۹ء میں مسلم لیگ کے بیسویں اجلاس کے موقع پر مسلم لیگ انتشار کا شکار ہوگئی تھی۔ سر محمد یعقوب وعلی برادران نے دہلی کانفرنس کے چند لیڈروں کیساتھ حکیم اجمل خاں مرحوم کی قیام گاہ پر ایک علیحدہ کانفرنس منعقد کی۔[(۵)] محمد علی جناح لیگ

---

(۱) روشن مستقبل/ص:۴۱۰۔

(۲) ایضاً/ص:۴۲۱۔

(۳) تذکرۃ الظفر/ص:۳۵۳۔

(۴) ایضاً/ص:۳۵۳۔ صاحب تذکرۃ الظفر کا خیال ہے کہ اسلامی سلطنت کا جو خیال علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں پیش کیا تھا بالکل وہی خیال ان سے پہلے مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجالس میں کئی بار ظاہر فرماچکے تھے (ص:۳۵۳)۔

(۵) تاریخ مسلم لیگ/ص:۳۷۹۔

سے دل برداشتہ ہو چکے تھے اور لندن چلے گئے تھے، اسی وجہ سے ۳۰ء کے اجلاس کی صدارت علامہ اقبال نے کی، اس کے بعد کے لیگ کے اجلاس بے جان رہے۔

۳۶ء میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے احباب کے تقاضوں پر مسٹر جناح ہندوستان بلائے گئے، جنہوں نے اس میں ایک جان پیدا کردی، فی الحقیقت یہی اجلاس لیگ کی زندگی میں ایک انقلاب تھا۔[۱]

جون ۳۶ء میں مسلم لیگ کی تجویز کے مطابق مرکزی پارلیامنٹری بورڈ قائم ہوا اور صرف چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہونے والے انتخابات کے نتائج ان صوبوں میں جہاں جہاں لیگ پارلیامینٹری بورڈ قائم کی گئی تھی، ساٹھ سے ستر فی صد تک نتائج مسلم لیگ کے حق میں رہے، جس میں علمائے کرام خصوصاً مولانا اشرف علی تھانوی کے عقیدتمندوں وارادتمندوں کی محنت کا بہت بڑا دخل تھا جن میں مولانا ظفر احمد عثمانی کی دن رات کی محنت اور جدوجہد اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کے امیدواروں کی حمایت میں اکسانے کے لئے ان کی جان توڑ محنتوں اور کاوشوں نے اہم کردار ادا کیا۔ یہیں سے مولانا ظفر عثمانی صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

دراصل مولانا ظفر احمد صاحب جس شخصیت کی سیاسی نمائندگی کے لئے میدانِ سیاست میں تشریف لائے تھے ان کے یہاں اخلاص، اور شرعی حدود کی قیود لازمی اشیاء تھیں۔ وہ جس چیز کو خلافِ شریعت دیکھتے تھے اس پر برملا ٹوکنا یا اس کی مخالفت کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ دنیا والے خواہ اسے بھلا سمجھیں یا برا، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مثلاً ہندوستان میں تحریکِ خلافت چلی، جس کا مقصد مقاماتِ مقدسہ کی بحالی تھا۔ تمام ہندوستان کا مسلمان اس تحریک کا زبردست حامی، لیکن مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کے مخالفین میں شمار کیے جاتے تھے[۲] اس کی وجہ غالباً یہ رہی کہ ہوگی کہ اس تحریک کا مقصد بظاہر بھلے ہی مقاماتِ مقدسہ کی بحالی اور خلیفۃ المسلمین کی ملی حمایت ہو لیکن درحقیقت یہ تحریک انگریزوں کو ہندوستان سے بھگانے کے لئے اور ملک کو مکمل آزادی دلانے کے لئے چلائی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے مہاتما گاندھی بھی اس تحریک میں پیش پیش تھے اور وہ اس کی قیادت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ مقاصد کی اس دوغلی پالیسی نے مولانا تھانویؒ کو تحریک خلافت کی مخالفت پر مجبور کیا ہوگا، لیکن اس کے باوجود وہ مولانا محمد علیؒ کو مسلمانوں کا مخلص مانتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد مولانا عبدالماجد صاحب کے خط کے جواب میں مولانا تھانویؒ نے جو تعزیتی الفاظ تحریر کیے، ان میں مولانا محمد علی کی اس صفت کو سب سے ممتاز قرار دیا کہ وہ مسلمانوں سے بے غرض محبت رکھتے تھے[۳] یہ تھی مولانا اشرف علی تھانوی کی حق گوئی وسیاسی بصیرت۔

---

(۱) تاریخ مسلم لیگ/ص: ۲۲۴

(۲) حکیم الامت -- نقوش وتاثرات/عبدالماجد دریا آبادی/مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء/ص:۳۰۔

(۳) نقوش وتاثرات/ص:۱۷۶۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے ہم خیال نہ تھے، بلکہ کانگریس کی حامی جماعت خلافت کمیٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ مولانا تھانویؒ کی تحریکِ خلافت کی مخالفت کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ''حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی وہ اس کے کافرانہ ہونے کی بنا پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر''۔ (۱) تحریکِ خلافت کے طریق کار سے مولانا تھانویؒ کا اختلاف اصولی تھا، وہ ہندوؤں کی عددی اکثریت اور ان کے قائدین کی معاندانہ ذہنیت کی وجہ سے اس تحریک کو ہندوؤں کیساتھ مل کر چلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ (۲)

یہ نکتہ چونکہ مرکزی نوعیت کا حامل ہے اور آگے کی تمام تر گفتگو یعنی مولانا تھانوی اور ان کے رفقاء کی مسلم لیگ کی حمایت میں اہم مقام رکھتا ہے اس لئے اس پر تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

مولانا تھانوی کا نظریۂ پاکستان تمام تر دینی تھا وہ عین اسلامی حکومت کے خواستگار تھے، اسی لئے وہ کانگریس کی متحدہ قومیت کے سخت مخالف اور دوقومی نظریہ کے حامی تھے۔ مسلم لیگ نے جب تک صرف انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کی پالیسی پر عمل کیا وہ اس کے ہم نوا نہیں ہوئے، لیکن جب ۱۹۳۰ء میں چودھری رحمت علی کی زبانی دنیا لفظ ''پاکستان'' سے آشنا ہوئی اور علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال ظاہر کیا تو مولانا تھانویؒ نے اپنی فہم وبصیرت کے مطابق اس نظریہ سے اتفاق کرلیا۔ محمد علی جناح اس وقت ہندوستان سے دل برداشتہ ہوکر لندن جا چکے تھے۔ ان کی لندن سے ہندوستان واپسی جب ہوئی جب کہ لیاقت علی خاں نے ۱۹۳۳ء کے اخیر میں لندن جا کر جناح صاحب کو ہندوستان آنے اور انہیں مسلم قوم کی لیڈر شپ سنبھالنے کی دعوت دی تھی۔ (۳)

مارچ ۳۴ء میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں محمد علی جناح کو مسلم لیگ کا مستقل صدر منتخب کیا گیا (۴)۔ اس کے بعد محمد علی جناح نے مسلم لیگ کو ایک نئی جہت دی اور انہوں نے مسلمانوں کو مکمل آئینی حقوق اور دستوری تحفظ اپنے ایجنڈے کی ترجیحات میں شامل کرلیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کا زیادہ تر رجحان مسلم لیگ کی طرف ہوگیا اور علمائے کرام کی ایک جماعت جس میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے معتقدین کثیر تعداد میں تھے مسلم لیگ کے لئے میدانِ عمل میں آ گئی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ اگر چہ مسلکاً دیوبندی تھے اور دیوبندی جماعت (جمعیۃ العلماء) کانگریس کی ہم نوا، لیکن مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس جماعت سے برأت کا اظہار کیا اور ایک موقع ایسا بھی آیا جب انہوں نے النور کے شمارے میں جماعت دیوبند کے اس

---

(۱) نقوش و تاثرات/ص: ۲۳

(۲) تذکرۃ الظفر/ص: ۳۵۱۔

(۳) محمد علی جناح/کانجی دوارکا داس؛ اردو ترجمہ: شہاب الدین دسنوی/علمی مجلس، دہلی ۱۹۷۰ء/ص: ۸۵۔

(۴) مسلمانوں کا روشن مستقبل/ص: ۴۵۵۔

وقت کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بہتر ذاتی تعلقات اور احترام و اکرام کے باوجود ایک مقالہ ''المانعیۃ عن بعض الجامعیۃ'' کے عنوان سے شائع فرمایا[۱]، جس میں انہوں نے کانگریس کے ایک ایسے لیڈر کی دیوبند آمد پر طلبائے دارالعلوم کی طرف سے استقبال کرنے پر شدید تنقید کی جو کہ غیر مسلم ہونے کے علاوہ احکام اسلام کی اہانت اور انہدام کی سعی و تائید کرتا ہو۔ اس مضمون میں مولانا نے ان حضرات کو جو کہ دونوں جماعتوں (یعنی جماعتِ دیوبند اور جماعتِ تھانہ بھون) سے خصوصیت کا تعلق رکھنا چاہتے ہوں انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس خیال کو بالکل دل سے نکال دیں اور کسی بھی ایک جماعت کے ساتھ ہو جائیں[۲]۔ اس طریقہ پر اختلاف کی اٹھنے والی دیوار نے دونوں جماعتوں کی فکر علیحدہ کر دی جو اخیر تک قائم رہی۔ جمعیۃ العلماء، ہند کانگریس کی حمایتی رہی اور جماعتِ تھانہ بھون کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کو مُضر سمجھتے ہوئے انہیں کانگریس سے دور کرنے پر قائم رہی۔ اس کے بعد ان کا سیاسی پلیٹ فارم مسلم لیگ کے علاوہ کوئی تھا بھی نہیں، اس لئے وہ مسلم لیگ کی حمایتی ہو گئی۔ اس جماعت میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی شفیع عثمانیؒ اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے کلیدی رول ادا کیا۔ یہ ہے مولانا ظفر صاحب کا سیاسی پسِ منظر۔ اب ہم اگلے صفحات میں مولانا ظفر صاحب کی سیاسی خدمات کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیں گے۔

---

(۱) ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون، مدیر: شبیر احمد تھانویؒ، شعبان ۱۳۵۵ھ۔

(۲) حکیم الامت، نقوش و تاثرات/ص: ۵۱۲۔

دوسری فصل : مولانا ظفر احمد عثمانی کی سیاسی خدمات

حقیقت یہ ہے کہ علمائے ربانیین کا طبقہ خدا ترس اور مخلص ہوتا ہے، وہ جس کی حمایت کرتا ہے تو دل کی گہرائیوں سے اور اگر کسی سے مخالفت کرنی ہوتی ہے تو اس کے پس پشت بھی جذبۂ خیر کارفرما ہوتا ہے۔ سیاست کے گلیاروں میں پائیدار چیزوں کا کوئی مقام نہیں وہاں توقتی فوائد حاصل کرنے کی خاطر دوست، دشمن بن جاتا ہے اور دشمن مسیحائی کا کام کرنے لگتا ہے۔ البتہ جب کبھی کسی معاملہ کو مذہبی چاشنی دینی ہوتی ہے تو سیاست کے فکری دھاروں کو سیاسی انداز میں مذہب کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ سادہ لوح اور امت کا مخلص ترین طبقۂ علماء اس سے یہ مطلب اخذ کرنے لگتے ہیں کہ سیاست مذہب کے بغیر چلنے والی نہیں ہے، اور وہ دینی فریضہ تصور کرتے ہوئے مسلمانوں کی صحیح راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے سمتِ منزل متعین کر دیتے ہیں اور اپنی فہم واستعداد کے مطابق کسی قائد کی قیادت میں چلنے کا مشورہ دے دیتے ہیں۔ چونکہ مسلم عوام کی اکثریت علماء کی رائے کو مذہبی رائے تصور کرتی ہے اسی لئے وہ اپنے مقتداو پیشوا کے منتخب راستوں پر چلنا دینی فریضہ تصور کر لیتے ہیں۔ سیاسی حضرات اپنے فائدے حاصل کرنیکے بعد اسی طبقہ سے ایسی چشم پوشی کر لیتے ہیں گویا کبھی اس طبقہ سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہو۔ چنانچہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے علماء کا صرف استعمال ہی نہیں کیا بلکہ استحصال بھی کیا۔ دیوبندی مکتبِ فکر کا تھانوی گروپ اسلامی سلطنت کے تصور کے تحت مسلم لیگ سے یہ توقعات وابستہ کیے ہوئے تھا اور اسی مکتبِ فکر کا مدنی گروپ متحدہ قومیت کو امن وآشتی اور مسلمانوں کی ہندستان میں مذہبی شناخت قائم رکھنے کے لئے ضروری سمجھ رہا تھا۔ اسی لئے ہرایک گروپ اپنے اپنے حمایت یافتہ گروپوں کی کامیابی کے لئے تن، من، دھن کی بازی لگا رہا تھا۔ اب یہ الگ بحث ہے کہ دونوں نے کیا کھویا، کیا پایا؟۔ ہمارے خیال میں دونوں فریقوں کو نفع کم ہوا اور نقصان زیادہ۔ مسلم لیگ نے اپنے ہم نوا علماء کی حمایت سے بھرپور فائدہ اٹھایا تو کانگریس نے بھی قوم پسند علماء کرام کے تعاون سے مسلمانوں کی بھرپور حمایت حاصل کی، لیکن آزادیٔ وطن اور تقسیمِ ملک کے بعد دونوں سیاسی گروپوں نے نہ تو مذہبی شعائر کا خیال کیا اور نہ ہی ملی تقاضوں کو پورا کیا۔ اس طریقہ پر سادہ لوح علماء کرام اپنے مخلصانہ جذبوں کے ساتھ مذہبی فریضہ ادا کرتے رہے، اور سیاسی حضرات خوشنما وعدوں، پُرفریب دعووں اور جھوٹے نعروں کے ذریعہ عوام اور علماء کرام کا استحصال کرتے رہے ہندوستان میں کانگریس اور پاکستان میں مسلم لیگ اقتدار میں آئی، لیکن حکومتیں شخصیات کے اردگرد گھومتی رہیں۔ مسلمانوں کے مسائل میں ہندوستان میں تو اضافہ ہوا ہی، جس مقصد کے لئے انہوں نے قربانیاں دے کر پاکستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خواب دیکھا تھا وہ بھی ترپن سال گذرنے کے باوجود تا ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا، بہر حال یہ کام تو اربابِ سیاست کا تھا جو وعدے کر کے بھولنے کے عادی

ہوتے ہیں، علمائے کرام نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ کانگریس سے مسلم لیگ کی مکمل علیحدگی کے بعد مولانا تھانویؒ اوران کے مایۂ ناز شاگرد مولانا ظفر احمد عثمانی نے علی الاعلان مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کو اس طرف راغب کیا کہ وہ مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دے کر قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کریں، اور سچ بات یہ ہیکہ اگر ان علمائے کرام کی مساعی شاملِ حال نہ ہوتیں تو شاید پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہوتا،[1] لیکن ان علمائے کرام کی مخلصانہ خدمات کو سیاسی رہنماؤں نے فراموش کر دیا یہی وجہ ہے کہ آج کا طالب علم ان علمائے کرام کے تذکروں کے لئے تاریخ کی کتابیں کی کتابیں کھنگال ڈالتا ہے لیکن اسے ان کے تذکرے چند سطور سے زیادہ کہیں نہیں ملتے۔ چونکہ ان حضرات نے رضاءِ خداوندی کے لئے یہ خدمات انجام دیں اس لئے یہ اس کے متمنی بھی نہیں ہوئے کہ ان کے تذکرے زینتِ اوراق بنیں یہ بھی ان کے خلوص کی ہی دلیل ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی سیاسی زندگی کا آغاز حضرت تھانویؒ کی تحریکِ خلافت کی مخالفت سے ہوتا ہے، لیکن اس وقت تک یہ اجتہاد قلمی تھا، اعلاء السنن کی جلد ۱۲ میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے استخلاصِ وطن پر بحث فرماتے ہوئے کانگریس کی متحدہ قومیت کے ابطال پر تفصیلی کلام فرمایا جو علمی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا اور مولانا کا سیاسی نظریہ سامنے آیا۔[2] اسی درمیان مولانا کے پیر مرشد مولانا تھانویؒ نے تحذیر المسلمین، الخیر النامی وغیرہ رسائل لکھے جن میں انہوں نے اپنے سیاسی مسلک کا برملا اظہار فرمایا[3] یہ سب علمی بحثیں تھیں جو علمی حلقوں تک محدود تھیں، عملی طور پر سیاست میں داخلہ کا سبب مسلم لیگ اور کانگریس کی علیحدگی کے بعد جھانسی میں ہونے والا الیکشن بنا، جس میں جھانسی کے مسلمانوں نے مولانا تھانویؒ سے دریافت فرمایا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں میں سے شرعاً ووٹ لینے کا کون حقدار ہے؟ تو مولانا تھانوی مسلم لیگ کے حق میں فتویٰ دینے میں پس و پیش کر رہے تھے لیکن مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنی سیاسی فہم و بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے مولانا تھانویؒ کو مشورہ دیا کہ ''آپ کانگریس کی حمایت کے تو خلاف ہیں ہی، صرف تامل مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے اسی لئے آپ یہ جواب دے دیجئے کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے''۔[4]

یہ جواب جھانسی کے مسلمانوں کو دے دیا گیا جسے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے حق میں فتوی سمجھتے ہوئے مسلم لیگ کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرایا، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مولانا شوکت علی باقاعدہ تھانہ بھون تشریف لائے جنہوں

---

(۱) فتح الباب (ماہنامہ الرشید کراچی، دارالعلوم، دیوبند نمبر ۱۹۸۰ء)/ص:۱۵۔
(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں اعلاء السنن/ مولانا ظفر احمد عثمانی/ مکتبہ دارالعلوم، کراچی/ ج:۱۲، ص:۵۰۸۔
(۳) تذکرۃ الظفر/ص:۳۵۷۔
(۴) تذکرۃ الظفر/ص:۳۵۸۔

نے اسکا اعتراف کیا کہ آپ کے فتوے نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دینے پر راغب کیا۔ مولانا شوکت علی نے تھانہ بھون میں جلسہ بھی کیا جس میں مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت مولانا تھانوی کی طرف سے تقریر کی تھی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یو، پی اور بعض دوسرے صوبوں کی وزارت میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو شامل کرنا تھا جسے کانگریس نے نامنظور کر دیا ،جس کے نتیجہ میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے مطالبات کو لے کر تحریک شروع کی ۱۹۴۲ء تک اس تحریک نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن یا پاکستان قائم کرنے کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی[1] اس مطالبہ کی حمایت میں بھی تھانوی مکتبۂ فکر کے علماء نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۴۲ء کے انتخابات میں کانگریس اور مسلم لیگ آمنے سامنے ہوگئیں۔ کانگریس نے یہ الیکشن متحدہ قومیت کے ایشو پر لڑا تھا جس میں اس کی حمایت میں مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد نے جو علماء دیو بند یا مولانا ابوالکلام آزاد جیسے قومی رہنماؤں کے زیرِ اثر تھے، کانگریس کی حمایت کی۔ مولانا ظفر احمد تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مکتبۂ تھانوی کے اہم ترین علماء کانگریس کے موقف کے خلاف اسلامی سلطنت کے قیام کا تصور لئے ہوئے مسلم لیگ کی حمایت میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے مسلم اکثریتی صوبوں کے دورے کئے۔[2] ان کے مراکز یو، پی، پنجاب، بنگال اور سندھ کے صوبے رہے چنانچہ اس انتخاب میں بنگال، پنجاب اور سندھ میں مسلم لیگ نے اکثریت حاصل کر لی۔ بنگال میں مسلم لیگ سب سے بڑی اور واحد پارٹی کی حیثیت سے ابھر کر آئی۔ پنجاب میں اس کی نشستیں کانگریس کے برابر رہیں اور سندھ میں بھی اس نے بہت سی نشستوں پر کامیابی حاصل کر لی[3] اس طریقہ پر مسلم لیگ کے حوصلے بلند ہوگئے۔ یقینی طور پر اس کامیابی میں ان علمائے کرام کا بہت بڑا دخل تھا۔ یہ علمائے کرام مسلم لیگ کے اس نظریہ سے اتفاق کرتے تھے کہ ''غیر منقسم ہندوستان میں کانگریس مسلم اکثریتی صوبوں میں برابر مداخلت کرتی رہے گی اور متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو پنپنے کا موقع نہیں ملے گا جب کہ مولانا آزاد اور ان کے ہم نوا علمائے کرام کا خیال تھا کہ'' اگر ملک کا بٹوارہ ہوگیا تو ایک حصہ مسلم اکثریت کا ہوگا اور دوسرا ہندو اکثریت کا۔ ہندو اکثریت کے بیچ مسلمان ایک کمزور طاقت بن کر رہ جائیں گے۔ جو صرف ان کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ ان کے تعلیمی اور ثقافتی مراکز کمزور ہو جائیں گے۔ قیام پاکستان پاکستانی مسلمانوں کے مسئلے تو حل کر دے گا لیکن وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو اور بڑھا دے گا جو یہاں اقلیت بن کر رہ جائیں گے،،۔[4]

علماء کی یہ جماعت پاکستان بنوانے کی ہم نوا تو تھی، لیکن اس میں بھی ان کے پیشِ نظر سیاست سے زیادہ مذہبی نظریات تھے۔ اسی لئے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تھانہ بھون کے اس جلسے میں جس میں مولانا شوکت علیؒ جھانسی کے الیکشن کی فتح

---

(۱) اردو انسائیکلو پیڈیا/ مدیر اعلی: پروفیسر فضل الرحمٰن/ قومی کونسل برائے اردو ترقی، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء/ ج:۱، ص:۵۱۲۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ ص ۳۶۶

(۳) ابوالکلام آزاد --- شخصیت اور کارنامے/ مرتبہ: خلیق انجم/ اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۶ء/ ص:۱۰۳۔

(۴) ابوالکلام آزاد --- ایک ہمہ گیر شخصیت/ مرتبہ: رشید الدین خاں/ ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۹ء/ ص:۴۵۲

پر مولانا تھانوی کا شکریہ ادا کرنے تشریف لائے تھے، مولانا تھانویؒ کی نیابت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اسٹیج سے برملا کہا کہ ''جب تک لیگ کے عہدہ داران دین و مذہب کے پورے پابند نہ ہوجائیں گے ان پر بھی پورا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا''۔ پھر انہوں نے قرآن کی زبان میں اسلامی حکومت کا آئیڈیل بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالی کے مسلمان بندے وہ ہیں کہ ان کو زمین پر اقتدار دیا جائے تو وہ نماز قائم کریں، زکوۃ دیں، نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔''[1]

مولانا اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور کہاں تک ناکام؟ یہ تو الگ بحث ہے، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ حق بات سیاسی پلیٹ فارم پر بھی کہنے سے باز نہیں چوکے۔ اور انہوں نے سیاست کا معیار قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کیا۔ اب خواہ اس پر کوئی کان دھرے یا نہ دھرے، غالباً یہی وجہ ہیکہ مسلم لیگ کے اربابِ اقتدار اس وقت تو اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرانے کے لئے، مسلمانوں کے ووٹ کے حصول کی خاطر ان علمائے کرام کی ہر بات پر سر دھنتے رہے، لیکن جب پاکستان کا اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا تو وہ نہ صرف یہ کہ ان علمائے کرام کی خدمات کو فراموش کر بیٹھے، بلکہ انہوں نے اپنی تنگ دلی و تنگ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے تاریخ کے صفحات پر بھی ان حضرات کو ان کی خدمات کے مناسب مقام عطا نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صرف نصف صدی گذرنے پر ہی حالت یہ ہوگئی ہے کہ ایک ایسا طالب علم جو ان علمائے کرام کی خدمات کو پاکستان یا مسلم لیگ کی تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنا چاہے اسے تو مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ تاریخ سیاست کے صفحات پر دنیادار، دین بیزار طبقہ کا ہمیشہ غلبہ رہا جس نے مذہبی طبقہ کی خدمات کو اجاگر کرنا گوارا ہی نہیں کیا، لیکن یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر مولانا تھانوی کے گروپ یعنی مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی مفتی محمد شفیع صاحب اور ان کے معتقدین نظریۂ پاکستان کی حمایت نہ کرتے تو پاکستان ''ناممکن الوقوع'' شی ہوتا۔

مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ اپنے استاد و مربی مولانا اشرف علی تھانوی کے سیاسی نظریات کی تبلیغ میں دل و جان اور خلوص وللّٰہیت کے جذبہ کے تحت لگے رہے، مولانا تھانویؒ کو بھی مسلم لیگ سے کوئی خاص توقعات تو نہ تھیں البتہ کانگریس کے مقابلہ ''اہون البلیتین'' کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا تھا،[2] اسی اصول پر ان کے پیرو کار مولانا ظفر احمد صاحبؒ قائم ہے اور انہیں نام ونمود یا شہرت ومنصب سے کوئی دل چسپی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ طالع آزما ،سیاسی مفاد پرست حضرات پاکستان کے ''تاج محل'' کا ''کلس'' بن کر دنیا کی نظروں کے سامنے آئے اور ''بنیادی اینٹ'' کے مانند علمائے کرام کا طبقہ خاموش تماشائی بنا رہا۔ بہت کم مؤرخوں نے ان حضرات کی خدمات کو سراہا لیکن وہ کبھی اس کے بھی روادار نہیں رہے اور اپنی تعریف وتوصیف سے بے نیاز رہے۔

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۳۵۹۔

(۲) مجدد ملت اور قومیات وسیاسیات حاضرہ/عبدالباری ندویؒ/ ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری/ص:۵۹/۱۔

جولائی ۱۹۴۳ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی وفات کے بعد ان کے متوسلین و معتقدین نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں دل و جان کی بازی لگادی، جن میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے چپہ چپہ میں اپنی تقاریر اور عملی جد و جہد کے ذریعہ تحریکِ پاکستان کو مقبولِ عام بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جمعیۃ علمائے ہند کانگریس سے علی الاعلان وابستگی کا اظہار کر چکی تھی اور بقول شیخ محمد اکرام صدر جمعیۃ مولانا حسین احمد مدنیؒ انگریز دشمنی کے سیلاب میں بہہ کر اپنی قوم سے رشتہ منقطع کر چکے تھے۔ لیکن مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا شبیر احمد، اور مولانا مفتی شفیع رحمہم اللہ وغیرہ اس وقت تحریک پاکستان سے وابستہ تھے۔[1] پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن کا جیتنا آسان کام نہیں تھا، اسی نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی وغیرہ جیسے جید علمائے کرام نے یہ تجویز کیا کہ مطالبۂ پاکستان کے لئے علماء کو اپنا مستقل مرکز قائم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اکتوبر ۴۵ء میں کلکتہ کے محمد علی پارک میں مولانا ظفر احمد صاحبؒ کی زیرِ صدارت چار روزہ اجلاس ہوا جس میں جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد رکھی گئی، جس کی مستقل صدارت کے لئے علامہ شبیر احمد عثمانی کو تیار کیا گیا، نائب صدر مولانا ظفر صاحب رہے۔[2]

جمعیۃ علمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کی حمایت و تائید نے تحریکِ پاکستان میں جان ڈال دی کیونکہ اس وقت علماء کی اس جمعیت کو چھوڑ کر باقی دوسری قابل ذکر مسلم تنظیمیں مثلاً مجلس احرار، نیشنلسٹ مسلمان، جمعیۃ علمائے ہند، اور خدائی خدمت کار وغیرہ سبھی تنظیمیں پاکستان کے خلاف متحد تھیں،[3] جماعت اسلامی اگرچہ پاکستان کی حامی تھی لیکن وہ صرف ووٹ اور الیکشن کے سلسلہ میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کر کے اپنے نظریات میں تبدیلی لانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ جماعتِ اسلامی اس الیکشن کو وقتی مفاد سے تشبیہ دے کر اپنے اصولوں کو قربان کرنا نہیں چاہتی تھی[4]۔ الیکشن سر پر تھے، جس میں برِصغیر کے بارے میں یہاں کے عوام کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے ساتھ رہیں گے یا مسلم لیگ کے مطالبہ کے موافق ہند اور پاکستان میں تقسیم ہو کر اپنی علیحدہ شناخت قائم کریں گے، اس موقعہ پر مولانا ظفر احمد عثمانی اور ان کے ساتھی رفقائے کار علمائے کرام نے جن کا مذاق ہی شروع سے ہی الیکشنی سیاست سے یکسو تھا۔ ملک کے طول و عرض میں مسلم لیگ کی امداد اور پاکستان کی حمایت کرنے کیلئے طوفانی دورے کئے۔ تقریباً چار ماہ کے اس عرصہ میں مولانا نے یو، پی، بہار، بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد میں طوفانی دورے کر کے عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا،[5] حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اس

---

(۱) موجِ کوثر/شیخ محمد اکرام/تاج کمپنی، دہلی، ۱۹۸۷ء/ص:۲۰۶۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ص:۳۶۹-۳۷۰۔

(۳) تذکرۃ الظفر/ص:۳۷۱۔

(۴) ایضاً/ص:۳۷۳۔

(۵) ایضاً/ص:۳۷۵۔

سے قبل نہ تو کسی سیاسی انتخاب میں اس انداز سے قدم رکھا تھا اور نہ ہی وہ اس کے عادی تھے۔ اس لئے انتخابات ۴۵ء میں انہیں سخت مشقت اٹھانی پڑی لیکن انہوں نے اسے مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔

مولانا کی اس جدوجہد اور طوفانی دوروں سے ہوا کا رخ بدل گیا۔ جو لوگ ابھی تک مسلم لیگ کی حمایت کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے وہ بھی اس میں شامل ہو کر اس کے مدد و معاون بن گئے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے اپنوں اور غیروں میں کوئی تمیز نہیں کی۔ مسلم لیگ کے مقابلے پر اگر ان کا کوئی عزیز ترین رشتہ دار بھی میدان میں آیا تو اس کی مخالفت انہوں نے اپنا فریضہ جانا۔ چنانچہ مظفر نگر و ضلع سہارنپور سے ضمنی انتخاب کے لئے کانگریس نے اپنا امیدوار محمد احمد کاظمی صاحب کو بنایا تھا، جن سے مولانا کی قرابت بھی تھی، اور کاظمی صاحب اپنی بعض نمایاں خدمات مثلاً کاظمی ایکٹ ۱۹۲۰ء کی وجہ سے سیاسی اور مذہبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتے تھے، اس کے علاوہ کاظمی صاحب کی امداد کے لئے مولانا حسین احمد مدنی بھی اس حلقہ میں دورہ کر رہے تھے کاظمی صاحب نے مسلمانوں کے بہت سے مفید کام انجام دئے تھے۔ بقول مدیرِ معارف وہ ''قوم پروری کے ساتھ دیندار بھی تھے اور ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد بھی تھا''،[1] ان کے مقابلہ پر نواب زادہ لیاقت علی خاں مسلم لیگ کے امیدوار کی حیثیت سے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قرابتوں، ذاتی مراسم اور ان کی دوسری تمام خصوصیات سے بالاتر ہو کر ان کے کانگریسی امیدوار ہونے کے باعث کاظمی صاحب کی مخالفت اور لیاقت علی خاں کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ لیاقت علی خاں کے لئے انہوں نے مسلمانوں سے ووٹ مانگے، جلسے کئے اور انہیں منتخب کرنے کی اپیل کی جس میں انہیں کامیابی ملی، نواب زادہ لیاقت علی خاں نے (جو پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں) اس کامیابی پر مولانا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے تار دیا اور پھر باضابطہ مسلم لیگ کے دفتر سے مراسلہ بھیج کر ان کا شکریہ ادا کیا۔[2]

مارچ ۱۹۴۶ء میں مولانا نے علامہ سید سلیمان ندوی او بعض مشہور علمائے کرام کے مشورے سے مسلم لیگ کے حق میں فتویٰ لکھا[3] جس نے بہت شہرت حاصل کی۔ جب برطانوی حکومت نے ۱۹۴۶ء میں سیاسی پیچیدگیوں کے حل کے لئے کابینہ مشن کے قیام کا اعلان کیا اور اس نے مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا چاہا تو مولانا ظفر صاحب نے ایک تار کابینہ وفد کے نام روانہ کیا جس میں تحریر تھا کہ ''مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ سیاسی تنظیم ہے۔ کل ہند جمعیتِ علمائے اسلام متحدہ طور پر مسلم لیگ کی پشت پر ہے۔ پاکستان مسلمانوں کا قومی اور ملی مطالبہ ہے۔ اس مطالبہ کے انکار کا تصور کسی صورت میں نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان اس سوال پر کمی بیشی کر کے کوئی مصالحت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمان اس مطالبہ ملی کے حصول کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار ہیں۔[4]

---

(۱) شذرات (ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ ؛ نومبر، ۵۹ء ؛ ۸۴/۵)/معین الدین احمد ندوی/ص: ۳۲۳۔

(۲) روز نامہ عصر جدید، کلکتہ: ۱۲/مارچ، ۱۹۴۶۔

(۳) تذکرۃ الظفر/ص: ۳۷۸۔

(۴) ایضاً/ص: ۳۸۳۔

صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی نے انگریز اور کانگریس دونوں کو مطالبۂ پاکستان ماننے پر مجبور کر دیا مگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر کانگریس اڑ گئی اور قائد اعظم نے اس کو منظور کر لیا۔ ۹ ر جون ۴۷ء کو قایدِ اعظم نے اس منظوری کی وضاحت کے لئے دہلی میں جلسہ طلب کیا جس میں مولانا ظفر صاحب کو بھی مدعو کیا گیا، اس میں محمد علی جناح نے فرمایا کہ اگر کانگریس کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا جاتا تو پاکستان نہ بن پاتا۔ اس لئے اس کو منظور کر لیا گیا۔(۱)

تحریک پاکستان میں مولانا کا بہت بڑا کارنامہ سلہٹ ریفرنڈم ہے، جو ان کی شبانہ روز محنتوں کے نتیجہ میں عمل میں آیا، اور وہاں کے مسلمانوں نے پاکستانی نظریہ کی تائید و حمایت ان کی مخلصانہ جد و جہد کی بدولت کی جس کی وجہ سے یہ علاقہ پاکستان کو مل سکا، کیونکہ سلہٹ اور سرحد کے بارے میں کانگریس کو اصرار تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کی علیحدہ رائے معلوم کی جائے کہ وہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتے ہیں، اس کے پیچھے کانگریس کی یہ خوش فہمی تھی کہ چونکہ سلہٹ میں مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد اور مرید زیادہ تھے اور مولانا مدنی ہر سال رمضان بھی وہاں گذارتے تھے اس لئے یہ علاقہ جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اثر رہے گا۔ ادھر مسلم لیگ نے جب پیروں کے نیچے سے زمین کھسکتے دیکھی تو جون ۴۷ء کے الیکشن میں نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مولانا کی خدمات حاصل کرنے کے لئے تار روانہ کیا۔ مولانا اس وقت ڈھاکہ میں نہیں تھے بلکہ اپنے وطن تھانہ بھون آئے ہوئے تھے، تھانہ بھون میں تار پر تار آئے تو مولانا ظفر صاحب تھانہ بھون سے ڈھاکہ اور وہاں سے سلہٹ پہونچے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں خود سلہٹ کے دورے پر تھے لیکن ان کے جلسے کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ''غفر'' گاؤں میں لیاقت علی خاں کے جلسہ میں گڑبڑی ہو چکی تھی اور اب یہ امید ہو چلی تھی کہ پورے سلہٹ میں ان جلسوں کا یہی حشر ہوگا۔ تبھی مولانا سلہٹ پہونچ گئے۔ الیکشن میں صرف پانچ دن باقی تھے اور وقت کم ہونے کے باعث اب مسلم لیگ کو مایوسی نظر آنے لگی تھی لیکن مولانا نے گاؤں گاؤں دورہ کر کے پوری فضا کو بدل کر رکھ دیا انہوں نے اپنے خطبات میں دلائل شرعیہ سے پاکستان کی حمایت اور اسکی ضرورت کو ثابت کیا۔ مولانا نے پولنگ کے دن تک سلہٹ میں کام کیا، بالآخر الیکشن کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ سلہٹ کی اکثریت نے پاکستان کے حق میں رائے شماری کی اور مسلم لیگ پچاس ہزار ووٹوں سے کامیاب ہوئی، اس طرح سلہٹ پاکستان میں شامل ہو گیا۔(۲)

ہندوستان تقسیم کے دھانے پر کھڑا ہوا تھا۔ علماء کا ایک طبقہ تقسیم کا زبردست حامی اور دوسرا فریق شدت سے مخالف تھا۔ دونوں فریق ملت اور مذہب کے تئیں اگر چہ مخلص تھے لیکن دونوں کے نظریات ایک دوسرے کی ضد تھے، بقول مولانا محمد میاں: ''ایک تقسیم ہند کو انگریز کی پُر فریب سیاست کا شہکار سمجھتا تھا مسلمانوں کے لئے بتاہ کن، ہندوستانی قومیت کے لئے

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص: ۳۸۳۔

(۲) ایضاً/۳۸۲ - ۳۸۸۔

مرض لازوال اور دوسرے کے خیال اور عقیدہ میں پاکستان ایک پر تقدس تصور تھا جس کو الہامِ سبحانی اور القاءِ ربانی کہنے میں بھی اس کو تامل نہیں ہوتا تھا''۔ ہر ایک فریق پوری صداقت و دیانتداری کے ساتھ اپنے نظریہ پر جما ہوا تھا، اس کی حمایت میں جان قربان کرنے کو شہادت اور مخالفت کرنے والوں کی پوری پوری مخالفت کو اپنا فرض تصور کرتا تھا''[1] علماء کا پاکستان حامی طبقہ مولانا اشرف علی تھانوی کی اس سیاست پر گامزن تھا کہ ''جس طرح بھی بن سکے مسلمانوں کو سچا مسلمان بنا دیا جائے۔ اسی لئے آپ کی حمایتِ لیگ سیاسی اغراض کے لئے نہیں تھی بلکہ اس غرض کے لئے تھی کہ مسلمان لیگ کے اندر داخل ہو کر اپنی تنظیم اور لیگ کی اصلاح کی فکر کریں تاکہ یہ کانگریس کا مقابلہ کر سکیں۔ اور متعصبین اسلام کو ہندوستان سے نہ مٹا سکیں اور اسلام اپنے اصول اور شعائر کے ساتھ ہندوستان میں باقی رہے''۔[2]

بہر حال یہ اس طبقہ کی اپنی سوچ تھی جو یقیناً شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں تھی اس کے برخلاف جمعیۃ علماء ہند مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کو برطانیہ کی چال سمجھتی تھی اور پاکستان کے قیام کو ''انگریزی حکومت کے ماتحت ایک ایسی حکومت کے قیام کا تصور کرتی تھی جو برطانیہ کے ماتحت ہو''،[3] اس جماعت کے سربراہ مولانا حسین احمد مدنیؒ ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''کوئی مسلمان ایسا نہیں جو مسلم راج کا طالب اور خواہشمند نہ ہو''[4]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خواہش تو مولانا مدنیؒ کی بھی تھی، لیکن وہ ہندوستان کے تاریخی، جغرافیائی اور اس وقت کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر اس مطالبہ کو نادرست مانتے تھے۔ انہیں مسلم لیگ کے قائدین پر قطعاً بھروسہ نہیں تھا[5] کیونکہ وہ ۳۶ء میں الیکشن کے موقع پر جمعیۃ علماء ہند سے اتحاد کر چکے تھے اور جب جمعیۃ علمائے ہند کی کوششوں سے مسلم لیگ کے نمائندے صوبائی اسمبلیوں میں پہونچ گئے تو اس کے بعد مسلم لیگ نے جمعیۃ کو دھوکا دیکر اس اتحاد کو توڑ دیا تھا[6] اس لئے انہیں مسلم لیگ کے اس وعدے پر قطعی بھروسہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد خالص اسلامی حکومت قائم کرے گی، حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے کانگریسی مسلم علماء کے یہ خدشات کافی حد تک درست ثابت ہوئے لیکن سادہ لوح تھانوی گروپ کے مسلم علماء مسلم لیگ سے توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے۔ اسی جماعت تھانوی کے مشہور عالمِ دین علامہ شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کی میرٹھ کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''میں تمام ذمہ دار قائدین کو ایک ادنی خادم کی حیثیت سے نہایت پر زور طریق پر دعوت دیتا ہوں کہ خود

---

(۱) مجاہدِ ملت کے چند کارنامے/ مولانا محمد میاں/ الجمعیۃ، دہلی: مجاہدِ ملت نمبر،۱۹۶۲ء/ص:۵۷۔

(۲) تحریکِ پاکستان میں علمائے دیوبند کا کردار (ماہنامہ ''الفاروق''، کراچی، جمادی الاخری،۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۸ء/ص:۲۰۔

(۳) تذکرہ شیخ مدنی/ مولوی راشد حسن عثمانی/ راشد کمپنی، دیوبند ۱۹۷۷ء/ص:۱۶۹۔

(۴) مکتوبات شیخ الاسلام/ نجم الدین اصلاحی/ مطبع معارف، اعظم گڑھ ، ۱۹۵۲ء / ج:۱/ص:۴۱۹۔

(۵) تاریخ جمعیۃ علمائے ہند/ اسیر ادروی/ الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی/ ج:۱/ص:۲۸۳۔

(۶) مکتوبات شیخ الاسلام/ ج:۱/ص:۲۸۳۔

اپنے اعلان کردہ الفاظ کے مطابق قرآنی احکام کی سرّ اً وعلانیۃً پابندی فرمائیں‘‘۔[۱]

خود مولانا کا کہنا یہ تھا کہ ’’کم از کم ان صوبوں کو جہاں مسلم اکثریت ہے اسلامی سلطنت بنالینا کہ وہاں اسلامی سلطنت اسلامی اصولوں پر قائم کی جاسکے، لازم اور ضروری ہے‘‘۔[۲]

چنانچہ آپ کی ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو، جناح صاحب سے جو ملاقات ہوئی اس میں بھی جناح صاحب سے پاکستان میں آئینِ اسلامی ہونے کا اعلان کرنے کو کہا تھا ان حوالہ جات سے اتنا تو لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ علماء کا یہ طبقہ مسلم لیگ کی حمایت، حکومتِ اسلامی کے قیام کی غرض سے مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کر رہا تھا۔ اور مسلم لیگ کا پاکستان بنانے کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو، اس وقت تک اپنے کو لیگ مذہبی جماعت کے روپ میں پیش کر رہی تھی، پاکستان بننے کے بعد اگرچہ علمائے کرام کا یہ خواب آج تک بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا (جو بحث کا الگ موضوع ہے، اس پر آئندہ صفحات میں طالب علمانہ بحث کی جائے گی)۔ لیکن پاکستان کسی نہ کسی طرح وجود میں آ ہی گیا۔ تقسیم چونکہ مسلم اکثریتی صوبوں کے مطالبہ پر ہوئی تھی اس لئے پاکستان پہلے ہی دن سے دو جداگانہ حصوں میں وجود میں آیا، ایک حصہ مغربی پاکستان اور دوسرا حصہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کہلایا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کو مغربی پاکستان کی اس وقت کی راجدھانی کراچی میں پرچم کشائی کی رسم ادا کرنیکی خدمت سونپی گئی اور مولانا جو اس وقت مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے) کے ہاتھوں سے ان کی خدمات کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان کی راجدھانی ڈھاکہ میں پرچم کشائی کی رسم سرکاری حکم کے بموجب ادا کرائی گئی۔[۳]

پاکستان بننے کے بعد مولانا نے جمعہ کے خطبہ سے پہلے (یہ جمعۃ الوداع تھا) لال باغ، ڈھاکہ کی جامع مسجد میں تقریر فرمائی جس میں مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین بھی موجود تھے۔ اس میں بھی مولانا نے اربابِ حکومت کو تلقین کی کہ وہ آئین و دستور اسلام نافذ کریں اور عوام، صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ تمام شعائرِ اسلام کی پابندی کریں، پاکیزہ اسلامی معاشرہ قائم کریں۔ پاکستان کو شراب خانوں، قحبہ خانوں، اور سود وغیرہ کی لعنت سے پاک کریں۔[۴]

پاکستان بننے کے بعد مولانا کی سیاسی حیثیت و مرتبہ متعین کرنے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی گفتگو اس امر پر کر لی جائے کہ مولانا اور ان کے رفقاء نے تشکیلِ پاکستان کی حمایت جس نظریہ کے تحت کی تھی وہ کامیاب ہوا یا نہیں؟ اگر کامیاب نہیں ہو پایا تو اس کی وجوہات کیا رہیں؟۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاکستان کے مطالبہ کی حمایت میں مسلم لیگ کا ساتھ دینے والے علماء کرام

---

(۱) حیاتِ عثمانی / پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی / مکتبہ دار العلوم، کراچی، ۱۴۰۵ھ - ۱۹۸۵ء / ص: ۵۰۷۔

(۲) تذکرۃ الظفر / ص: ۳۷۴۔

(۳) ایضاً / ص: ۳۸۸، و ماہنامہ ’’الفاروق‘‘ کراچی؛ جمادی الاخری ۱۴۱۸ھ - اکتوبر ۹۷ء / ص: ۱۴۔

(۴) تذکرۃ الظفر / ص: ۳۸۹۔

ملت کے تئیں بھی مخلص تھے اور اسلام کیلئے بھی۔ ان کا واحد مقصد یہی تھا کہ کسی بھی طرح ہم ایسی حکومت قائم کرنے میں ممد و معاون ہوں جو اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کرے۔ جہاں صاف ستھری اسلامی ریاست ہو، لیکن یہ بھی حق ہے کہ علماء کا یہ طبقہ سیاست سے نابلد سیاسی مکر وفریب سے ناآشنا اور سیاست کے اوچھے ہتھکنڈوں سے ناواقف تھا۔ اس کے بالمقابل علماء کا وہ طبقہ جو متحدہ قومیت کا حامی تھا وہ کسی حد تک سیاسی داؤ پیچ سے واقف ضرور تھا لیکن کانگریس کے آگے مجبورِ محض تھا، ان حضرات کے اخلاص کا فائدہ کانگریسی اور مسلم لیگی سیاسی طالع آزماؤں نے بھرپور اٹھایا۔ مسلم لیگ نے مذہبی حکومت کے نشہ میں ان مخلصین کو مسرور و سرشار کر کے اپنا مطلب نکالا تو کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد کی آڑ لے کر اپنے حامی علمائے کرام کو آگے رکھا اور پیچھے سے اس نے ہندو مہا سبھا، اور اس جیسی ذہنیت کے افراد کو بھرپور تعاون دیا۔ اس طریقہ پر علماء کے دونوں طبقوں میں جو خلیج واقع ہوئی وہ بُعد المشر قین کے مانند تھی۔ اور ان حضرات کے اختلافات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر شریعت کے حوالوں سے گفتگو کی جا رہی تھی جس کی وجہ سے تقریباً ہر خاندان میں تفریق واقع ہوگئی تھی جو انگریز اور ہندو مہا سبھا کا مقصد تھا وہ ان حضرات کے ''اخلاص'' کی آڑ میں پورا ہو رہا تھا۔

جمعیۃ علماء ہند جو ہندوستان میں مسلمانوں کو ثابت قدمی کے ساتھ رہنے کی تلقین اور اصرار کر رہی تھی مسلم لیگ کو مسلمانوں کا مخلص تصور نہیں کرتی تھی اور اس حد تک جا پہونچی تھی کہ دہلی کے ایک جلسہ میں جس میں ہندوستان کے تمام مشہور لیڈر، مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، موتی لال نہرو وغیرہ جمع تھے۔ جمعیۃ نے کئی روز کی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصل کر دیا کہ مسلمان ''بلاشرط کانگریس میں شریک ہو جائیں جس کی مخالفت مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھرپور انداز میں کی۔ مولانا شبیر احمد صاحب کا کہنا تھا کہ ''اگر ہم بلاشرط شرکت کے فیصلہ کو مان لیں گے تو ہماری قومیت فنا ہو جائے گی''۔ (۱) بالآخر اسی وجہ سے انہیں جمعیۃ سے کنارہ کشی اختیار کر کے مسلم لیگ میں جانا پڑا اور وہ تحریکِ پاکستان کے مضبوط کارکن ہو گئے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا دونوں کو انگریز کے پروردہ تصور کرتے تھے۔ اس کے لئے ان کے پاس دلیل تھی کہ دونوں کی بنیاد کانگریس کے مقابل ۱۹۰۶ء ڈالی گئی۔ جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنا تھا۔ کیونکہ انگریز ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر شروع سے گامزن رہا ہے۔ (۲) اور اسی وجہ سے اس نے یہ دونوں تنظیمیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی کی ہیں۔

کانگریس اور لیگ کے تنازعہ کا ایک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے مسلمانوں کے گھروں میں تفریق پیدا کر دی تھی۔ کسی گھر کا ایک فرد کانگریسی نظریات سے وابستہ تھا تو دوسرا بھائی لیگ کا حمایتی۔ اس لئے اتحاد کی کوئی سبیل نکلنے کے امکانات

---

(۱) تجلیاتِ عثمانی / انوار الحسن شیر کوٹی / نشر المعارف، ملتان؛ دسمبر ۱۹۵۷ء / ص: ۶۵۹ - ۶۶۰۔

(۲) مکتوباتِ شیخ الاسلام / ج: ۲ / ص: ۸۶۔

معدوم ہو چکے تھے۔عوام وخواص سبھی اس ذہنی کشمکش کا شکار تھے کہ ان کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ وابستہ رہے گا یا پاکستان کے ساتھ؟ ہندوستان مادرِ وطن تھا اس کے ساتھ قومی جذبات وابستہ تھے تو پاکستان کو مذہبی ریاست بنانے کے خواب دکھا جانے کے باعث مذہبی جذبات پاکستان کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔مولانا اشرف علی تھانوی جیسے جید عالم دین بخوبی جانتے تھے کہ (تقسیم کے بعد) جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق وفاجر سمجھتے ہیں۔[1] اسی لئے وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ یہی لوگ جو مسلم لیگ کی سیاست کے افق پر چھائے ہوئے ہیں وہی دیندار بن جائیں [2] تا کہ پاکستان کا نظام دیندار ہاتھوں میں آسکے۔غالباً اسی وجہ سے ان کے جاں نثار شاگرد مطالبۂ پاکستان کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر تشکیلِ پاکستان کے منتظر تھے۔اسے ہم سیاسی طور پر کچھ بھی کہیں لیکن ان کے اخلاص، للّٰہیت اور دینی حمیت وغیرت کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ حضرات محض رضائے الٰہی کی خاطر اس جنگ کو لڑ رہے تھے اور اپنوں و غیروں کی مخالفت گوارا کر رہے تھے۔

چنانچہ مسلم لیگ کے قائدین کو دین کی طرف کرنے اور انہیں شعائرِ اسلام کا پابند کرنے کے لئے مولانا تھانویؒ نے مختلف اوقات میں جناح صاحب کی خدمت میں تبلیغی وفود روانہ کئے۔اس سلسلہ کا پہلا وفد ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو (جب کہ مطالبۂ پاکستان مسلم لیگ نے پیش نہیں کیا تھا) مولانا مرتضی حسن صاحب کی قیادت میں مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس میں پہونچا جس میں ان حضرات کو نماز کی تبلیغ کی گئی [3] اس اجلاس میں مولانا تھانوی نے جو تاریخی بیان بھیجا اس کو عام اجلاس میں پڑھ کر سنانے کی خدمت مولانا ظفر صاحبؒ نے انجام دی۔اسی موقع پر آپ نے قائدِ اعظم سے ملاقات کر کے مسلم لیگ میں مذہب کو شامل کرنے کی تلقین کی۔ پہلے تو قائدِ اعظم نے تردد ظاہر کیا لیکن مولانا کے استدلالات سے متاثر ہو کر پٹنہ اجلاس میں یہ اعلان کر دیا کہ اسلام عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور سیاست کا مجموعہ ہے اس لئے سیاست کے ساتھ مذہب کو بھی لینا چاہئے''۔[4]

دوسری تبلیغی ملاقات ۱۲ر فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی کے اجلاس مسلم لیگ دہلی کے موقع پر پھر مذہب وسیاست کی گفتگو ہوئی اس موقع پر بھی مولانا ظفر احمد عثمانی شریکِ وفد تھے۔[5]

اس کے بعد بھی مولانا ظفر صاحب کی قائد اعظم سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔جن میں وہ مسلم لیگ کے قائدین

---

(۱) حیاتِ امداد/ انوار الحسن شیرکوٹی/ مدرسہ اسلامیہ عربیہ، نیوٹاؤن، کراچی ۱۹۶۵ء/ ص:۲۴۔

(۲) ایضاً/ ص:۲۴۔

(۳) حیاتِ امداد/ ص:۲۵۔

(۴) تذکرۃ الظفر/ ص:۳۶۶ - ۳۶۷۔

(۵) حیاتِ امداد/ ص:۲۵۔

کو مذہب کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حضرات کے پیشِ نظر پاکستان بننے کا مقصد دین پر مضبوطی، اور شریعتِ اسلامیہ پر گامزن رہنا رہا، اسی لئے انہوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی۔

ان کے برخلاف علمائے کرام کا وہ طبقہ جو انہیں ہندستان میں رہنے پر اصرار کر رہا تھا، ان کے ملتِ اسلامیہ کے تئیں مخلص ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس جماعت کی قیادت جمعیۃ علماء ہند کر رہی تھی، جو ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کے ساتھ انتخابی سمجھوتہ بھی کر چکی تھی، لیکن بعد میں جمعیۃ علمائے ہند سے لیگ کے قطعِ تعلق کر لینے پر برگشتہ تھی۔ اسی لئے وہ مسلم لیگ کو مخلص تصور نہیں کرتی تھی، بلکہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ مسلم لیگ کے عہدیداروں کا مقصد صوبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتوں پر دست درازی اور قبضہ کرنا ہے۔[1] جہاں تک جمعیۃ علماء کا کانگریس کا ساتھ دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں جمعیۃ کے قائد مولانا حسین احمد مدنیؒ کا کہنا تھا کہ (کانگریس کیساتھ) جمعیۃ علماء ہند سیاسی اور اور آزادی کی جدوجہد میں صرف اشتراکِ عمل کر رہی ہے، کسی غیر مسلم جماعت یا غیر مسلم قائد کی آنکھ بند کر کے تابعداری نہیں کر رہی ہے''۔[2] حالانکہ مسلم لیگی علماء کی یہ سوچ غلط نہیں تھی کہ جمعیۃ علماء ہند پوری طرح کانگریس کے تابع تھی اور وہ متحدہ قومیت کی علم بردار تھی جو ایک غیر اسلامی نظریہ ہے، اسی وجہ سے مولانا اشرف علی تھانوی نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں چلنے والی تحریک خلافت وتحریک موالات کی باوجودے کہ تمام علماء کو اس کی مخالفت میں تردد تھا، کھل کر مخالفت کی تھی۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم تحریک خلافت کے مخالف فتوے کو مولانا ظفر احمد عثمانی کی تصنیف بتا رہے تھے جس کا اظہار انہوں نے دیوبند کے ایک جلسۂ عام میں برسرِ منبر کیا تھا[3] اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ''یہ فتوی مولانا ظفر عثمانی نے اس لئے دیا کہ ان کے والد (شیخ عبد اللطیف) عیسائی ہو گئے تھے''۔[4] ان سطور کا مقصد یہ ہے کہ مولانا تھانویؒ اور دوسرے علماء مسلم لیگ کانگریس کے خلاف اس قدر سخت موقف اختیار کئے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کے معاملات میں انہیں کانگریس سے اشتراک تک گوارا نہیں تھا اور جمعیۃ علماء ہند کانگریس کی مرضی ومنشاء کے بغیر ایک قدم بھی چلنے کو تیار نہیں تھی، اس لئے ان دونوں نظریات میں اتحاد کی کوئی راہ نکلتی

---

(۱) مکتوباتِ شیخ الاسلام/ ج:۱، ص:۲۸۲۔

(۲) ایضاً/ ج:۱، ص:۴۲۳۔

(۳) کہاں سے چلے تھے؟/ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ہفت روزہ عزائم، لکھنؤ کا خاص نمبر: ''جدوجہد آزادی اور اس کے بعد'': دسمبر ۱۹۷۳ء۔

(۴) ایضاً / ص:۱۰۹۔ نوٹ: مفتی عتیق الرحمان عثمانی مرحوم ایک معتبر عالم دین کی حیثیت سے متعارف رہے ہیں۔ ان کے اس بیان میں جذبات سے مغلوبیت کا اظہار ہے، ورنہ شیخ عبد اللطیف صاحب کے متعلق ہم ابتداء میں عرض کر چکے ہیں کہ وہ عیسائی نہیں ہوئے تھے، بلکہ انگریزی تعلیم کے دلدادہ ہونے کے باعث اور مشینری اسکول آگرہ میں فارسی مدرس ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کے سخت گیر مزاج رکھنے والے حضرات نے ان کے خلاف یہ مشہور کر دیا تھا۔ ان کے عیسائی ہونے کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں ہے، ان کے خاندان کے افراد کے بموجب وہ عبادت گذار، تہجد تک کے پابند تھے۔ ان کا انتقال آگرہ میں ہوا اور وہیں دفن کئے گئے۔ انکی انگریزی پسندی کی وجہ سے دیوبند اور اپنے تمام خاندان سے ان کے مراسم منقطع رہے، اسی وجہ سے ان پر عیسائیت کا داغ لگا۔ واللہ اعلم۔

ممکن نہیں تھی۔

اب جب کہ ان واقعات کو نصف صدی سے زائد عرصہ گذر چکا ہے یہ حقائق سامنے آگئے ہیں کہ دونوں طبقوں کے علماء میں اخلاص تو تھا لیکن وہ ان سیاسی حالات کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر رہے۔ کیونکہ کانگریس کے ہم نوا علماء نے اس کانگریس پر توکل و بھروسہ کیا جو ہندو مہاسبھا کے زیرِ اثر تھی، گاندھی اور نہرو بھلے ہی سیکولر نظریات کے حامی رہے ہوں، لیکن اسی کانگریس کے اہم عناصر سردار ولبھ بھائی پٹیل، پرشوتم داس ٹنڈن اور گووند بلبھ پنت جیسے متعصب حضرات بھی تھے جو کسی بھی طرح مسلمانوں کے وجود کو ہندوستان کے لئے گوارا ہی نہیں کرتے تھے، ان کی مسلم مخالف ذہنیت نے انکے چہرے پر پڑی ہوئی سیکولرزم کی نقاب اتار دی تھی۔ بھلے ہی جمعیۃ علماء نے اس ذہنیت پر احتجاج کیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ آہستہ آہستہ کانگریس ہندووانہ خیالات وتصورات کو بروئے کار لا رہی تھی اور اس نے واردھا اسکیم، ودھیا اسکیم اور دیہات اسکیم کے نام سے ایسے قوانین وضع کر لئے تھے، جن کا سیاست اور آزادی کے مطالبہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کی ہر قوم کو ہندووانہ رنگ میں رنگنے اور ہندووانہ طرزِ معاشرت کا عادی بنانا تھا،[1] لیکن چونکہ جمعیۃ کانگریس کی شریک جماعت تھی اس لئے وہ اس کے دور رس اثرات پر غور نہیں کر رہی تھی اور کانگریس کے ساتھ مخلصانہ اتحاد کی روش پر قائم تھی ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے ہولناک مسلم کش فسادات نے مسلم لیگی علماء کے اس نظریہ کی تصدیق کر دی تھی کہ "اس اشتراک کے نتائج وعواقب مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوں گے، بلکہ معاملہ برعکس ہوگا"۔[2]

دوسری طرف وہ علماء کرام جو مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کا معاملہ کر رہے تھے وہ بھی مخلص تو تھے لیکن یہ حضرات بھی مکر وفریب کی سیاست کے شکار ہو گئے۔ وہ اپنی کامیابی کی معراج ایسی باتوں کو مان رہے تھے کہ جو صرف ظاہری تھیں، مثلاً مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں مولانا ظفر احمد صاحب کی نماز کے لئے تلقین اور اسکے نتیجہ میں مسلم لیگ کا اجلاس نماز کے لئے ملتوی کر دینا اور پھر قائدِ اعظم سمیت تمام لوگوں کا نماز باجماعت ادا کرنا[3] کامیابی کی معراج تصور کیا جا رہا تھا اور یہ سوچا جا رہا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں کے احکامات اسلامی ہوں گے۔ یہ سب خیالِ خام ثابت ہوا۔ پاکستان بننے کے ترپین سال گذر جانے کے باوجود آج تک مسلمانوں کی حکومت کے باوجود دستورِ اسلامی کا نافذ نہ ہونا اس بات کے واضح دلائل ہیں کہ قائدینِ مسلم لیگ نے اپنے علمائے کرام کو مغالطہ میں مبتلا رکھا۔ اور سیاسی مصلحتوں کی خاطر وقتی طور پر نماز کا بھی اہتمام کیا گیا اور جماعت کا بھی لیکن چونکہ ان کا ذہن اسلامی مملکت کے تصور سے عاری تھا اس لئے آج تک یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۳۶۱۔

(۲) ایضاً/ص:۳۶۰۔

(۳) ایضاً/ص:۳۶۷۔

ہوسکا۔اور آج اس مملکتِ خداداد کے جو جو اندرونی حالات ہیں وہ ہمہ وقت ہم سب کے سامنے ہیں۔اس لئے اگر علماء کرام اس وقت قیادت اپنے ہاتھ میں رکھتے تو بہت ممکن تھا کہ دنیا میں پاکستان کی وہ تصویر نہ ہوتی جو آج دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اقتدار کے حکمراں افراد اسلامی مملکت کا تصور تو کجا انسانی مملکت کو بھی خواب وخیال بنائے ہوئے ہیں، اور اکثریت و بیشتر مخلص علمائے کرام اس حسرت میں دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں (اللہ انکی قبروں کو نور سے بھرے) اور جو باقی بچے وہ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، اور اسلامی دستور ساز کمیٹی یا ریاست اسلامی کی تشکیل تو کیا ہوتی اسلام کے بتائے ہوئے راستوں پر انفرادی یا اجتماعی زندگی بھی مشکل سے نظر آتی ہے۔ نتیجۃً پاکستان وہ پاکستان نہیں بن سکا جس کے تانے بانے خواب وخیال میں ہمارے علمائے کرام مثلاً ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبدالکریم گمتھلوی اور مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی جیسے جید علماء نے بنے تھے، ان حضرات کی نیت میں اخلاص تھا۔اور انہیں یہ امید نہیں تھی کہ مذہب کے ساتھ بھی سیاسی حضرات ایسا مذاق کر سکتے ہیں۔

ان علمائے کرام نے اپنا سیاسی قائد (قائدِ اعظم) محمد علی جناح کو بنایا اور ان سے یہ توقعات وابستہ کیں کہ وہ مذہبی میدان میں ان کا اتباع کریں گے[1] حالانکہ محمد علی جناح سیاست کو شطرنج سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن سیاسی شطرنج کو انصاف کے ساتھ کھیلنے کے قائل تھے[2] وہ اسلامی نظامِ حکومت میں ملائیت کے قائل نہیں تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی بطور ایک نظریہ نظام مغرب ہی کی پیداوار ہے، اسلام میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔[3]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو کہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے خوہشمند تھے انہیں مسلم لیگ سے یہی شکایت تھی کہ مسلم لیگ اور اس کے ذمہ دار قائدین میں سے کسی کی تقریر میں اس وقت (۱۹۴۱ء) تک یہ بات واضح نہیں کی گئی تھی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت کا قیام تھا جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔[4] اسی وجہ سے وہ مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان سے اس شکل میں پوری طرح اتفاق نہیں رکھتے تھے اور ۱۹۴۵ء کے الیکشن کے موقع پر انہوں نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ ''ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا بھی اثر ہماری قوم پر پڑتا ہو بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ایمان

---

(۱) تذکرۃ الظفر ۔ص: ۳۹۲

(۲) دائرۂ معارف اسلامیہ اردو/ دانش گاہ پنجاب، لاہور؛ اگست ۸۶ء/ ج:۱۹؛ ص:۴۸۶۔

(۳) ایضاً / ج:۱۹؛ ص:۴۸۷۔

(۴) مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حاشیہ) (ترجمان القرآن، پٹھانکوٹ؛ طبع دوم؛ جون ۴۲ء / ابوالاعلیٰ مودودی/ ج:۳؛ ص:۱۰۶۔

لائے ہیں۔[۱] حالانکہ صاحبِ تذکرۃ الظفر نے مودودی صاحبؒ کے اس اقتباس کو دوسرے معنی میں پیش کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحبؒ کے ان اقتباسات سے اتنا تو واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس جمہوریت کے قائل نہیں تھے جس کی دعویداری مسلم لیگ کررہی تھی، بلکہ وہ خالص نظریاتی اسلامی حکومت کے قیام کی خواہش رکھتے تھے اسی لئے وہ کسی سیاسی جماعت کے نظریات سے اتنے زیادہ متاثر نہیں تھے کہ اسلامی اقدار واصول کو قربان کردیں۔ چنانچہ انہوں نے دیگر معاصر علمائے کرام کی طرح مسلم لیگ یا اس کے قائدین کی آنکھ بند کرکے تقلید نہیں کی۔ دیگر علمائے کرام نے اس وقت صرف مطالبۂ پاکستان پیش نظر رکھ کر یہ سوچا تھا کہ بعد میں ہم اپنے ورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے مملکتِ اسلامیہ پاکستان کا دستور اسلامی بنوالیں گے لیکن جب تشکیل پاکستان کے چھ ماہ سے زائد عرصہ گذر جانے کے باوجود وہاں اسلامی آئین نافذ نہیں ہوئے تو ان حضرات کو اس کا احساس بھی ہوا۔ مارچ ۴۸ء میں جب قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل مشرقی پاکستان کے دورے پر گئے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے ملاقات کرتے ہوئے جس شکایتی لہجہ میں قائدِ اعظم کو مخاطب فرمایا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے صالح جذبات کی قدر پاکستانی حکمرانوں نے نہیں کی۔ آپ نے فرمایا کہ ”اب تک (پاکستان میں) آئینِ اسلام بھی جاری نہیں ہوا، جس کا وعدہ ہم نے قوم سے کیا تھا اور اسی وعدہ کی بناء پر یو، پی اور بہار وغیرہ کے مسلمانوں نے پاکستان کیلئے ووٹ دیے تھے[۲] پھر دوسری ملاقات میں مولانا ظفر صاحب نے اس وعدہ کی طرف توجہ دلائی کہ ”آپ نے حصولِ پاکستان سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ دستورِ پاکستان کتاب وسنت کے موافق ہوگا۔ یہ وعدہ جلد پورا کیا جائے“۔[۳] قائد اعظم نے اطمینان دلایا لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بہر حال ہونا یہ چاہیے تھا کہ تمام علمائے کرام (بشمول کانگریس ومسلم لیگ) اپنے اپنے نظریات پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے اخلاص کیساتھ مل بیٹھ کر محض رضائے خداوندی کی خاطر ملتِ اسلامیۂ ہند کے لئے کوئی ایسی راہ نکالتے جس میں ان کی عزت ووقار کا تحفظ بھی ہو اور ان کی شخصیت ومعاشرت میں بھی سدھار ہوسکے۔ اگرچہ کہنے کو ان اکابرین کی کئی بار میٹنگیں ہوئیں لیکن چونکہ ہر دو فریق کے ذہن میں ضمناً یہ خواہش رہتی تھی کہ ”فریقِ مخالف کو اپنے نظریات کا قائل کرلیا جائے“، اسی لئے وہ عقلی ونقلی دلائل سے دوسرے کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ کسی بھی فریق کے اپنے نظریہ سے نہ ہٹنے کے نتیجہ میں جو کچھ سامنے آیا، اس کی گواہ اگرچہ یہ نئی نسل نہیں ہے تاہم تواتر کے ساتھ نفرت وعداوت کی جو کہانیاں اس نسل تک پہونچی ہیں وہ انتہائی

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۳۱۳۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ص:۳۹۲۔

(۳) ایضاً/ص:۳۹۲۔

تکلیف دہ ہیں اور ہندوستان میں رہنے والے محبِ وطن افراد فرقہ پرستوں اوران کے سیاسی رہنماؤں کی بدولت جن تکلیف دہ حالات سے گذرنا پڑا ان کا تذکرہ بھی لرزہ خیز ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری ہی ہے۔ یقینی بات ہے کہ اگر برِ صغیر کی ملتِ اسلامیہ منتشر نہ ہوئی ہوتی اور کسی طرح سمجھوتہ کی راہ نکالی لی جاتی تو آج کے حالات دگرگوں ہوتے۔ یہ صرف اپنا خیال ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم مذہبی طبقہ کے دونوں گروہوں (ہندنواز اور پاک نواز) نے ہی اخلاص کے ساتھ اپنی سیاسی کوششوں کو عمل جامہ پہنایا لیکن سیاست سے وابستہ دونوں فریق (کانگریس اور مسلم لیگ) نے ان مخلص ترین بندگانِ خدا کا استحصال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، لیکن یہ سب مقدرات تھے، جن پر افسوس کے سوا کچھ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور افسوس بھی کارآمد نہیں ہوسکتا، اس لئے اب اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہوئے مولانا ظفر احمد صاحب کی ان سیاسی خدمات کا جائزہ لینا ہے جوانہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد انجام دیں۔

تیسری فصل: مولانا ظفر احمد عثمانی کی قومی وسیاسی خدمات

(قیامِ پاکستان کے تناظر میں)

۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشہ پر وجود میں آ گیا جو دو حصوں میں تھا۔ایک حصہ مشرقی پاکستان کہلایا اور دوسرا حصہ مغربی پاکستان۔مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی راجدھانی ڈھاکہ تھی اور مغربی پاکستان کی راجدھانی کراچی۔ڈھاکہ میں سرکاری طور پر رسمِ پرچم کشائی مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے انجام دی اور کراچی میں یہ رسم علامہ شبیر احمد عثمانی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔اس طریقہ پر عملاً یہ دوجدار یاستیں اسلام کے نام پر متحدہ پاکستان کی شکل میں ایک کہلائیں۔ اب سب سے بڑا مسئلہ پاکستان کی دستور سازی کا تھا۔علمائے کرام نے اخلاص کے ساتھ مسلم لیگ کا ساتھ اس شرط پر دیا تھا کہ یہ خالصۃً اسلامی ریاست ہوگی ،جس کا دستور، آئین اور قوانین شریعتِ اسلامیہ کے ماتحت ہوں گے۔مسلم لیگ کے قائدین نے روزِ اول سے سلطنتِ اسلامیہ کے سبز باغ دکھلا کر عوام کو مطالبۂ پاکستان کے لئے ہم نوا کیا تھا۔اور متحدہ قومیت سے اسی وجہ سے اختلاف کیا تھا کہ وہ اسلامی نظریہ کے خلاف تھا۔

پاکستان بننے کے بعد علمائے کرام کا یہ مخلص طبقہ پہلے تو انتظار کرتا رہا کہ شاید اربابِ حکومت از خود اس طرف متوجہ ہوں لیکن جب انہوں نے اصحابِ اقتدار کے کانوں پر جوں رینگتی نہ دیکھی تو انہوں نے اس کے لئے تحریک چلائی۔مولانا ظفر احمد صاحب بسلسلۂ ملازمت ڈھاکہ میں ہی مقیم تھے اس لئے انہوں نے مشرقی پاکستان میں اس تحریک کی باگ ڈور سنبھالی وہ اسلامی آئین کے حق میں فضا تیار کرتے رہے اور رائے عامہ ہموار کرتے رہے۔اس کے لئے علامہ شبیر احمد عثمانی نے بھی مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور چھوٹے بڑے اجلاس کو خطاب کیا۔ان جلسوں کا مقصد، ان قراردادِ مقاصد کو منظور کرانا تھا جن کی رو سے پاکستان کو آئینِ اسلامی کا پابند بنانا تھا۔اور یہ کوششیں تقسیم ہند سے قبل جاری تھیں لیکن اب ان میں تیزی اس لئے لانی پڑی کہ حکومت وعدوں کے باوجود اس کا ایفاء نہیں کر رہی تھی ۔مولانا ظفر صاحب کی جناح صاحب سے تقسیم سے قبل جتنی دفعہ بھی گفتگو ہوئی تھی ان میں یہی موضوع سرِ فہرست تھا۔مولانا شبیر احمد عثمانی ،مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، مفتی محمد شفیع عثمانی، مولانا شبیر احمد تھانوی وغیرہم بھی جناح صاحب کو بار بار یاد دہانی کرا چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں محمد علی جناح صاحب نے جب مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو اس موقع پر بھی مولانا ظفر صاحب نے جناح صاحب کی توجہ اس طرف دلائی تھی ،جب گفتگو سے یہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آیا تو عوامی بیداری مہم کے تحت جگہ جگہ اجلاس منعقد کرائے گئے ۔ کیونکہ ۱۹۴۸ء میں محمد علی جناح کی وفات کے بعد یہ معاملہ سرد خانہ میں جا رہا تھا،اور پاکستان کی تخلیق کے بعد اس کا حکمراں طبقہ اتنی سی بات سے مطمئن تھا کہ پاکستان کی اپنی ایک خارجی اسلامی ہیئت موجود ہے،لیکن اس کی حکومت ان ہی خطوط پر چلائی جا رہی تھی جو برطانوی ہند کے

دنیوی اسالیب سے حتی الامکان قریب ترتھی[1] لیاقت علی خاں مرحوم (وزیرِ اعظم، پاکستان) نے مارچ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ان قرار دادِ مقاصد کو منظور کرالیا لیکن ۱۹۵۰ء میں انہوں نے جو دستور پیش کیا اسے پاکستان کی ملت اسلامیہ نے نامنظور کردیا اور اس پر علماء کی طرف سے زبردست احتجاج ہوا۔ جس میں مولانا ظفر احمد عثانی بھی پیش پیش تھے،[2] لیاقت علی خاں کی شہادت (۱۹۵۱ء) کے بعد یہ معاملہ پھر سرد خانہ میں جاتا نظر آنے لگا۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر ایک نظر قرار دادِ مقاصد اور آئین اسلامی پاکستان پر ڈال لی جائے جو ان علمائے کرام کی دن رات کی محنتوں وکاوشوں سے مرتب کئے گئے تھے۔

جس وقت پاکستان بنا تو اس وقت وہاں پر حکومتِ برطانیہ کا تیار کردہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (ان ترمیمات کے ساتھ جو قیامِ پاکستان کے ساتھ عمل میں لائی گئیں تھیں) رائج تھا۔ یہ پاکستان کا پہلا آئین قرار دیا گیا،[3] یہ ایکٹ بنیادی طور پر ایک خودمختار جمہوری مملکت کا آئین نہیں تھا، بلکہ اسے برطانوی حکومت نے اپنے ماتحت ایک علاقے پر حکومت کرنے کے لئے وضع کیا تھا،[4] ۱۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان اسمبلی میں آئندہ آئین کے متعلق قراردادِ مقاصد منظور کی؛ جس میں پاکستان کا دستور قرآن اور سنت کے مطابق بنانے کا عہد کیا گیا تھا۔ اس قرارداد مقاصد کے مندرجات میں تھا کہ: (۱) اللہ کی حاکمیت اور اس کے مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے اہلِ پاکستان اقتدار کا استعمال کریں گے۔ (۲) پاکستان ایک ایسی جمہوری مملکت ہوگی، جس میں ریاست اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔ (۳) سب لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی، مساوات، رواداری اور معاشرتی عدل کے اسلامی تصورات پیش نظر رکھے جائیں گے۔ (۴) اور پاکستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنادیا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اپنی زندگی کتاب وسنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں،[5] جیسی دفعات بھی شامل تھیں۔

۱۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں (وزیرِ اعظم، پاکستان) نے قراردادِ مقاصد کو اسمبلی میں پیش کردیا جسے منظور کرلیا گیا، لیکن اسے نافذ کرنے کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) مقرر کی گئی۔

لیاقت علی خاں ۱۷/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو قتل کردئے گئے۔ ان کے بعد خواجہ ناظم الدین کو (جو اب تک محمد علی جناح کی وفات کے بعد سے پاکستان کے گورنر جنرل تھے)، پاکستان کے وزیرِ اعظم اور ملک غلام محمد گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

---

(۱) ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت/ پروفیسر عزیز احمد، (اردو ترجمہ: جمیل جالبی)/ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء/ ص:۳۳۹۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ ص:۳۹۶۔

(۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ/ دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۱ء/ ج:۵، ص:۴۵۹۔

(۴) ایضاً/ ج:۵، ص:۴۵۹۔

(۵) ایضاً/ ج:۵، ص:۴۶۰۔

خواجہ ناظم الدین ایک نیک دل مسلمان تھے اور نرم مزاج تھے۔ ان کے عہد میں آئین سازی کی رفتار سست پڑگئی۔[۱] اس وقت مولانا ظفر احمد صاحب مرحوم نے پھر ان حضرات کو اس طرف توجہ دلائی۔ ۱۹۵۲ء میں ملک غلام محمد صاحب ڈھاکہ گئے تو اس موقع پر بھی مولانا ظفر احمد صاحب نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ان سے ملاقات کی اور دستورِ اسلامی جلد سے جلد نافذ کرنے پر زور دیا،[۲] آپ نے حکومت کی سرد مہری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا کہ ''حکومت اپنے ان وعدوں کو یاد کرے جن کی بنیاد پر تخلیقِ پاکستان عمل میں آئی۔ پاکستان بننے سے پہلے بار بار کہا گیا تھا کہ دستورِ پاکستان اور آئین، قرآن اور نظامِ اسلامی کے مطابق ہوگا''۔[۳] بالآخر ۲۲؍دسمبر ۱۹۵۲ء کو خواجہ ناظم الدین نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کردی، جس میں سفارش کی گئی تھی کہ مرکز میں دوایوانی مقننہ قائم کی جائے، علماء کا ایک بورڈ بنایا جائے جو یہ دیکھے کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے بنائے ہوئے قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اور کابینہ صرف ایوان نمائندگان کے سامنے جوابدہ ہو[۴] اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ کی تحریک پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو کراچی میں جمع کیا گیا جس میں مولانا ظفر احمد صاحب (بحیثیت صدر جمعیۃ علمائے اسلام، پاکستان) شریک ہوئے۔[۵]

۱۷؍اپریل ۵۳ء کو ملک غلام محمد نے وزیرِ اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر کے محمد علی بوگرا کو بطور وزیر اعظم وزارت سازی کی دعوت دی۔ محمد علی بوگرا ایک کامیاب حکمراں ثابت نہیں ہوسکے۔ اور ملک داخلی وخارجی انتشار کا شکار ہوگیا اس لئے آئینِ اسلامی کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکے۔ گورنر جنرل کی مداخلت سے بچنے کے لئے اگست ۱۹۵۴ء میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا، جس کی رو سے گورنر جنرل کے اختیارات میں کمی کردی گئی۔ اس کے بعد بنیادی اصولوں کی ترمیم شدہ رپورٹ منظور کی گئی اور اسے مسودۂ آئین کی شکل دینے کے لئے ماہرین کے پاس بھیج دیا گیا۔ عین اسی وقت جب اسمبلی دستور سازی کا کام ختم کرچکی تھی، ۲۴؍اکتوبر ۵۴ء کو ملک غلام محمد نے اپنے خصوصی اختیارات کے تحت اسے برطرف کردیا،[۶] اس کے بعد جولائی ۵۵ء میں انتخابات ہوئے جس میں چودھری محمد علی کو وزیر اعظم بنادیا گیا۔ ان کے دور میں فروری ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا دستور منظور ہوا جو ۲۳؍مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کردیا گیا۔ یہ دستور جمہوری اور پارلیمانی طرز کا تھا

---

(۱) دائرۂ معارف اسلامیہ/ ج:۵، ص:۴۳۷۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ ص:۳۹۵۔

(۳) ایضاً/ ص:۳۹۶۔

(۴) دائرۂ معارف اسلامیہ/ ج:۵، ص:۴۳۸۔

(۵) تذکرۃ الظفر/ ص:۳۹۴۔

(۶) دائرۂ معارف اسلامیہ/ ج:۵، ص:۴۳۹۔

اوراس میں ملک کو جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کا نام دیا گیا۔[۱]

اس طریقۂ پر مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد حسن امرتسری، سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالکریم گمتھلوی، پیر مانکی شریف، اور دیگر علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی وہ کوششیں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوگئیں جو انہوں نے مطالبۂ پاکستان کے لئے گذشتہ دو دہائیوں سے کی تھیں۔

۵۶ء کے آئین میں اگرچہ قرارداد مقاصد کے مطابق یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ پاکستان کا کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود اس آئینِ میں بھی کئی دفعات خلافِ اسلام پائی جاتی تھیں۔ اس پر مولانا ظفر احمد صاحب اور دیگر علمائے کرام نے غور وخوض کر کے قرآن وسنت کے موافق ایسی ترمیمات پیش کیں جن کے شامل کرنے سے ۵۶ء کا آئین مکمل طور پر اسلامی بن جاتا تھا۔ اس آئین میں کچھ ترمیمات اس طریقہ پر بھی کی گئی تھیں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں گہرا تعلق قائم رہے، لیکن پاکستان مخالف عناصر نے ۵۶ء کے آئین کی بحالی کے مطالبہ کی مخالفت کی اور نئے آئین کا مطالبہ کیا، جس کے نتیجہ میں ملی سالمیت جس طرح پارہ پارہ ہوئی وہ سب پر واضح ہے، اس کے نتائج ۷۱ء کی مغربی و مشرقی پاکستان کی تقسیم کی شکل میں دیکھنے کو ملے۔[۲] اگر مولانا ظفر صاحب اور دیگر علمائے کرام کی ان ترمیمات کو قبول کرلیا جاتا جو انہوں نے ۵۶ء میں پیش کی تھیں تو شاید پاکستان کو تقسیم کے اس عمل سے نہ گذرنا پڑتا جس نے مشرق ومغرب کو جدا کردیا۔

مولانا ظفر صاحب بار بار اپنے خطوط کے ذریعہ اربابِ حکومت کو اس امر پر متنبہ کرتے رہے کہ اگر پاکستان میں اسلامی دستور نافذ نہیں کیا گیا تو پاکستان کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا اس سلسلے میں انہوں نے ستمبر ۵۵ء میں اس وقت کے وزیرِ اعظم، پاکستان چودھری محمد علی کو ایک خط لکھا جس میں ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ مشرقی پاکستان کے بعض غیر مسلم حضرات نے نصابِ تعلیم سے دینیات کو حذف کرنے اور مخلوط انتخابات کی جو تحریک چلائی ہے وہ اس دوقومی نظریہ کے بالکل مخالف ہے جس پر پاکستان کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ اس کا جواب وزیرِ اعظم کے سیکریٹری نے ان مطالبات کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں دیا پھر دوسرا خط مولانا ظفر احمد صاحب نے ۱۰/ اکتوبر ۵۵ء کو لکھا جس میں مولانا نے اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ''پاکستان اسی وعدے پر اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ اس کو ایک مثالی مملکت بنایا جائے گا، مگر افسوس! یہ وعدہ اب تک ایفاء نہ ہوا''۔ آگے تحریر فرماتے ہیں کہ ''پاکستان میں دستور اسلامی وقانون شرعی جلد نافذ ہوجائے تاکہ وہ صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلام کی سلطنت بن جائے،[۳] چنانچہ چودھری محمد علی کی کوششوں کے نتیجہ میں ان کے پیش کردہ دستور کو ۲۹/

---

(۱) دائرۂ معارف اسلامیہ/ ج:۵، ص:۴۳۹۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ ص:۳۹۸۔

(۳) ایضاً/ ص:۴۰۴ تا ۴۱۰۔

فروری ۱۹۵۶ء کورات کے ۱۲ ربجے دستور ساز اسمبلی نے منظور کرلیا، کیوں کہ اس کے لئے قانونی کمیشن بنناضروری تھا جو اسمبلی کو تدریجی طور پر اسلامی قوانین بنانے کے لئے سفارشات کرتا رہے۔اس کی اعزازی ممبری کے لئے مولانا مرحوم کو بھی منتخب کیا گیا۔[۱] اس طریقہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے پاکستان بنانے کی تحریک میں جس مقصد کے تحت حمایت کی تھی اس سے انہوں نے کبھی منہ نہیں موڑا بلکہ اس کے لئے وہ مسلسل کوشاں رہے، قراردادِ مقاصد کو اسمبلی میں منظور کرانے میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کی مساعیٔ جمیلہ دستور اسلامی کا ایک سنہرا کارنامہ ہے۔

پاکستان بننے کے بعد یوں تو مولانا کے بہت سے تاریخی کارنامے ہیں جن کی تفصیل طوالت سے خالی نہیں تاہم کچھ ضروری چیزوں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے تا کہ آپ کا علمی وسیاسی مقام کا تعین کیا جاسکے۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان کا پہلا خیر سگالی وفد برائے حج روانہ ہوا جس کے ممبران میں مولانا ظفر صاحب مرحوم بھی شریک تھے۔ جہاں آپ کی وفد کے دیگر اراکین کے ساتھ جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز ابن سعود سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ فصیح عربی زبان میں آپ نے سلطان عبدالعزیز سے وفدِ پاکستان کے حج پر آنے کا مقصد بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ہم پاکستان اور سعودی حکومت کے درمیان محبت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔اس کے جواب میں سلطان عبدالعزیز نے شکریہ کا اظہار کیا۔[۲] پھر شاہ عبدالعزیز کی خواہش پر ۹ رذی الحجہ کو میدانِ عرفات میں امام کعبہ کے ساتھ مسلمانانِ عالم کو خطاب فرمایا اور ریڈیو جدہ سے بھی متعدد بار عربی اور اردو دونوں زبانوں میں خطاب کیا۔[۳] حجاز سے واپسی پر وفد پاکستان اور مملکتِ سعودیہ عربیہ کے متعلق مولانا مرحوم کے تاثرات وخیالات کراچی ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کی شکل میں نشر ہوئے جس میں آپ نے سلطان عبد العزیز کے تعلق سے فرمایا کہ ''وہ اس بات کی تاکید فرماتے تھے کہ مسلمانوں کی قوت وطاقت اور فلاح وکامرانی کا تمام تر دارو مدار دین کی قوت پر ہے مملکتِ پاکستان کو دنیا سے زیادہ دین کا اہتمام کرنا چاہئے تا کہ نصرتِ الٰہی اس کے ساتھ ہو''۔[۴] علاوہ ازیں آپ نے تمام ممالکِ اسلامیہ مثلاً عراق، شام، مصر، افریقہ، مراکش، انڈونیشیا وغیرہ کے خیر سگالی وفود سے ملاقات کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہا کہ وہ سب قرارداد مقاصد پاس ہونے سے بہت زیادہ خوش ہیں اور منتظر ہیں کہ پاکستان میں بہت جلد نظام شرعی نافذ ہوجائے''۔[۵]

مولانا کی اس تقریر سے واضح ہے کہ انہوں نے روزِ اول سے ہی پاکستان میں شرعی نظام نافذ کرنے کے لئے جو

---

(۱) ایضاً/ص:۴۱۳۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ص:۳۹۲۔

(۳) عثمانی گھرانے کی خدمات (مولانا قمر عثمانی کا انٹرویو)، ماہنامہ ''فیض الاسلام''، لاہور دسمبر ۹۷ء/ص:۱۲۔

(۴) تذکرۃ الظفر/ص:۱۲۳۔

(۵) ایضاً/ص:۱۲۹۔

تحریک چلائی تھی اس میں دیگر ممالک اسلامیہ کے اسلام پسندوں کی تائید بھی شامل تھی۔

۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان کے عوامی انتخابات میں مسلم لیگ، عوامی لیگ اور متحدہ محاذ سے الیکشن میں شکست سے دوچار ہوئی تو مولانا مرحوم کو اس کا بڑا قلق ہوا اور وہ مشرقی پاکستان سے دل برداشتہ ہو گئے، نتیجۃً وہ مشرقی پاکستان سے رختِ سفر باندھ کر مغربی پاکستان روانہ ہو گئے، اور عوامی سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر علمی کاموں میں لگ گئے۔ یہاں آ کر وہ دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہیار کے عہدۂ شیخ الحدیث پر فائز ہو کر علمی کاموں میں منہمک ہو گئے اور تقریباً بیس سال تک قرآن و حدیث کی تعلیم ونشر واشاعت میں مصروف رہے۔[1] غالباً ایسا آپ نے اس لئے کیا کہ آپ کسی مرکزی شہر میں رہتے ہوئے یکسوئی نہیں حاصل کر سکتے تھے، لیکن سیاسی خدمات کے لئے جب کبھی بھی مولانا نے ضرورت محسوس کی تو شرعی حدود اور حفاظتِ اسلام اور خدمتِ پاکستان کے لئے میدان عمل میں موجود رہے۔

چنانچہ جب حسین شہید سہروردی کے دورِ وزارت میں ملکی قوانین کو اسلامی قوانین کی شکل میں ڈھالنے کے لئے ایک لاء کمیشن قائم ہوا تو اس میں علامہ علاء الدین صدیقی سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی، مولانا امین احسن اصلاحی، اور شیعہ عالم حافظ کفایت حسین کے ساتھ مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی بحیثیت ممبر لاء کمیشن خدمات انجام دیں اور نہایت مفید وقابل عمل سفارشات پیش کیں، لیکن افسوس کہ دیگر سفارشات کی طرح ان سفارشات پر بھی عمل نہیں ہو سکا۔[2]

مولانا مرحوم نے تمام خدمات محض رضائے الٰہی کی خاطر انجام دیں۔ اور کوئی معاوضہ یا حق المحنۃ وصول نہیں کی، پاکستان کے بننے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں لیکن مولانا کی نظر کبھی کسبِ دنیا پر نہیں رہی۔ تقسیم کے فوراً بعد وہ اگر چاہتے تو اور حضرات کی طرح بڑی بڑی جائدادیں حاصل کر سکتے تھے لیکن مولانا نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے کسی جائداد کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا اور حسبِ معمول کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر رہے۔ مولانا کے منجھلے صاحبزادے مولانا قمر عثمانی نے جب ڈھاکہ کے مجسٹریٹ رحمت اللہ صاحب سے مل کر ایک مکان حاصل کرنا چاہا تو مولانا نے سخت مزاحمت کرتے ہوئے ریکوزیشن آرڈر منسوخ کرا دیا۔ جب مغربی پاکستان میں منتقل ہوئے تو نہ تو اپنے نام پر اور نہ ہی اپنی اولاد کے نام پر کوئی متروکہ جائداد حاصل کی۔ ان سب حضرات نے اپنی شبانہ روز کی محنت سے اپنے مستقر بنائے لیکن مولانا مرحوم نے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اپنی خدمات کا کوئی مادی صلہ کسی ذاتی مفاد کی صورت میں حاصل نہیں کیا۔[3]

مولانا ظفر صاحب نے اردو زبان کے تحفظ وبقاء کی خاطر بھی تحریک چلائی، یہاں تک کہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف

---

(۱) دائرہ معارفِ اسلامیہ / ۲۰ : ۵ : ص: ۷۶۱

(۲) ماہنامہ ''فیض الاسلام''، لاہور، دسمبر ۹۷ء/ص:۱۲۔

(۳) ایضاً۔

اعلاء السنن کی بارہویں جلد میں اردو زبان کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا ہے کہ ''اردو زبان کی حفاظت ہندوستان کے مسلمانوں پر شرعاً واجب ہے''۔ [۱] جب آپ مشرقی پاکستان میں تھے تو پاکستان میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان کیا ہو۔ مغربی پاکستان والے تو اردو کو سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے لیکن مشرقی پاکستان میں اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ چاٹگام کے کلکٹر نے بنگلہ حروف القرآن کی تحریک شروع کی جس کا مقصد یہ تھا کہ بنگلہ زبان کا رسم الخط عربی کردیا جائے تاکہ بنگالیوں کو قرآن سیکھنے میں آسانی ہو اور وہ اردو سے قریب تر آجائیں۔ اس موقع پر مولانا مرحوم نے اس تحریک کی تائید وحمایت فرماتے ہوئے سمجھدار طبقہ کے مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرنا شروع کیا کہ پاکستان (بشمول مشرقی پاکستان) کی سرکاری زبان اردو ہو۔ اس کے لئے وہ ۱۹۴۸ء میں صدر جمعیۃ علمائے اسلام مشرقی پاکستان کی حیثیت سے علماء کا ایک وفد لے کر کراچی پہونچے جہاں قائدِ اعظم اور لیاقت علی خاں سے ملاقات کی اور ایک لاکھ سے زیادہ افراد کے دستخط کیساتھ ان کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ مشرقی پاکستان والے بھی سرکاری زبان اردو ہی چاہتے ہیں، [۲] اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۸ء میں جب قائداعظم نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو ایک لاکھ سے زائد مجمع میں صاف اعلان کردیا کہ ''پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی''، [۳] اس طریقہ پر اردو زبان کے تئیں ان کی یہ خدمت ان کی اس زبان سے سچی لگن کا اظہار ہے جو نا قابلِ فراموش ہے۔

پاکستان بننے کے کچھ ہی دنوں بعد جس مسئلہ نے حکومت اور اسلام پسندوں کے درمیان ٹکراؤ کی صورت پیدا کردی وہ قادیانیوں کے تعلق سے تھا۔ تمام مسلم مکاتب فکر کا خیال تھا کہ چونکہ غلام احمد قادیانی (۱۸۳۵-۱۹۰۶ء) متفقہ طور پر خارج از اسلام تھے اس لئے ان کے پیروکاروں کو غیر مسلم تسلیم کرتے ہوئے انہیں اقلیت قرار دیا جائے اور اس فرقہ کے جو لوگ حکومت یا سرکاری عہدوں پر فائز ہیں انہیں معزول کردیا جائے۔ انہیں اقلیت قرار دینا اس لئے ضروری تھا کہ تاکہ اس کا شمار مسلمانوں کی فہرست میں نہ ہوسکے اور مسلمانوں کے نام پر ملنے والی مراعات کا وہ ناجائز فائدہ حاصل نہ کرسکیں۔

یہ تحریک ۱۹۵۲ء میں اس وقت زور پکڑ گئی جب قومی اسمبلی کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی پاکستان میں جداگانہ انتخابات کی سفارش کررہی تھی۔ یہ دور خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمی کا تھا جس میں ظفر اللہ وزیر خارجہ تھے جو قادیانی تھے اور اسی وجہ سے قائداعظم کی نمازِ جنازہ تک میں شریک نہیں ہوسکے تھے، [۴] اسی وجہ سے مسلمان یہ بھی مطالبہ کررہے تھے کہ ظفر اللہ

---

(۱) اعلاء السنن/ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، تعلیقات: مولانا تقی عثمانی/ مطبوعہ دار العلوم، کراچی/ جلد: ۱۲، ص: ۱۴۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ ص: ۳۹۰۔

(۳) ایضاً/ ص: ۳۹۰۔

(۴) ایضاً/ ۳۹۹۔

صاحب کو قادیانی ہونے کی بنا پر وزارت سے سبک دوش کر دیا جائے، مغربی پاکستان میں اس تحریک نے شدت اختیار کر لی، مشرقی پاکستان میں چونکہ قادیانی برائے نام ہی تھے اس لئے وہ شدت تو اختیار نہیں کی، البتہ وہاں کے علماء نے اس مطالبہ کی زبردست حمایت کی اور اس کے لئے باقاعدہ علماء کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں مولانا ظفر احمد صاحب نے قائدانہ رول ادا کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مولانا ان معاملات میں بلا تفریق مسلک ارکان تحریک کے لئے حتی المقدور کوششیں کر رہے تھے جو الحمدللہ کامیاب ہوئیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مولانا مشرقی پاکستان کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر مغربی پاکستان کے گمنام شہر ٹنڈو الہیار میں منتقل ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی علمی خدمات کے لئے وقف کر دی تھی۔ اور سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے، کیونکہ ان جیسے مخلصین سیاست کے مکر و فریب کے تانے بانے کو ملت اسلامیہ کے لئے ضرر رساں تصور کرتے تھے۔ لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ قوم کی خدمت کے لئے دوبارہ میدانِ عمل میں آئے۔ اس کا تعلق اگرچہ براہ راست سیاست سے نہیں بلکہ مذہب سے تھا، لیکن سیاسی حضرات نے چونکہ پاکستان میں سوشلزم، کمیونزم وغیرہ کو درآمد کر لیا تھا اور اس کے مبلغ بن گئے تھے۔ اس لئے ان نظریات کے خلاف علمائے اسلام کو متحدہ پلیٹ فارم دینے کے لئے ۱۹۶۹ء میں جمعیۃ علمائے اسلام کا احیاء کیا حالانکہ آپ اس وقت عمر کے اس حصہ میں تھے کہ آپ کو مستقل آرام کی ضرورت تھی لیکن محض سوشلزم اور دوسرے لادینی نظریات کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ نے جمعیۃ علمائے اسلام کی امارت کو قبول کیا[۱] اس پلیٹ فارم پر آپ نے تمام علماء کرام کو اکٹھا کیا جن میں مفتی محمد شفیع، مولانا اطہر علی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا صدیق احمد، مولانا نور احمد اور مولانا ابوالاعلی مودودی وغیرہم جیسے جید علماء کرام شامل تھے۔[۲]

سوشلزم نظریہ اسلامی نظریات سے متصادم تھا اور اس پر ''اسلامی'' لیبل لگا کر مسٹر بھٹو نے اسے دو آتشہ کر دیا تھا جو علماء حق کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اس لادینی نظریہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی ضعیفی و پیرانہ سالی کے باوجود مقدور بھر کوشش کی۔ آپ نے ۲۲؍اگست ۶۹ء کو کراچی میں مشرقی و مغربی پاکستان کے مقتدر علمائے کرام کا ایک اجلاس بلایا جس میں مرکزی جمعیۃ علمائے اسلام کا احیاء عمل میں آیا اور آپ کو جمعیت کا امیر منتخب کیا گیا۔[۳] ۷-۸ ستمبر ۶۹ء کو آپ کو اور آپ کے رفقاء کو لاہور کے شہریوں کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا جن میں آپ کے علاوہ مولانا ابوالاعلی مودودی، مولانا نور محمد، مفتی شفیع عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرہم بھی موجود تھے[۴] یہ اجلاس سوشلزم کے

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۴۰۰۔

(۲) ایضاً/ص:۴۱۷۔

(۳) ایضاً/۴۱۷۔

(۴) ہفت روزہ ''زندگی''، لاہور، ۱۵؍ستمبر ۶۹۔

خلاف جہاد کی ترغیب دینے کے لئے منعقد کیا گیا تھا، جس میں آپ نے عامۃ المسلمین کو سوشلزم اور دوسرے لادینی نظریات کے خطرناک نتائج سے آگاہ فرمایا۔

علاوہ ازیں ۱۶ر مئی ۷۰ء کو موچی دروازہ لاہور میں اسی عنوان پر اجلاس عام منعقد ہوا پھر پشاور، کوہاٹ، بنّوں اور حیدرآباد میں اسی موضوع پر رائے عامہ بیدار کرنے کی خاطر اجلاس منعقد ہوئے جن میں آپ نے شرکت فرمائی۔ (۱)

اسی موضوع پر مشرقی پاکستان کے دارالسلطنت ڈھاکہ میں ۲۴ر جنوری ۷۰ء کو مرکزی جمعیۃ علمائے اسلام کے بینر تلے عظیم الشان جلسۂ عام منعقد کیا گیا جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ یہ جلسہ بھی آپ ہی کی زیرِ صدارت منعقد ہوا (۲) غرضیکہ مولانا نے سوشلزم کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ کو ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک جنگی پیمانہ پر لڑا اور رائے عامہ کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے جلسوں میں بھی شرکت کی، علماء کے اجتماعات بھی کئے اور تحریری فتاوی بھی دئے اور دوسرے علماء سے بھی فتاوی دلوائے۔ ۱۱۳ علماء کا ایک فتوی جس میں موصوف بھی شامل تھے، سوشلزم اور نظامِ سرمایہ داری کے خلاف اسلام ہونے پر اخبارات میں شائع ہوا جس سے سوشلسٹوں اور نیشنلسٹوں میں ہنگامہ برپا ہوگیا اور وہ علماءِ حق کے خلاف زہر افشانی کرنے لگے۔ سوشلسٹ عناصر نے یہ فریب دینے کی کوشش کی کہ ان کی معاشی مشکلات کا حل اسلام میں نہیں بلکہ سوشلزم میں ہے۔ جس کے مہلک اثرات نوجوان نسل پر زیادہ پڑ رہے تھے۔ علمائے حق نے اس کے جواب میں معاشی اصلاحات کا ۲۲ نکاتی مختصر خاکہ پیش کیا جس پر ۱۱۸ علمائے کرام کے دستخط ہیں اس پر بھی بحیثیت صدر مرکزی جمعیۃ علمائے اسلام مولانا ظفر احمد صاحب کے دستخط ہیں (۳) اسی رسالے میں آپ نے ''اسلامی نظام'' کے بنیادی اصول سے متعلق ایک مختصر مضمون بھی تحریر فرمایا، جس میں آپ نے اسلامی مملکت میں اسلامی نظام کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالی، اور سوشلزم، کمیونزم، کیپیٹل ازم، نیشنلزم وغیرہ اصطلاحات کے بطلان سے عوام کو روشناس کرایا۔ لیکن افسوس کہ پاکستانی مسلمانوں نے اس مدبر اسلام کی تجاویز، تحریروں اور تقریروں کا اتنا اثر نہ لیا جتنا ہونا چاہئے تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۰ء میں جمہوریت کے نام پر جو انتخابات ہوئے اس میں اس نظریہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا اور پاکستان جس نظریہ کے تحت بنا تھا اس کی بنیادیں منہدم ہوگئیں جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اور مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے جدا ہوکر بنگلہ دیش کی شکل میں دنیا کے نقشہ پر آ گیا۔ یہ ایک علیحدہ طویل بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس انتخاب میں شکست کی ایک اہم وجہ مخلوط انتخابی نظریہ بھی تھا جس کے حامی علماء میں مفتی محمود، اور ہزاری گروپ تھے۔ ان

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص: ۴۱۸۔

(۲) ایضاً/ص: ۴۱۹۔

(۳) ہفت روزہ ''صوت الاسلام''، لاہور، ۱۲ر جون ۱۹۷۰ء۔

جماعتوں کے اتحاد سے چونکہ اسلامی نظریہ کے حامل افراد کو زبردست جھٹکا لگ تھا اسی لئے مولانا ظفر صاحب نے ان دونوں گروپوں کی مخالفت کی اور ان دونوں جماعتوں کو پاکستان کا بنیادی مخالف اور قیامِ پاکستان کے خلاف قرار دیا۔ [۱]

اس کے بعد مولانا نے مرکزی جمعیت علمائے اسلام کو تبلیغی مشن پر لگادیا اور اصل کام یہ قرار دیا کہ "اسلام اور نظامِ اسلام پر قوم کو متحد کیا جائے، دوسرے کافرانہ نظاموں سے برأت کا اظہار کریں، معاشرہ کی اصلاح کریں، لوگوں کو نماز، جماعت اور شعائرِ اسلام کے احترام کی ترغیب دیں"۔ [۲] مولانا مرحوم پر اس انتخابی شکست کے اثرات بہت زیادہ مرتب ہوئے اور وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوکر اپنے سابقہ علمی مشاغل اور رشد و ہدایت کے کاموں میں منہمک ہو گئے اور مدت العمر اسی فرض منصبی میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ مرض الوفات میں مبتلا ہوکر بغرضِ علاج کراچی تشریف لائے لیکن کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور آپ نے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ ۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء کی صبح تخلیقِ پاکستان میں اہم کردار کا حامل، شہرت و نام آوری سے مبرا، نظام اسلامی کا مخلص ترین یہ خادم اللہ کے حضور میں حاضر ہو گیا، نمازِ جنازہ مفتی شفیع صاحب عثمانی نے پڑھائی اور مفتی صاحب ہی کی خواہش اور اعزا کی رضامندی پر پاپوش نگر، ناظم آباد، کراچی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ [۳] انا للہ وانا الیہ راجعون۔

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۴۲۹۔

(۲) ایضاً/ص:۴۳۰۔

(۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے تذکرۃ الظفر/ص:۴۳۲ تا ۴۵۵۔

مولانا کی علمی خدمات کا جائزہ لینے سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر یہ جائزہ لے لیا جائے کہ وہ کیا وجوہات رہیں جن کی بنا پر مولانا کی خدمات کو تاریخ پاکستان میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حامل تھے جب کہ ان کے دوسرے رفیق علامہ شبیر احمد عثمانی کی خدمات کو تاریخ پاکستان میں اہم مقام ملا۔ واضح رہے کہ یہ کوئی موازنہ نہیں بلکہ تحقیق کا طالب علمانہ جائزہ ہے۔

اسے اتفاق ہی قرار دیا جاسکتا ہے کہ نظریہ پاکستان کے حامل دونوں حضرات ہی اصلاً، نسلاً اور مسلکاً دیوبندی اور عثمانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ دونوں کو تحریک پاکستان میں خدمات کے اعتراف کے طور پر یہ اعزاز حاصل ہوا کہ ایک کو سرکاری طور پر مغربی پاکستان کی راجدھانی کراچی اور دوسرے کو مشرقی پاکستان کے دار السلطنت ڈھاکہ میں رسم پرچم کشائی اور چیف جسٹس سے پاکستان سے وفاداری کا حلف لینے کا اعزاز حاصل ہوا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ تاریخ تحریک پاکستان میں جو مقام مولانا شبیر احمد عثمانی کو ملا اس کے مقابلے میں مولانا ظفر احمد عثمانی کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا، حالانکہ مولانا شبیر احمد عثمانی اس تحریک سے بہت بعد (۱۹۴۵ء) میں وابستہ ہوئے، اس سے قبل وہ جمعیۃ العلماء، ہند کے سرگرم مجلس عاملہ کے ممبر تھے اور اس کے اجلاس میں مستقل شرکت کرتے تھے،[۱] جب کہ مولانا ظفر صاحب ۱۹۳۷ء سے جڑے ہوئے تھے۔ اس کی چند وجوہات ہیں جن کا اظہار اس مقالہ میں ظاہر کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

سب سے پہلی وجہ تو یہی ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی تحریک اسلامی کے عظیم سرچشمہ دار العلوم، دیوبند سے بچپن سے ہی وابستہ تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے براہ راست مایہ ناز شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شیخ الہند علیہ الرحمہ تحریک آزادی ہند میں قائدانہ رول ادا کر چکے تھے۔ ریشمی رومال تحریک اگرچہ ناکام ہوگئی تھی لیکن اس کے اثرات آزادئ ہند پر ضرور مرتب ہوئے۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ اور عمر عزیز کا بیشتر حصہ عملی سیاست میں گذارا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ان کے معتمد ترین شاگردوں میں سے تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں ۱۹۲۰ء میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تھا، اس وقت شیخ الہند نے اپنی ضعیفی اور بیماری کے باوجود شرکت ضرور کی تھی لیکن ان کا تحریری خطبہ پڑھنے کی سعادت مولانا شبیر احمد عثمانی کو ہی حاصل ہوئی تھی۔[۲] ایسے ہی جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے اجلاس بمقام دہلی کا خطبۂ صدارت بھی شیخ الہند کی ایماء پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے ہی پڑھا تھا۔[۳]

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے: جمعیۃ العلماء ہند، پروین روزینہ، ادارہ تحقیق تاریخ وثقافت اسلامی، اسلام آباد ۱۹۸۰ء (اس میں جمعیت کے اجلاس کی تفصیلی روداد یں ہیں، جن میں جگہ جگہ مولانا شبیر احمد عثمانی کا نام ملتا ہے۔

(۲) نقش حیات/ مولانا حسین احمد مدنی/ الجمعیۃ بک ڈپو، دہلی ۱۹۵۳ء/ ج:۲ص:۲۵۹۔

(۳) جمعیۃ العلماء ہند/ پروین روزینہ/ ج:۲ص:۸۵۸۔

اس طریقہ پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا شبیر احمد عثمانی آغاز سے ہی عملی سیاست سے جڑے ہوئے تھے جب کہ مولانا ظفر احمد عثمانی بچپن میں ہی مختلف وجوہات کی بنا پر دیوبند کو خیر باد کہہ کر اپنے حقیقی ماموں مولانا اشرف علی تھانوی کی زیرِ تربیت پرورش پا رہے تھے جو شیخ الہند کے شاگرد ہونے کے باوجود اپنے کو عملی سیاست سے دور رکھتے ہوئے رشد وہدایت کے اعلی مقام پر فائز تھے، ان کے ذہنی رشتوں سے مسلم لیگ قریب ضرور تھی لیکن انہوں نے اپنی ذات کو ہنگامی زندگی سے دور رکھا اور اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے لیکن جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی تو اس کے بارے میں ایک ماہر شریعت عالمِ دین ہونے کے حیثیت سے اس کی شرعی حیثیت پر فقیہانہ نظر بصیرت ڈال کر اس کے نتائج وعواقب کو واضح کرنے اور ملت کی عملی اور دینی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی دریغ نہیں فرمایا۔[1]

یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت کو عامۃ المسلمین کی تائید ہونے اور اس کے اصل مقصد سے اتفاق کے باوجود حضرت تھانویؒ کو اس سے اصولی طور پر اختلاف رہا کیونکہ تحریک خلافت کو آزادی ہند کا زینہ بنایا جارہا تھا جس میں برادرانِ وطن کی تائید بھی حاصل تھی، اور مولانا تھانوی ''ہندوؤں کی عددی اکثریت اور ان کی معاندانہ ذہنیت کی وجہ سے ان کے ساتھ مسلمانوں کے اشتراکِ عمل کو مضر سمجھتے تھے، اور ان کے ساتھ مل کر تحریک چلانا پسند نہیں کرتے تھے۔[2] تحریک پاکستان مولانا کے نظریہ سیاست سے قریب تر تھی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ''ایک خطہ پر خالص اسلامی حکومت ہو سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظامِ زکوۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں ہوں وغیرہ وغیرہ،[3] اسی نظریہ کے تحت انہوں نے مسلمانوں کو اپنی علیحدہ تنظیم بنانے کے مشورہ دیا اور چونکہ اس وقت ملک کی موجودہ مسلم جماعتوں میں مسلم لیگ کے سوا کوئی دوسری جماعت ملک میں ایسی نہیں تھی جس کو مسلمانوں کی جمہوری طاقت حاصل ہو اسی لئے مسلم لیگ کی شرکت اور حمایت کی رائے دی گئی[4] اس کے لئے آپ نے اپنے شاگردوں کو سیاست کے عملی میدان میں تب بھیجا جب کہ آپ کو پوری طرح یہ باور کرادیا گیا تھا کہ مسلم لیگ انہیں نظریات کی حامل رہے گی۔ مسلم لیگ میں آپ نے اپنے جن معتمد ترین شاگردوں کو میدانِ عمل میں اتارا ان میں سرِ فہرست مولانا ظفر احمد عثمانی کا نامِ نامی آتا ہے۔ چونکہ مولانا ظفر احمد صاحب کی اب تک کی زندگی سیاست سے نامانوس تھی، آپ خالصۃً علمی کاموں میں منہمک درس وتدریس کی زندگی گذار رہے تھے، اب ایکدم میدان سیاست میں آئے تھے، اسی لئے عوام الناس آپ کے نام سے ناآشنا تھے، لیکن پھر بھی بہت جلد آپ نے اپنی

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۳۵۰۔

(۲) ایضاً/ص:۳۵۱۔

(۳) ایضاً/ص:۳۵۲۔

(۴) ایضاً/ص:۳۶۴۔

مخلصانہ خدمات کے سبب مسلم لیگ کی صف اول میں مقام بنالیا لیکن اس کے باوجود علامہ شبیر احمد عثمانی کی عوامی مقبولیت کے مقابلے آپ کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے آپ حامل تھے۔ پھر یہ بات بھی ملاحظہ رہے کہ ان حضرات میں کوئی نام آوری کا جذبہ یا معاصرانہ چشمک یا مقابلہ کا رجحان تو تھا نہیں، وہ تو علامہ شبیر احمد عثمانی کی بزرگی اور اپنے پیر مرشد کے ساتھی ہونے کے باعث انہیں اساتذہ میں شمار کرتے تھے اور ان کا احترام وعقیدت شاگردوں کی مانند کرتے تھے اسی لئے انہوں نے کبھی اپنے کو مقابلہ میں پیش ہی نہیں کیا بلکہ جب ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماء اسلام کلکتہ میں وجود میں آئی تو مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی غیبوبت کے باوجود صدارتِ جمعیۃ کے لئے ان کا نام آپ نے ہی پیش فرمایا۔ اور اسی صدارت کی قرارداد لے کر مولانا شبیر احمد عثمانی کی خدمت میں دیوبند پہونچے اور مولانا کے اس عہدۂ صدارت کو قبول کرنے سے منع فرمانے پر ان کو باصرار تیار کیا اور کام کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی۔ (۱)

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کو تقریر وخطابت میں خداداد ملکہ حاصل تھا، جب کہ مولانا ظفر احمد عثمانی علمی جواہرات سے تو مالامال تھے لیکن اس کے عوامی اظہار پر اتنی قوت نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے مولانا شبیر احمد صاحب عوامی حلقوں میں مولانا ظفر صاحب کی بہ نسبت زیادہ مقبول تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ تقسیم کے وقت مولانا شبیر احمد عثمانی کونسل میں مسلم لیگ کے منتخبہ ممبر تھے اور تقسیم سے کچھ ہی روز قبل ہجرت کر کے کراچی تشریف لے گئے تھے اور مولانا ظفر احمد عثمانی ڈھاکہ میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ چونکہ پاکستان بننے کے بعد کراچی کو مرکزی شہر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور پاکستان کا اصل دارالسلطنت یہی مرکز شہر تھا، اس لئے علامہ شبیر احمد عثمانی قدرتی طور پر کراچی کی مرکزی شخصیت جس کے وہ واقعی مستحق تھے، قرار پائے اور ان کی خدمات پاکستان کا بجا طور پر اعتراف کیا گیا۔ خود قائدِ اعظم محمد علی جناح ان سے سیاسی رہنمائی حاصل کرتے تھے، مولانا ظفر احمد عثمانی کو اگرچہ یہی مقام مشرقی پاکستان میں حاصل تھا، لیکن چونکہ انکا مزاج بچپن سے خانقاہی تھا اس لئے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ عملاً سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے اپنے کو الگ تھلگ کئے رہے۔ البتہ جب کبھی انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ اب اگر خاموشی اختیار کی گئی تو قومی نقصان ہوگا، تو انہوں نے شرعی تقاضوں کے تحت مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے طور پر سیاسی کاموں میں حصہ لیا لیکن اس میں بھی انہوں نے خاموش خدمات کو ترجیح دی۔

المختصر مولانا کی سیاسی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے اور تخلیقِ پاکستان میں وہ اہم کردار کے حامل ہیں۔ ہم اس گفتگو کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے اب مولانا کی علمی اور ادبی خدمات کا جائزہ لیں گے۔

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۱۷۱-۳۔

چوتھا باب

مولانا ظفر احمد عثمانی کی علمی وادبی خدمات

پہلی فصل

مطبوعہ اردو مضامین کا جائزہ

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علمی دنیا میں خصوصاً علومِ دینیہ وعربی ادب وفنون کے طلبہ کے لئے محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ لیکن مولانا کی ہجرت مکانی، تقسیم ہند کا المیہ، تشکیل پاکستان اور مولانا مرحوم کا اس وقت مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں بغرض درس وتدریس مقیم ہونا وہ عوارض ہیں جنہوں نے مولانا کی تابناک شخصیت کو اہلِ ہند سے اوجھل کر دیا، اور باشندگان ہندوستان مولانا کے علوم وفنون سے مستفید نہیں ہو سکے۔ تاہم علمی حلقوں میں مولانا کے علمی کاموں کو سنجیدگی سے دیکھا گیا۔ اس وقت کے علمی رسائل وجرائد میں مولانا کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ جس کسی میں بھی اپنی نسبت اور فہم کے مطابق کوئی جھول محسوس کرتے اس پر اولین فرصت میں گرفت کرتے اور اس میں اپنے اور غیر میں امتیاز نہ کرتے اور حق بات کہنے سے نہ چوکتے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا نام طبقۂ دیوبند میں ایک خاص علمی عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ مولانا بھی بنیادی طور پر اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، لیکن کچھ مسائل میں مولانا مرحوم نے ان دونوں حضرات کی علمی خدمات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ [۱] مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی مخصوص فکر کے باعث دیوبندی حلقہ کی تنقید کا شکار رہے، لیکن جب مولانا نے ان سے کسی علمی مسئلہ پر اختلاف کیا تو ان کی علمی حیثیت کا بھی اعتراف کیا اور ان سے اظہارِ محبت میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ [۲] اس طریقہ پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کے یہاں جانچنے کا معیار کسی کی اپنی ذات نہیں تھی، بلکہ وہ علمی نکات تھے جنہیں صاحبِ مضمون نے بیان کیا اور وہ مولانا کی نظر میں کسی بھی وجہ سے محلِ کلام ہوئے۔ نہ تو وہ کسی کی بھاری بھرکم شخصیت سے بلاوجہ مرعوب ہی ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے مخالفین سے گفتگو کرتے وقت سنجیدگی اور متانت کو ہاتھ سے جانے دیا۔

مولانا نے بہت سی کتابیں عربی واردو میں تالیف کیں۔ بے انتہاء علمی مضامین تحریر کئے۔ عربی شاعری میں دادِ تحسین وصول کی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، جیسے فنون میں اپنی علمی قابلیتوں کا لوہا منوایا۔ اگرچہ آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ علم

---

(۱) ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ میں ''سود'' اور ''اسلامی نظام زمینداری وجاگیرداری'' پر طویل بحث در بحث کا سلسلہ اس کا بین ثبوت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اپریل تا اگست ۴۴ء، مئی، نومبر، دسمبر ۴۵ء، جنوری، مارچ، جون، جولائی، ستمبر، دسمبر ۴۶ء اور جنوری ۴۷ء کے شمارے۔

(۲) ملاحظہ فرمایئے: رسائل ومسائل/ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ/ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی؛ طبع دوم ۱۹۵۷ء/ ج:۲؛ ص:۱۶۷۔

حدیث میں فقہ حنفی کی تائید پر مشتمل ذخیرۂ احادیث کی کتاب ''اعلاء السنن'' ہے جو عربی زبان میں ۲۰ ضخیم جلدوں میں پندرہ سال کی شبانہ روز محنت سے تیار ہوئی۔ اس پر گفتگو ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے مولانا مرحوم کے ان خاص الخاص علمی مضامین کا جائزہ لیتے ہیں جنہوں نے مولانا مرحوم کے علمی جواہر کو آشکارا کیا۔

مولانا ''اعلاء السنن'' کی تصنیف کے باعث حنفی حلقوں میں بہت زیادہ قبولیت وشہرت رکھتے تھے اور امام ابوحنیفہؒ کے فقہ کی مستدل حدیثوں کے باعث اپنی حیثیت کو ثابت کر چکے تھے، لیکن وہ تقلید جامد کے قطعاً شکار نہیں تھے۔ اس کا واضح ثبوت ان کی وہ علمی بحث ہے جو انہوں نے ''اسلامی معاشیات کے چند فقہی اور قانونی ابواب''[1] نامی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے مضمون پر کی۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس علمی بحث پر مختصری روشنی ڈال دی جائے تا کہ یہ بحث اور اس کا ماحصل واضح ہو سکے۔

ماہنامہ معارف میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا ایک تفصیلی مقالہ بہ عنوان ''اسلامی معاشیات کے چند فقہی اور قانونی ابواب'' شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں مولانا گیلانی نے ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ایک عنوان ''غیر اسلامی ممالک میں سود وقمار وغیرہ کا حکم'' قائم کیا تھا، اس کے ایک ذیلی عنوان ''ہندوستان میں مسئلہ سود کا حکم'' پر حالات کے تقاضوں کے تحت ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ ہندستانی مسلمانوں کو لین دین پر ''سود'' لینے کے جواز میں امام ابوحنیفہ کے دلائل سے استنباط کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ''غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے''۔[2] اور پھر اپنی یہ رائے بھی پیش کی تھی کہ ''ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کے عدمِ اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہیں ہے چہ جائے کہ ان کی حرمت کا دعویٰ''،[3] اور پھر اس کے حاشیہ میں ان لوگوں سے (جو مسلک حنفی کے اس مسئلہ کا انکار کرنا چاہتے ہیں، مطالبہ کیا تھا کہ ''شرعی دلائل سے حربی کے اموال کے عدمِ اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں تو پیش کریں''۔[4] مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے باوجودے کہ وہ حنفی اور دیوبندی تھے، مولانا مناظر صاحب کے اس چیلنج کو قبول کیا اور ایک مختصر مضمون ''غیر اسلامی ممالک میں سود وقمار کا حکم'' عنوان سے تحریر فرمایا۔[5] اس میں مولانا مرحوم نے مولانا گیلانی مرحوم کے اس چیلنج کے جواب میں قرآن پاک کی مختلف آیات کے حوالوں کو بنیاد قرار دے کر عقلی توجیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''شریعت نے زنا کو حرام کیا ہے تو وہ ہر جگہ حرام ہے''۔ یہی حال حرمتِ ربوٰا کا ہونا چاہئے''۔ مولانا

---

(۱) ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ ۵۳/: ۴-۵-۶ و ۵۴/: ۱-۲ پر مبسوط تفصیلی مضمون۔

(۲) ایضاً/ ۶/۵۳ ص: ۴۳۷۔

(۳) ایضاً/ ص: ۴۳۷۔

(۴) حاشیہ صفحہ: ۴۳۷۔

(۵) ایضاً/ ۵/۵۵ مئی ۱۹۴۵ء، ص: ۱۰۷ تا ۱۱۳۔

مرحوم نے اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی حدیث ''لا ربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب'' کی سند پر کلام کرتے ہوئے اسے ضعیف اور خبرِ واحد قرار دیا اور پھر حنفیہ کے اصول کو بتایا کہ ''نص قطعی کے اطلاق کو خبر واحد سے مقید یا مخصوص کرنا جائز نہیں''۔ (۱) اسی کے ساتھ آپ نے اس مسئلہ کو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب کرنے پر بھی شک کا اظہار کیا اور پھر اگر یقینی طور پر اس مسئلہ کو امام اعظم کا مسلک مان بھی لیا جائے تو بھی ''جملہ ائمہ نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ حتی کہ ان کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ نہیں ہیں''۔ (۲) کہہ کر مولانا گیلانی کے دلائل کا بھر پور علمی انداز میں رد کیا۔ اور مولانا گیلانی کے دلائل کو ''تقلیدی'' قرار دیا نہ کہ ''تحقیقی''۔ بہر حال آپ نے یہ مضمون بہت ہی جامع انداز میں قلمبند کرتے ہوئے مضبوط دلائل کی روشنی میں ''ہندوستان میں سود کا لین دین، (خواہ کسی بھی طرح ہو) اس کی کتابت اور گواہی سب کو حرام قرار دیا۔ (۳)

مولانا مناظر صاحب نے مولانا کے ان دلائل سے مطمئن نہ ہونیکے باعث اور ان شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے کی خاطر، جو مولانا عثمانی صاحب کے جواب سے پیدا ہوئے تھے، جواب الجواب کے بطور ایک اور مضمون بہ عنوان ''مسئلۂ سود، مسلم وحربی میں''، تحریر فرمایا۔ (۴) اسی اثناء میں سید عروج قادری کا بھی ایک مضمون معارف میں شائع ہو چکا تھا۔ (۵) انہوں نے بھی مولانا مناظر صاحب کے متدلات پر عدم تسلی کا اظہار کیا تھا۔

مولانا گیلانی کے جواب میں مولانا ظفر صاحب نے پھر ایک مضمون بہ عنوان ''مسئلۂ سود وقمار وغیرہ'' تحریر فرمایا۔ (۶)

مولانا مناظر صاحب نے اپنے اس علمی مقالہ میں مولانا کی علمی قابلیتوں کے اعتراف کے ساتھ ان کی اس جسارت پر کہ ''غالی حنفی ہونے کے باوجود مولانا نے اپنے امام کی بے جا طرف داری نہیں فرمائی'' مسرت کا اظہار بھی فرمایا، (۷) اور پھر تفصیل کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی وضاحت فرماتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ''جس چیز کو خواہ مخواہ ربوٰا قرار دے کر ہنگامہ کیا گیا ہے وہ سرے سے ربوٰا ہے ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کی ذیلی آمدنی ہے''۔ (۸) مولانا گیلانی نے اپنے دلائل کو مضبوط دلیل جانتے ہوئے شمس الائمہ امام سرخسی کی عبارات بھی پیش کی تھیں۔

---

(۱) معارف، اعظم گڑھ/ ۵۵/۵

(۲) ایضاً/ ۱۰۷۔

(۳) ایضاً/ ص:۱۱۱۔

(۴) ایضاً/ ۵/۵۶-۶ و ۱/۵۷، نومبر، دسمبر ۴۵ء و جنوری ۴۶ء۔

(۵) ایضاً/ ۳/۵۷، مارچ ۴۶ء۔

(۶) ایضاً/ ۶/۵۷ و ۱/۵۸ جون، جولائی ۴۶ء۔

(۷) ایضاً/ ۵/۵۶، ص:۲۶۹۔

(۸) ایضاً/ ۶/۵۶، ص:۳۵۹۔

مولانا ظفر صاحب نے اس کے جواب میں ربٰوا کی تاریخ اور اس کی صورتوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ربٰوا کی اس شکل کو ''ربٰوا الفضل'' سے تعبیر کیا اور بتایا کہ اس کی حرمت و جواز میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اولاً اختلاف رہا لیکن جب ان کو حدیث پہونچی تو انہوں نے رجوع کیا (یعنی اس کی حرمت کے قائل ہوگئے)[1] اسی کے ساتھ آپ نے قرآن کی روشنی میں ربٰوا کو ظلم اور تعدی سے تعبیر فرمایا جو اس کی حرمت کی دلیل ہے۔ مولانا نے اس باب میں حنفیہ کا مذہب امام ابو یوسف کے قول کے کو قرار دیتے ہوئے مولانا گیلانی سے اس اپیل کے ساتھ اس بحث کو ختم کرنا چاہا کہ وہ بھی بے تکلف اسی مذہب کو اختیار کریں، کیونکہ یہی ساری امت کا قول ہے اور طرفین کا قول مذہب نہیں بلکہ مذہب کی ایک ضعیف روایت ہے''،[2] پھر مولانا عثمانی نے مبسوط سرخسی سے مراجعت کر کے اپنے اقوال کی تائید میں مختصر سا مضمون تحریر کیا۔[3]

اس بحث پر اختتامی کلام کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے مولانا ظفر صاحب کے قول کی روشنی میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ جب ''شریعت اسلامی ان اموال کو مسلمانوں کے لئے مباح کر چکی ہے، قانون بھی اس کے لینے کو جائز قرار دے رہا ہے تو پھر مولانا کس بنیاد پر مسلمانوں کے لئے غیر مسلم اقوام سے حاصل کی ہوئی ان رقوم کو لینے اور اپنی ملک بنانے کو ناجائز ٹھہرا رہے ہیں''۔[4]

اس کے جواب میں مولانا ظفر صاحب نے پھر ایک مضمون نہایت مختصر تحریر کیا جس میں اس بحث کو ختم کرنے کے لئے امام ابو یوسف کے قول کے قوی ہونے پر زور دیا۔[5]

الحتصر معارف کے مختلف پندرہ شماروں پر پھیلی یہ بحث اگرچہ بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہوگئی اور فریقین ایک دوسرے کو نہ تو مطمئن کر سکے اور نہ ہی مطمئن ہو سکے، لیکن اتنا ضرور واضح ہوگیا کہ مولانا ظفر احمد صاحب کسی مسئلہ میں قرآن کی صریح ہدایت کے بعد پھر کسی کی تقلید کے پابند نہیں تھے۔ سود کی حرمت قرآن نے عمومی انداز میں بیان کی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حالات و واقعات اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں اس مسئلہ پر اجتہاد سے کام لیتے ہوئے مخصوص حالات میں ربٰوا بین المسلم و الحربی کو مختلف قیود کیساتھ کسی حد تک جائز قرار دیا، جس کی وضاحت مولانا مناظر صاحب نے ہندوستانی حالات کے تناظر میں اپنے دور کے مسلمانوں کے معاشی حالات کو پیش نظر رکھ کر اس جواز کو مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تو باوجودے کہ مولانا ظفر صاحب ''غالی حنفی'' تھے کسی بھی صورت میں اس کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کے اس ''جواز سود'' اور مولانا

---

(۱) معارف، اعظم گڑھ/۶/۵۷، ص: ۴۰۷۔

(۲) ایضاً/۱/۵۸، ص: ۲۳۔

(۳) ایضاً/۳/۵۸، ص: ۲۱۷۔

(۴) ایضاً/۶/۵۸، ص: ۴۶۸۔

(۵) ایضاً/۱/۵۹، ص: ۶۲۔

گیلانی کی ''تشریحات وتوضیحات'' پر قرآن کی ''تصریحات'' کے مقابلے ''تاویلات'' کا سہارا لے کر خاموشی اختیار کر لیں، چنانچہ مولانا مرحوم نے امام ابوحنیفہ کے اس فتوے کے خلاف امام ابو یوسف کے محتاط فتوے کو بہر صورت ترجیح دی۔ اسی طریقہ پر آپ نے ''اسلام میں نظامِ زمینداری وجاگیرداری'' کے مسئلہ پر بھی مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب سے اتفاق نہیں کیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمۃ کا ایک مضمون ماہنامہ معارف میں دو قسطوں میں ''نظام جاگیرداری وزمینداری کی اسلام میں کیا گنجائش ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ (۱) مولانا گیلانی علیہ الرحمۃ اسی مسئلہ میں ہندوستان میں مروجہ زمیندارانہ وجاگیردارانہ نظام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک اور کچھ احادیث کی بنا پر غیر اسلامی تصور کرتے تھے۔ اور بطورِ استدلال آپ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں آپؐ جب بنی حارثہ کے خاندان میں ظُہیرؓ کے کھیتوں پر تشریف لے گئے اور لہلہاتی کھیتوں کو دیکھ کر فرمایا ''مااحسن زرع ظہیر'' تو لوگوں نے عرض کیا ''یارسول اللہ یہ ظہیر کی کاشت نہیں ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ ''کیا یہ زمین ظہیر کی نہیں ہے۔ تب آپ کو اطلاع دی گئی کہ ''زمین تو ظہیر کی ہی ہے لیکن اس میں کاشت فلاں شخص کی ہے''۔ جو ایک متعینہ رقم کے عوض ظہیر کی زمین میں کاشت فرماتے ہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت ظہیر کو (جو زمین کے مالک تھے) حکم دیا کہ کاشتکار کے مصارف ادا کر کے اپنی کھیتی واپس لے لو۔ حکم کی تعمیل اسی وقت کر دی گئی۔ (۲) اس کے بعد حضرت رافعؓ کا (جو حضرت ظہیر کے بھتیجے تھے) وہ بیان نقل کیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''میں نے اپنے دونوں چچاؤں (ظہیر اور ضہیر) سے سنا، وہ محلّہ والوں سے کہہ رہے تھے کہ ''زمین کو کرایہ پر بندوبست کرنیکی رسول اللہ نے ممانعت کردی ہے''۔ (۳) اسی طرح حضرت اسید بن ظہیرؓ کا یہ فرمان بھی ''مبسوط'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ''کرایہ پر زمین کو بندوبست کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمادی ہے۔ (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کو آپ نے بخاری ومسلم کے حوالوں سے بھی مستدل فرمایا۔ (۵) اور امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس استدلال پر نکیر فرمائی جو انہوں نے زمین کو کرایہ پر دینے کے لئے کئے تھے۔ (۶)

اور ان سب استدلالات سے آپ نے نتیجہ اخذ کیا کہ '' زائد ضرورت زمین کو بطور منیحہ (تحفہ) کے ضرورتمندوں کو جوتنے بونے کیلئے دیدے اور اس کے معاوضہ میں بشکل نقد یا پیداوار کچھ نہ لے، جیسے قرض روپیہ میں کچھ نہیں لیا

(۱) ملاحظہ کیجئے: معارف، اعظم گڑھ، ۷۰/۶ و ۷۱/۱ دسمبر ۵۲ء وجنوری ۵۳ء۔

(۲) ایضاً/۷۰/۶، ص: ۴۱۲-۴۱۳۔

(۳) ایضاً/ص: ۴۱۴۔

(۴) ایضاً/ص: ۴۱۵۔

(۵) ایضاً/ص: ۴۱۶۔

(۶) ایضاً/ص: ۴۲۹۔

جاتا''۔[1] مولانا کا یہ مضمون فقہی وعلمی حوالوں سے پر تھا۔ جو دلچسپ بھی ہے اور پر از معلومات بھی، لیکن مولانا ظفر احمد عثانی صاحب اس مضمون کے مستدلات اور ان سے اخذ کئے گئے نتائج سے متفق نہیں تھے، بلکہ اسے وہ اس حکومتی پروپیگنڈہ کا اثر مان رہے تھے جو حکومت ہند نے زمینداری کے خاتمہ کے لئے کیا تھا۔ مولانا کا اس مسئلہ پر سب سے پہلا منطقی اعتراض یہ تھا کہ ''اگر واقعی اسلام میں یہ احکام پہلے سے موجود تھے تو ہمارے یہ علماء پہلے کیوں خاموش تھے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کھدر پر چار اور ولایتی مال کے بائیکاٹ، اور چرخہ کی تحریک کے بعد ہی یہ احکام علماء کو حدیثوں میں نظر آئے۔ اور جب تک بالشویزم اور کمیونزم نے زمین، اور ان کے اشتراک کا پروپیگنڈہ نہیں کیا، اس وقت تک ان کو اسلام میں جاگیرداری اور زمین داری کا الغاء (بیکار ہونا) نظر نہیں آیا۔[2] اس کے بعد مولانا نے مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کے مضمون کا علمی جائزہ لیتے ہوئے ان حوالوں کی چھان پھٹک کی جو مولانا گیلانی نے اپنے مضمون میں پیش کئے تھے۔

مولانا گیلانی صاحب کے جواب میں آپ نے رافع بن خدیجؓ کی اس مذکورہ حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام طحاویؒ کی تصریح کے حوالہ سے ''اضطراب'' قرار دیا۔[3] (یعنی وہ حدیث جس میں رواۃ مختلف ہوں کوئی کسی طرح روایت کرے اور کوئی دوسری طرح''[4] یا (حدیث کی سند میں کمی زیادتی یا نام وعبارت اُلٹ پُلٹ گئے ہوں)[5] اور دعوی کیا کہ ''جسکو اس حدیث کا اضطراب دیکھنا ہو وہ جمع الفوائد ج:۱،ص:۲۵ کی جانب مراجعت کرلے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے الفاظ کس قدر مختلف ہیں''۔[6] آپ نے بخاری کے حوالے سے اسی حدیث کو مختلف انداز سے نقل فرما کر اس کا اضطراب ثابت کر دیا۔ اور پھر صاحبِ عینی کی شرح کو نقل فرمایا کہ ''عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث کا حاصل یہ ہے کہ رافع نے مطلقاً زمین کے اجارہ کی جو ممانعت کی تھی، ابن عمرؓ نے اس سے انکار کیا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اجارہ سے منع فرمایا ہے، وہ وہ ہے جس میں کہ شرط فاسد ہو، وہ یہ کہ لوگ نالیوں کے پاس والی پیداوار کی شرط رکھتے تھے اور کچھ بھوسہ کی، جس کی مقدار مجہول تھی، اور بعض دفعہ یہ قطعہ محفوظ رہتا اور دوسرے قطعہ میں پیداوار نہ ہوتی یا اس کے برعکس ہوتا تو اس صورت میں جھگڑا ہوتا اور مزارع یا مالک زمین بالکل کورا رہ جاتا، لیکن اگر قطعۂ زمین مخصوص نہ ہو بلکہ کل پیداوار کا تہائی یا چوتھائی مقرر کرلیا جائے تو اس کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی''۔[7]

---

(۱) معارف، اعظم گڑھ /۱/۷۱؛ جنوری ۵۳ء۔
(۲) ایضاً/۱/۷۴، ص:۲۲۶۔
(۳) ایضاً/ص:۲۴۹۔
(۴) اردو ترجمہ ترمذی شریف/ ربانی بک ڈپو، دہلی؛ طبع دوم؛ جنوری ۷۸ء/ص:۷۔
(۵) علم حدیث اور چند اہم محدثین/ سالم قدوائی/ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی؛ جون ۸۱ء/ص:۵۵۔
(۶) معارف، اعظم گڑھ/۱/۷۴/ص:۲۵۰۔
(۷) ایضاً/ص:۲۵۲۔

احادیث مبارکہ کی روشنی میں مولانا عثمانی صاحب کا ماننا یہ تھا کہ زائد از زائد یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ زمینوں کو زمیندار کاشت پر نہ دے، لیکن اس سے زمین داری کا الغاء یا خاتمہ نہیں ہوتا، کیونکہ بخاری میں حضرت جابرؓ اور حضرت ابو ہریرۃؓ کی اور ''طحاوی'' میں زبیر بن جابرؓ کی اور بخاری میں ہی ظہیر بن رافع کے حوالہ سے جو روایات ملتی ہیں ان کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ'' زمین دار کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زمین کو روک لے۔ نہ خود کاشت کرے، نہ کسی کو کاشت کرنے دے، اور جو لوگ زمین داری کا خاتمہ چاہتے ہیں وہ زمین دار کو یہ حق (حقِ ملکیت) کبھی نہیں دیتے۔[۱] پھر آپ نے ان احادیث کی وضاحت کرتے ہوئے ابن عباسؓ کے قول کو راجح قرار دیا جس کے مطابق ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا تھا کہ کہ کوئی اپنے بھائی کو ویسے ہی زمین زراعت کے لئے دیدے، یہ اس سے بہتر ہے کہ اس سے کچھ مقررہ لگان وصول کرے، اس کے بہتر ہونے میں کسے کلام ہے۔ پھر آپ نے الکوکب الدری کے حوالہ سے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرما کر اپنی دلیل کو مضبوط کیا کہ ''جس مزارعت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ ممانعت یا تو شرط فاسدہ کی وجہ سے تھی یا تنزیہہ کے طور پر ممانعت تھی، کیونکہ اس وقت مہاجرین مفلس تھے''۔[۲]

مولانا ظفر احمد صاحب نے اس مسئلہ پر صرف احادیث مبارکہ پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ چاروں فقہاء کے زمین کو نقدین (سونا چاندی) کے عوض اجارہ پر دینے کے جواز کو متفقہ قرار دیا۔[۳] اس مقالہ کی دوسری قسط میں اس تمام جزئی تفصیلات کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔[۴] ان تفصیلات کو پیش کرنے کے بعد مولانا عثمانی نے زمین کو بٹائی پر دینے کے شرعی طریقۂ کار پر تفصیلی بحث کی ہے۔[۵]

پھر آپ نے اپنے مسلک پر (جواز زمین داری) فتح الباری کی طویل عبارتوں سے اپنے دعوے کو مدلل کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''اسلام میں زمین داری کا اور جاگیر داری ممنوع نہیں، بلکہ 'ظلم' حرام ہے۔ اسلام میں زمین داری کی ایسی صورتیں بتلائی گئی ہیں جن سے کاشت کاروں پر ظلم نہ ہو اور زمین دار و کاشت کار دونوں اتفاق کے ساتھ کام کرتے رہیں''۔[۶]

الغرض یہ علمی بحث ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ کے کئی شماروں میں چلی اور اس میں علمی نکات اور جواہر پارے پیش

---

(۱) معارف، اعظم گڑھ/۷۱/۴/ص:۲۶۲۔

(۲) ایضاً/ص:۲۶۴۔

(۳) ایضاً/۷۱/۵، ص:۳۲۵۔

(۴) ملاحظہ فرمایئے: معارف، اعظم گڑھ/مئی ۵۳: ۷۱/۵۔

(۵) ایضاً/۷۱/۶، ص:۴۰۵ تا ۴۲۰۔

(۶) ایضاً/۷۲/۱، ص:۱۹۔

ہوئے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی دونوں ہی علم کے بلند مقام پر تھے اور دونوں ہی اپنے اپنے نظریات پر قائم تھے، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ اس مسئلہ پر مولانا عثمانی اپنے خان دانی پس منظر کے پیشِ نظر قلم اٹھانے کے لئے مجبور ہوئے کیونکہ مولانا مرحوم دیوبند کے جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ دیوبند کا مشہور و معروف زمین دار گھرانہ تھا اور ہندوستان کی آزادی کے بعد اگرچہ مولانا ہندوستان سے ہجرت کر گئے تھے، لیکن ان کا خاندان خاتمۂ زمین داری کا شکار ہو کر کس مپرسی کی زندگی گذار رہا تھا۔ اس کو وہ شرعاً نامناسب، بلکہ ظلم سمجھتے تھے کہ وہ اس معاملہ میں خاتمۂ زمین داری کے خلاف احتجاج کرنے کے بجائے اس کے لئے شرعی جواز فراہم کر کے در پردہ حکومت ہند کے اس ظلم کو روا رکھنے کو جائز قرار دیں اسی وجہ سے مولانا عثمانی نے اپنے تفصیلی مقالہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی پر تنقید کرتے ہوئے جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ جس سے ان کے ذہنی کرب کا اندازہ ہوتا ہے تاہم یہ مسلمات میں سے ہیکہ دونوں بزرگوں نے اس بحث میں اپنی علمی صلاحیت و قابلیت کا لوہا منوالیا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی جماعت دیوبند میں اپنی ملکی و سیاسی خدمات کے باعث اہم مقام رکھتے ہیں، لیکن ان کے نظریات کے مختلف ہونے کی وجہ سے وہ علمی تنقیدوں کا بھی شکار ہوئے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان کے نظریات میں تحریف کر کے مخالفینِ اسلام نے اپنے حق میں دلیل بنالیا۔ اور اس سے اپنے باطل نظریات کو ثابت کرنے کا جواز فراہم کیا۔ لیکن علمائے حق نے کبھی ایسے نظریات کو تسلیم نہیں کیا اور مخالفین اسلام کو مسکت جواب دے کر اسلام کے تئیں اپنی خدمات پیش کیں۔ اور اس میں نہ تو جانب داری سے کام لیا اور نہ ہی بیجا الزام تراشیاں کیں۔ اس کا ثبوت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحبؒ کا مضمون بہ عنوان ''طلوعِ اسلام، مولانا سندھی اور شاہ ولی اللہ'' سے ملتا ہے جو ماہنامہ الفرقان، بریلی میں شائع ہوا ہے۔ بہتر ہے کہ ایک سرسری نظر اس کے پسِ منظر پر ڈال لی جائے۔

ماہنامہ الفرقان، بریلی (جو بہت عرصہ پہلے لکھنؤ منتقل ہو چکا ہے) نے مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کی زیر ادارت (۱۳۶۰ھ - ۱۹۴۱ء) میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو خرجِ عقیدت پیش کرنیکی غرض سے ''شاہ ولی اللہ نمبر'' شائع کیا تھا، جس میں ایک طویل مقالہ ''امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا اجمالی تعارف'' مولانا عبید اللہ سندھی کا شائع ہوا تھا۔[1] اس مقالہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقالہ بجائے خود علم و حکمت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے (اس وقت ہمارے زیرِ بحث اسکی کے علمی نکات پر گفتگو کرنا نہیں) منکرین حدیث کی جماعت کے رسالہ ''طلوعِ اسلام'' نے دسمبر ۱۹۴۱ء کے شمارے میں اس مقالہ کے کچھ اقتباسات کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے انتہائی شاطرانہ و ماہرانہ چالاکی و ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''جو مسلک ادارہ طلوع

---

(۱) ملاحظہ کیجئے: ماہنامہ ''الفرقان''، بریلی؛ شاہ ولی اللہ نمبر ۱۳۶۰ھ-۱۹۴۱ء/ص: ۲۴۹ تا ۳۳۵۔

اسلام کا ہے اس کی دعوت شاہ ولی اللہ نے دی تھی اور مولانا سندھی آج اسی کی تبلیغ میں سرگرم ہیں''۔ (۱)

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرف توجہ فرمائی اور نہایت علمی انداز میں قرآن وحدیث اور شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کی تحریروں کی روشنی میں منکرینِ حدیث کے اس فتنہ کی بیخ کنی کر کے اہل السنت والجماعت کے عقائد کی صحت میں سیندھ لگانے والے منکرینِ حدیث کے سرگرم غلام احمد پرویز کی ان فتنہ پرور کوششوں کو ناکام بنادیا جو اس نے سادہ لوح عوام کو بہکانے کی خاطر مولانا سندھی کے مضمون کے حوالے سے مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرف منسوب کرنے کے لئے کی تھیں۔ مولانا عثمانی نے اس مضمون میں جہاں کہیں ضرورت محسوس کی مولانا سندھی پر بھی تنقید کی، (۲) لیکن مولانا منظور نعمانی کا ماننا ہے کہ ''مولانا عثمانی نے مولانا سندھی کے اصل مقالہ کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ یہ ضرورت پیش نہ آتی، بلکہ وہ منکرینِ حدیث کی عیارانہ کوششوں سے قطع و برید کئے گئے مولانا سندھی کے اقتباسات کو ہی کافی سمجھتے ہوئے تنقید کر گئے''۔ (۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے نہایت دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''کتر بیونت'' سے عوام کو گمراہ کرنا چاہا تھا، لیکن مولانا عثمانی صاحبؒ کی بروقت گرفت سے منکرینِ حدیث اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

غلام احمد پرویز جیسا کہ معلوم ہے کہ منکرینِ حدیث کے سردار تھے اور اپنے ذہن کے مطابق قرآن پاک کی سورتوں وآیات کی من گھڑت تفاسیر کرتے رہتے تھے۔ ایسا ہی ایک مضمون سورۃ الفیل کی تفسیر کے عنوان سے لکھا تھا، جس میں انہوں نے اپنا یہ خیال پیش کیا کہ ''لشکر ابرہہ پر سنگباری ''ابابیل'' نامی پرندوں کے ذریعہ نہیں بلکہ قریش کے ذریعہ کرائی گئی تھی''۔ (۴) یہ تفسیر مشہور احادیث اور تفاسیر کی تردید کرتی تھی اس لئے مولانا ظفر احمد صاحب نے اس کا علمی جواب دیا۔ پہلے مولانا نے اسی رسالہ کو بغرض اشاعت ارسال کیا تھا، لیکن اس نے اسے نہیں چھاپا تو مولانا نے یہ جواب ماہنامہ الفرقان کو ارسال کیا جو اس نے شائع کر دیا۔ اس مضمون میں مولانا نے غلام احمد پرویز کی مشہور وعام تفسیر کو غلط جامہ پہنانے کی کوششوں پر سخت گرفت کرتے ہوئے صرفی، نحوی، انشائی، اور تاریخی حقائق سے ثابت کیا کہ پرویز صاحب کی یہ رائے واقعات کے مطابق نہیں، بلکہ ان کی ذاتی رائے ہے جو منشائے قرآن وحدیث کے خلاف ہے اس لئے اس کو کسی بھی درجہ میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے منکرینِ حدیث کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ''روایات تاریخ میں تنقید کا تو ہر شخص کو حق ہے اگر خدا نے کسی کو تنقید کی

---

(۱) مولانا ظفر احمد صاحب کے مضمون پر مولانا منظور نعمانی کے خصوصی ادارتی نوٹ سے ماخوذ، الفرقان/ ربیعین ۱۳۶۰ھ ص:۵۵۔

(۲) ایضاً/ص:۵۵ تا ۹۳۔

(۳) ایضاً/ص:۵۶۔

(۴) تفسیر سورۃ الفیل/ غلام احمد پرویز، طلوع اسلام، دہلی، ستمبر ۴۱ء

(پرویز صاحب کی رائے علامہ حمید الدین فراہیؒ کی رائے سے ملتی جلتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے: تفسیر نظام القرآن، علامہ حمید الدین فراہی، اردو ترجمہ: امین احسن اصلاحی، مطبوعہ: دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر ۱۴۱۱ھ-۱۹۹۰ء، ص:۳۸۷)۔

قابلیت دی ہو۔مگر اختراع اور تبدیلی کا کسی کو حق نہیں کہ ساڑھے تیرہ سو برس پیچھے کسی واقعہ کی صورت ہی اپنے قیاس سے بدل دے اور تاریخی روایات کو اپنی تنہا رائے سے یکسر مسترد کردے"۔ [۱]

مولانا نے پرویز صاحب کے "تفسیری مضمون" پر جو اعتراضات واقع کئے تھے ان کا جواب پرویز صاحب اور انکی جماعت سے مانگا تھا، لیکن انہوں نے اس کا جواب دیا یا نہیں اس کی تفصیل نہیں ملتی۔

اسی طریقہ پر منکرینِ حدیث کے اس رسالہ میں "روزہ کے فوائد اور فلسفہ پر قرآن کریم کے بیان سے کچھ روشنی ڈالی گئی تھی جس میں تقوے کی تفسیر کرتے ہوئے اس کا لازمی نتیجہ "تمکن فی الارض" قرار دیا تھا اور بتلایا گیا تھا کہ جس روزے سے یہ چیز حاصل نہ ہو وہ روزہ، نماز سب بیکار ہیں، [۲] اس کے جواب میں مولانا عثمانی صاحب نے ایک مضمون "تقوی کی حقیقت اور اسکے نتائج" کے عنوان سے لکھا جو ماہنامہ الفرقان، بریلی میں شائع ہوا۔ مولانا مرحوم نے اس مضمون میں منکرین حدیث کی اس اختراعی تفسیر کو باطل قرار دیتے ہوئے قرآن کریم کی مختلف آیات کی روشنی میں تقوے کی حقیقت کو اجاگر کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "تقوے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ متقی آخرت کے خوف وحزن سے مامون ہو جاتا ہے"۔ [۳] جہاں تک تمکن فی الارض کا سوال ہے تو یہ کوئی بری چیز نہیں ہے، یقیناً ایمان اور عمل صالح کے ساتھ وہ خدا کی بہت بڑی نعمت اور رحمت ہے، لیکن اس کو ایمان وتقوے کا لازمی اور غیر منفک نتیجہ قرار دینا غلط ہے"۔ [۴] کیونکہ اگر یہی نتیجہ لازمی قرار دیا جائے تو ہمیں فرعون، نمرود، شداد، ہٹلر مسولینی جیسے ظالموں کو بھی متقی ماننا پڑے گا۔ اس لئے اس کو تقوے کا لازمی نتیجہ قرار دینا عقیدے کے خلاف ہے۔

مولانا عثمانی کا یہ مضمون اگر چہ زیادہ طویل نہیں ہے لیکن قرآن کی آیات سے مستدل اور منکرین حدیث کا بھرپور جواب ہے۔ اس میں تقوے کی حقیقت اور اس کے اثرات پر جس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پورے مضمون میں منکرین حدیث کے انکارِ حدیث کو سامنے رکھ کر صرف قرآنی آیات سے دلائل دے کر منکرین حدیث کو خاموش کیا گیا ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) اپنے مختلف النوع نظریات کے باعث، انکی مسلمہ علمی قابلیت و لیاقت کے باوجود طبقۂ دیوبند میں متنازعہ شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ مسائل جدیدہ میں ان کا ذوقِ اجتہاد، قدامت پسند

---

(۱) پرویز صاحب کی تفسیر سورۃ الفیل پر ایک نظر"، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، الفرقان، بریلی، شوال ۱۳۶۰ھ، ص:۱۹۔

(۲) طلوع اسلام، دہلی، نومبر ۱۹۴۱ء۔

(۳) الفرقان، بریلی ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ، ص:۲۵۔

(۴) ایضاً/ص:۲۸۔

علماء نے پسند نہیں کیا۔ بعض متشدد علماء کرام نے ان کو تمام ممکنہ گمراہ خطابات سے نوازنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، مولانا عثمانی باوجودے کہ قدامت پسند علماء کے طبقۂ متشددین سے تعلق رکھتے تھے، لیکن انہوں نے مولانا مودودی سے جب کبھی گفتگو یا مراسلت کی تو اس میں سنجیدگی و متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان سے علمی اختلاف ضرور کیا، لیکن ان کے احترام اور محبت میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

تقسیم ہند کے بعد ہند و پاک کے مسلمانوں کے سامنے مختلف قسم کے مسائل جدید پیرا ہن میں آ رہے تھے۔ عوام علماء سے رجوع کرتے اور وہ اپنی وسعت و علمی لیاقت کے مطابق شریعت کے اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کرتے اور پھر مسئلہ کا جو حل نکلتا اسے عوام تک پہونچا دیتے تھے۔ ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ ہندوستان کی اس حیثیت کا تھا جو از روئے شرع پاکستان بن جانیکے بعد در پیش تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت اس وقت دارالاسلام کی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ تو اب یہ دار الامن ہے یا دار الحرب۔ کیونکہ بہت سے شرعی مسائل، اس کی اس حیثیت پر ہی معلق تھے۔ دارالامن قرار دینے کی صورت میں مسائل کا نفاذ کسی دوسری طرح ہوتا تو دار الحرب ماننے کی صورت میں کسی اور طرح۔ پاکستان ان حضرات کے نزدیک دارالاسلام تھا۔ دارالاسلام اور دار الحرب کے عوام کے مابین مسائل کس طرح حل کیے جائیں۔ یہ تفصیل طلب امور تھے۔ کیونکہ دونوں ملک کے باشندے اصلاً تو ایک تھے، لیکن اب حالات نے الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ انہیں مسائل میں سے ایک مسئلہ ''دارالاسلام'' اور ''دارالکفر'' کے مسلمانوں کے درمیان وراثت اور مناکحت کے تعلقات پر مشتمل تھا۔

ماہنامہ ترجمان القرآن (مولانا مودودی صاحب کی زیر ادارت شائع ہونے والا مشہور علمی رسالہ) کے قارئین میں سے کسی قاری نے مسئلہ بالا سے متعلق سوال کیا۔ جس کے جواب میں مولانا مودودی نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ان دونوں ملکوں کے مسلمانوں کے درمیان وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔[۱] مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب کی نظر سے ترجمان القرآن کا مذکورہ شمارہ (شعبان ۱۳۷۰ھ- جون ۵۱ء) گذرا تو آپ نے اس مسئلہ پر مولانا مودودی سے مراسلت کی جو رسائل و مسائل حصہ دوم میں شامل ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے مولانا مودودی کی علمی قابلیت کا اعتراف، ان سے اظہار محبت، اور کچھ علماء کی طرف سے ان کی تحریروں پر تکفیری حملوں سے اظہارِ برأت کرتے ہوئے مسئلہ مذکورہ میں مولانا مودودی کے خیالات سے اختلاف کیا۔ آپ نے اس فتوے کو مذہب حنفی نیز مذاہب اربعہ کے خلاف بتاتے ہوئے تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ ''آپ کی یہ رائے دونوں ملکوں کے حق میں نہیں''۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے مولانا مودودی کو فقہی مسائل کے استنباط کے تعلق سے کچھ

---

(۱) رسائل و مسائل/مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ/مرکزی مکتبہ اسلامی؛ اچھرہ، پاکستان؛ طبع دوم، ۱۹۵۷ء/ج:۲،ص:۱۶۶۔

مشورے بھی دئے۔ [۱] مولانا مودودی نے اس کے جواب میں قرآن وحدیث سے براہِ راست استنباط کرنے اور عام فقہائے کرام کی آراء سے اختلاف کرنے کا اعتراف بھی کیا۔ [۲]

مولانا نے مولانا مودودی کو پھر مراسلہ لکھ کر مختلف قرآنی آیات واحادیث مبارکہ سے اپنے دعوے کو مدلل کرتے ہوئے فرمایا کہ "قرآن وحدیث سے براہِ راست استنباط کو میں منع نہیں کرتا مگر اس کے لئے جس قدر وسعتِ نظر فی الحدیث اور معرفت ناسخ ومنسوخ ومعرفت اقوال فقہاءِ سابقین کی ضرورت ہے، یہ شرط ہم میں اور آپ میں مفقود ہے"۔ [۳]

مولانا مودودی نے اس کے جوابی مراسلہ میں مولانا کے اعتراضات واشکالات کو دور کرتے ہوئے یہ کہہ کر بحث ختم کی کہ "میری اس تقریر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں کے درمیان مناکحت حرام ہے، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جن زوجین کے درمیان اختلاف واقع ہو چکا ہے، ان کی طرف سے اگر فسخ نکاح کی درخواست ہماری عدالت میں آئے تو وہ قابل لحاظ ہونی چاہئے اور آئندہ ایسے رشتوں سے پرہیز کرنا چاہئے"۔ [۴]

دیکھا جائے تو مولانا نے جتنے بھی مضامین (جو سینکڑوں سے متجاوز ہیں) تحریر کیے ہیں وہ تمام کے تمام علمی ہیں۔ مذکورہ بالا چند مضامین جو علمی بحث مباحثہ پر مشتمل ہیں انہیں خصوصی طور پر ذکر کرنے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مولانا ظفر احمد صاحب جب بھی کسی کی تحریر میں کوئی بات خلافِ شریعت محسوس کرتے یا قرآن وحدیث کے مطابق نہ پاتے تو اس کا نوٹس ضرور لیتے۔ خواہ وہ بات اپنے حلقوں سے کہی گئی ہو یا دوسرے حلقوں سے۔ اس بارے میں نہ تو وہ بلا وجہ کسی سے مرعوب ہوتے اور نہ ہی کسی کی توہین وتضحیک کے مرتکب ہوتے۔ سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات فریقِ مخالف کے سامنے رکھتے اب یہ اس فریق پر منحصر تھا کہ وہ اس پر کیا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ ردعمل اگر قابل گرفت ہوتا تو وہ اسپر جوابی ردعمل ظاہر کرتے اور اگر نا قابل التفات ہوتا تو بات ختم کر دیتے۔ یہ ایک مثبت اندازِ فکر تھا جو مولانا کو علمی حلقوں میں ممتاز کئے ہوئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے یہاں علمی تحریروں کے تئیں جو جذبات مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہم (جو علمائے دیوبند میں امتیازی شان رکھتے تھے) کے متعلق ملتے ہیں وہی جذبات مولانا سید ابوالاعلی مودودی (جن کی فکر عام علمائے دیوبند کی روش سے ہٹ کر ہے) کے لئے بھی ملتے ہیں۔ آپ نے جس انداز سے مذکورہ بالا حضرات سے علمی بحث کی ہے اس میں افہام و تفہیم کے عناصر ہیں نہ کہ نزاع وجدال کے۔

---

(۱) رسائل ومسائل/ ج: ۲، ص: ۱۷۲۔

(۲) ایضاً/ ج:۲، ص:۱۸۶۔

(۳) ایضاً/ ج:۲، ص:۱۹۳۔

(۴) ایضاً/ ج:۲، ص:۲۰۱۔

مولانا کے متفرق مضامین کا جائزہ لینا اس باب کو بہت طویل کردے گا، اس لئے ہم ان تمام مضامین سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چند اہم مقالات کو حوالوں کے ساتھ استفادہ کے لئے نقل کررہے ہیں۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے اہم علمی (اردو) مضامین کی فہرست

۱	ہفت روزہ شباب، لاہور	عیسائی مشنری	۲ر اپریل ۱۹۶۱ء
۲	ایضاً	موسیقی اور اسلام (۲ قسط)	۱۸ر جون و ۲۵ر جون ۶۱ء
۳	ایضاً	علمائے شام سے انٹرویو	۲۳ر جولائی ۱۹۶۱ء
۴	ایضاً	حضرت علی اور ابوجہل کی بیٹی کا نکاح	۱۴ر اگست ۱۹۶۱ء
۵	ایضاً	علمائے مدینہ سے انٹرویو	۲۴ر ستمبر ۶۱ء
۶	ایضاً	عیسائیوں سے سوالات	۴ر فروری ۶۲ء
۷	ایضاً	میدانِ عرفات میں	۲۳ر مئی ۶۲ء
۸	ماہنامہ البلاغ، کراچی	ذلت یہود اور عربوں کی شکست	جمادی الاولی ۱۳۸۷ھ
۹	ایضاً	مسلمانوں کے زوال کے اسباب	صفر المظفر ۱۳۸۸ھ
۱۰	ایضاً	سوالنامہ کا جواب	جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ
۱۱	ایضاً	محبوب نبی شبیر علی	شوال المکرم ۱۳۸۸ھ
۱۲	ایضاً	دینی مدارس کے انحطاط کے اسباب	شوال المکرم ۱۳۹۱ھ
۱۳	ایضاً	عصر حاضر میں مسافت کی تحقیق	ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ
۱۴	بینات کراچی	نوٹ کی شرعی حیثیت	ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ
۱۵	فاران، کراچی	اسلام میں عورت کا عائلی مقام	
۱۶	ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور	اشرف البیان فی معجزات القرآن	قرآن نمبر جلد سوم، اپریل ۱۹۷۰ء
۱۷	صوت الاسلام، لاہور	اسلامی نظام کے بنیادی اصول	۱۲ر جون ۱۹۷۰ء
۱۸	ماہنامہ الصدیق، ملتان	خطیب بغدادی کے اعتراضات کے جوابات	اٹھارہ قسطوں پر مشتمل طویل مضمون

۱۹	ماہنامہ اشرف العلوم، سہارنپور	سفرنامۂ حجاز (حصۂ اول) (۵ قسط)	محرم تا جمادی الاول ۱۳۵۴ھ
۲۰	ماہنامہ ندائے حرم کراچی	سفرنامۂ حجاز (حصہ دوم)	
۲۱	ماہنامہ الرشاد، سہارنپور	ولادت محمدیہ کا راز (حصہ اول)	
۲۲	ماہنامہ النور، تھانہ بھون	ولادت محمدیہ کا راز (حصہ دوم)	جمادی الاولی ۳۹ھ تا ذی قعدہ ۵۲ھ
۲۳	ایضاً	حوائج بشریہ اور تعلیم نبوت (۳ قسط)	اواخر ۱۳۴۰ھ تا اوائل ۱۳۴۱ھ
۲۴	ایضاً	انکشاف الحقیقۃ عن استخلاف الطریقۃ (۲ قسط)	شعبان و رمضان ۱۳۴۱ھ
۲۵	ایضاً	القول المیسور فی تسہیل اثبات الستور	صفر المظفر ۱۳۴۷ھ ()

ماہنامہ النور، تھانہ بھون میں مولانا مرحوم کے علمی مضامین مستقل شائع ہوتے تھے، بہت سے مقالات بالاقساط شائع ہوئے اور بعد میں کتابی شکل اختیار کر لیتے تھے، اس لئے ان کے ذکر کی یہاں ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ علاوہ ازیں فتاوی میں بھی آپ کا اہم مقام رہا ہے۔ آپ کے فتوے اگرچہ منضبط شکل میں نہیں ملتے تاہم مولانا اشرف علی تھانوی کی امداد الفتاوی میں بہت سے فتاوی پر آپ کی رائے لی گئی ہے، جن میں ''نہایۃ الادراک فی اقسام الاشراک'' اور ''دیوناگری وانگریزی رسم الخط میں قرآن پاک کی کتابت سے متعلق'' فتووں نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہاں ہم نے مولانا کے صرف ان مضامین کا اشاریہ دیا ہے جو علمی دنیا میں بے حد مقبول ہوئے اس باب کو یہیں پر ختم کرتے ہوئے ہم دوسرے باب میں مولانا ظفر صاحب کی اردو کتب کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

دوسری فصل: مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی اردو تصانیف وتراجم

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اگر چہ اپنی عربی زبان وادب سے دل چسپی کے باعث عربی زبان میں لکھتے تھے، اور شعر و شاعری بھی عربی زبان میں ہی کرتے تھے۔ تاہم انہوں نے عوامی ضروریات اور اپنے شیخ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حکم کے مطابق اردو زبان میں بھی تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ اسی طرح جب عربی زبان وادب کی کوئی ایسی چیز سامنے آتی جس کو اردو میں منتقل کرنا ضروری سمجھا جاتا تو مولانا مرحوم اس کام کو بھی بے تکلف کرتے۔ خصوصاً تصوف کے فن میں بہت سی ادق کتابوں کا آپ نے سہل اردو میں ترجمہ کر کے فن ترجمہ نگاری اور اردو زبان دونوں کی ہی خدمت کی اور عربی علوم وفنون کو آسان اردو میں منتقل کر کے اہل علم و دانش سے دادِ تحسین وصول کی۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں مولانا مرحوم کی کچھ اردو تصنیفات و تالیفات وتراجم کا مختصر ترین جائزہ لے لیا جائے تاکہ مولانا کی شخصیت کا یہ گوشہ بھی سامنے رہے۔ پہلے کچھ تراجم کا تذکرہ۔

۱- البنیان المشید :-

شیخ احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ (۵۱۲-۵۷۸ھ) مشہور ومعروف صاحب نسبت بزرگ گذرے ہیں۔ آپ نے لوگوں کو رشد وہدایت کے راستہ پر چلنے کی ترغیب دی اور اپنے مواعظ سے مخلوق کو فیض پہونچایا[۱]، آپ کے مواعظ کا عربی مجموعہ ''البرہان المؤید'' کے نام سے معروف ہے۔ پیشِ نظر کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ پر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تقریظ بھی ہے۔ اس کے بعد مترجم مرحوم نے شیخ احمد کبیر رفاعیؒ کے مختصر حالات بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد دیباچہ میں اس کتاب کے ترجمہ کی ضرورت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف عناوین کے تحت قلم بند کئے گئے ہیں جن کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ عوام تصوف وسلوک کی ماہیت وحقیقت سے واقف ہو کر اپنے اندر اخلاقِ عالیہ پیدا کریں اور بری باتوں سے پرہیز کریں نیز تصوف کے بارے میں پیدا شدہ افراط وتفریط سے بچ کر اس کی صحیح جان کاری حاصل کرسکیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں تصوف کی اصلیت کیا ہے؟ کیا وہ ارکانِ اسلام کا پابند ہوئے بغیر قابلِ قبول ہے؟ بدعت سے بچنا کس لئے ضروری ہے۔ بندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اولیاء اللہ اور اہل بیت کی محبت کے کیا فائدے ہیں؟ زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ توحید خالص کس کو کہتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا کیوں ضروری ہے؟ وغیرہ وغیرہ چھوٹے بڑے تقریبا سو سے زائد عنوانات پر مشتمل یہ کتاب برِصغیر میں شہرت ومقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

---

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے: البنیان المشید (اردو ترجمہ: البرہان المؤید) / مولانا ظفر احمد عثمانیؒ / صدیقی بک ڈپو لکھنؤ ۱۳۵۲ھ / ص: ۶-۱۰۔

شیخ رفاعی نے جگہ جگہ مناسب انداز میں اپنے شعری ذوق کا اظہار کیا ہے جس کا مترجم نے خاص لحاظ رکھا ہے۔ عربی اشعار دے کر نیچے الگ سے ان کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے تقریباً ہر باب میں موقع محل کی مناسبت سے عارفانہ اشعار پیش کئے ہیں۔ اس طریقہ پر سید کبیر رفاعی علیہ الرحمۃ کی ''البرہان المؤید'' اگر چہ تصوف وسلوک کی منزلیں طے کرنے والوں کے لئے ایک راہ نما کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس کی ادبی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا ظفر احمد عثمانی کے اردو ترجمہ ''البنیان المشید'' نے اس ذوق کو اور جلا بخشی ہے۔ آپ نے ترجمہ میں مناسب مواقع پر عربی اشعار کیساتھ ساتھ فارسی اور اردو اشعار کو اتنے دل کش انداز میں سمویا ہے کہ وہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل تصنیف معلوم ہونے لگتی ہے، نیز ترجمہ کی سلاست و روانی، اور عبارت آرائی و رنگینی نے بھی اس ترجمہ کو تصنیف کی شکل دے دی ہے جس میں معرفت کے سربستہ رازوں کا افشاء بھی ہے اور تصوف وسلوک کی منازل طے کرنے کے طریقے بھی۔ عربی کے خوبصورت اشعار بھی ہیں اور اردو کی بیش قیمت مثالیں بھی۔

۲-روح تصوف مع عطرِ تصوف:-

یہ مختصر سا رسالہ ہے، جو مذکورہ بالا کتاب کے اخیر میں شامل اشاعت ہے (علاوہ ازیں الگ سے بھی شائع شدہ ہے) ۔ درحقیقت اسے البنیان المشید کی تلخیص کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس میں سالکین طریقت کو تصوف وسلوک کے وہ طریقے مختصر مگر جامع انداز میں بتلائے گئے ہیں جن پر چل کر معرفتِ وعرفان کے راستے آسان ہو جاتے ہیں۔

۳-مرام الخاص:-

سید احمد کبیر رفاعی کے عربی رسالہ النظام الخاص کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی با محاورہ، سلیس اور دل چسپ ہے، حاشیہ پر موقع بہ موقع حضرت مولانا تھانوی کی تحقیقات کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حُسنِ معاشرت، تمدن، اور اخلاق کو بڑے عمدہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔[1]

۴-الدر المنضو د فی ترجمۃ البحر المورود:-

علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ (۸۹۸-۹۷۳ھ) اپنے عہد کے تصوف کے امام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کی پیدائش قلقشندہ (مصر) میں ہوئی جو آپ کی والدہ کا وطن تھا، چالیس دن بعد وہ ان کے آبائی وطن ''شعران'' واپس لوٹیں اس نسبت سے ''شعرانی'' مشہور ہوئے[2]۔ آپ نے فن تصوف میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ایک کا نام ''البحر المورود'' ہے۔

---

(۱) علمائے مظاہر علوم اور ان کی تصنیفی خدمات/ص:۱۷۱۔

(۲) الشعرانی، امام التصوف فی عصرہ/الدکتور توفیق الطویل/دائرۂ معارف اسلامیہ، مصر، ۱۹۴۵ء/ص:۱۷۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی خواہش پر مولانا ظفر صاحب نے ''البحر المورود'' کا اردو ترجمہ ''الدر المنضود'' کے نام سے کیا۔ البحر المورود میں علامہ شعرانی نے اپنے مشائخ کے ان معاہدوں کو جوان سے لئے گئے تھے اور ان وصیتوں کو جوان کو کی گئی تھیں جمع فرمایا۔ مولانا نے اس کا ترجمہ تین حصوں میں کیا ہے۔ پہلا حصہ کتابی شکل میں چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے، جس پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تقریظ بھی شامل ہے اس میں کتاب کی اہمیت وافادیت بھی اجاگر کی گئی ہے۔ یہ حصہ ۱۳۳۸ھ میں لکھا گیا۔ اس کے بعد کے دونوں حصے ماہنامہ الامداد، تھانہ بھون میں بالاقساط شائع ہوئے، جنہوں نے بعد میں کتابی شکل اختیار کرلی، یہ کتاب فن تصوف میں ہے اور اس کے کچھ حصے ماہنامہ ''النور'' تھانہ بھون میں بھی شائع ہوئے۔ [1]

۵- الاسباب المحمودیۃ فی ترجمۃ آداب العبودیۃ:-

علامہ شعرانی علیہ الرحمۃ کا ایک اور رسالہ ''آداب العبودیۃ'' کے نام سے ہے۔ یہ رسالہ بھی تصوف سے متعلق ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا ظفر صاحب نے سلیس اور شگفتہ اردو میں کیا جو ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون میں بالاقساط شائع ہوا۔ بعد میں اسے کتابی شکل دی گئی۔ کتابی شکل میں یہ ترجمہ مختلف اوقات میں طبع ہوتا رہا۔ اس کو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی طباعت مکتبہ تھانوی، کراچی سے بھی ہوئی۔ [2]

۶- رحمۃ القدوس فی ترجمۃ بہجۃ النفوس:-

علامہ ابو محمد عبداللہ ابن ابی حمزۃ مالکی کی تصنیف ''بہجۃ النفوس'' کا اردو ترجمہ مولانا نے مولانا تھانویؒ کے حکم سے کیا۔ یہ بھی فنِ تصوف سے متعلق ہے، لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ مالکی نے بخاری شریف سے تین سو احادیث کا انتخاب فرمایا اور پھر ان سے مسائلِ تصوف اور فقہی مسائل مستنبط فرمائے، نیز ان احادیث میں جو اشکالات آتے تھے ان کے جوابات بھی لکھ دئے۔

مولانا نے اپنے ترجمہ میں یہ لحاظ رکھا کہ ان تین سو احادیث میں سے صرف ایک سو احادیث کو منتخب کیا۔ پھر ان کی شرح وتحقیق لکھی جو مجموعی طور پر دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد تین سو چھیالیس اور دوسری جلد چار سو باون (۴۵۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ جلد ۳ کے بعد مولانا نے اس کام کو آگے بڑھاتے ہوئے حدیث ۱۰۱ سے کام شروع کیا۔ بعد میں یہ انتخاب بخاری شریف کے نام سے بھی شائع ہوا۔ [3]

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: علمائے مظاہر علوم ..... /ص:۱۶۵۔

(۲) الاسباب المحمودیہ فی ترجمۃ آداب العبودیہ/ مکتبہ تھانوی، کراچی، بدون سن۔

(۳) انتخاب بخاری شریف/ ادارہ اسلامیات، لاہور، بدون سن۔

۷-الانوار المحمدیۃ فی ترجمۃ الترغیب والترہیب:-

الحافظ الکبیر شیخ الاسلام زکی الدین ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی بن عبداللہ بن سلامۃ بن سعد بن سعید المنذری الشامی ثم المصری (۵۸۱-۶۵۶ھ/۱۱۸۶-۱۲۵۹ء) مشہور حافظ حدیث ہیں، [۱] آپ کی متعدد تصانیف نے شہرت ومقبولیت حاصل کی، لیکن جومقبولیت آپ کی تصنیف ''الترغیب والترہیب'' کوحاصل ہوئی وہ دوسری تصانیف کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ [۲]

حافظ منذریؒ نے اس کتاب یعنی الترغیب والترہیب میں ان احادیث کوجمع کیا ہے جونیک اعمال پر اجروثواب اور بدعملیوں پر سزاوعذاب کے مضمون سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے اقوال پر مشتمل ہیں۔ [۳] اس کتاب کی متعدد شروحات و تلخیصات وتراجم مختلف زبانوں میں شائع ہوئے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی فرمائش پراس کے مختلف حضرات نے تراجم کئے جوماہنامہ ''الہادی''، دہلی میں بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ پہلا ترجمہ مولانا محمد اسحاق بن عبداللہ میرٹھی نے ''التأدیب والتہذیب'' کے نام سے کتاب الصدقات تک کیا، اس کے بعد کا ترجمہ مولانا ظفر صاحب کا ہے جو''الانوار المحمدیۃ'' کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ اس کومستقل تالیف کی حیثیت دے دی، اور جابجا حدیث کی شرح وفوائد کا بھی اضافہ کردیا۔ حضرت تھانویؒ علیہ الرحمۃ نے اس کے ہرحصہ کوانوار سے موسوم فرمایا۔ [۴] مثلاً انوارالعلوم، انوارالجہاد، وغیرہ۔ مولانا مرحوم کا یہ ترجمہ انوارالدعاء کے آخیر تک ہے، یہ ترجمہ بامحاورہ ہےاور سابقہ ترجمہ کی بہ نسبت اس میں تشریحات بھی زیادہ ہیں۔ [۵]

۸-نزہۃ البساتین فی ترجمۃ روض الریاحین:-

حضرت امام یافعی علیہ الرحمۃ کی کتاب ''روض الریاحین'' کا ترجمہ آپ نے حضرت تھانویؒ علیہ الرحمہ کی ایماء پر ''نزہۃ البساتین'' کے نام سے کیا جوشائع شدہ ہے۔ اس ترجمہ کی خاصیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کومولانا تھانویؒ نے خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون کے درس میں داخلِ نصاب فرمایا تھا۔ [۶]

---

(۱) انتخاب الترغیب والترہیب/ حافظ ذکی الدین المنذری، اردو ترجمہ: عبداللہ دہلوی/ ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۷۳ء/ص:۲۳۔

(۲) ایضاً/ص:۳۹۔

(۳) ایضاً/۴۰۔

(۴) علمائے مظاہر علوم/ص:۱۶۷۔

(۵) انتخاب الترغیب والترہیب/ص:۶۰۔

(۶) تذکرۃ الظفر/ص:۱۸۲۔

۹-لباب النعمۃ:-

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۴۵۰ھ/۵۰۵ھ) بغداد کے طوس ضلع کے طاہران نامی قصبہ میں پیدا ہوئے۔[۱]
انہوں نے زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ لیتے ہوئے کلام و منطق، فلسفہ و حکمت وغیرہ کی حقیقتوں سے عوام کو روشناس کرایا۔[۲] آپ کی تمام تصنیفات نے عالم گیر شہرت حاصل کی جن میں اکثر و بیشتر علوم و فنون کا سرچشمہ تصور کی جاتی ہیں۔
انہیں میں ایک کتاب ''الحکمۃ'' ہے جس کا ترجمہ مولانا نے حکیم الامت کے حکم پر ''لباب النعمۃ'' کے نام سے کیا۔

''الحکمۃ فی مخلوقات اللہ عز وجل'' میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات مثلاً آسمان، دنیا، سورج، چاند ،ستارے، دریا، پانی، آگ، انسان، پرندے، چوپائے، شہد کی مکھی، چیونٹی، مکڑی، مچھلی، و نباتات وغیرہ کی پیدائش کی حکمتیں آیاتِ قرآنی، احادیث مبارکہ و تفاسیر کی روشنی میں اپنے انداز میں بیان کی ہیں۔ امام غزالیؒ نے اس کا مقصدِ تالیف اللہ کی مخلوقات اور نعمتوں میں غور فکر بتایا ہے۔[۳]

---

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت/ ج:۱/ص:۱۳۰۔

(۲) ایضاً / ج:۱/ص:۱۸۹۔

(۳) الحکمۃ فی مخلوقات اللہ عز وجل، للامام ابی حامد محمد بن محمد الغزالی/ مطبوعہ: مصر ۱۳۵۲ھ-۱۹۳۴ء/ص:۲۔

مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عربی کتاب کے مفید تراجم کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی کیا۔ اردو زبان میں ان کی بہت سی کتابوں نے مقبولیت حاصل کی، جن کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱-تلخیص البیان:-

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید کے اردو ترجمہ کے علاوہ تفسیر بھی کی تھی، جو بیان القرآن کے نام سے مشہور ومعروف ہے۔ یہ تفسیر عوام وخواص میں آج تک مقبول ہے۔ مولانا جب ۱۳۳۹ھ میں سفر حج سے واپس تشریف لائے تو مولانا تھانویؒ کے ارشاد کے مطابق خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں مقیم ہو گئے۔ اس موقع پر مولانا تھانویؒ نے اپنے اس مایہ ناز شاگرد کے ذمہ بیان القرآن کی تلخیص کا کام کیا، جو آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ یہ تلخیص حمائل شریف کے حاشیہ پر اشرف المطابع، تھانہ بھون سے شائع ہوئی، لیکن اب نایاب ہے۔

۲-الشفاء:-

یہ تفسیری مضامین کا مجموعہ ہے جو سوال وجواب کی شکل میں مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب دیا تھا۔ یہ مجموعہ پہلے ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون میں تقریباً دو سال تک بالاقساط شائع ہوتا رہا، بعد میں اس نے کتابی شکل اختیار کرلی۔ اس کتاب میں مولانا مرحوم نے ان اعتراضات وجوابات کو یکجا کیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے قرآن کریم پر مختلف اوقات میں کئے گئے۔ ان کے تشفی بخش جوابات مولانا مرحوم نے دئے۔ یہ جوابات زیادہ تر تفسیر بیان القرآن سے اخذ کئے گئے ہیں۔ مولانا نے ان مضامین کو بعد میں کتابی شکل دے دی۔

۳-امداد الاحکام فی مسائل الحلال والحرام:-

یہ مولانا ظفر احمد صاحب کے ان فتاوی کا مجموعہ ہے جو مولانا نے اپنے استاد ومربی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشاغل وعوارض کی بنا پر فتاوی کا سلسلہ بند کر دینے کے بعد حضرت کے حکم پر اس خدمت کو انجام دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مولانا اشرف علیؒ کے بعد فتاوی نویسی کا کام آپ ہی کے سپرد کیا گیا تھا۔ آپ کی فتوی نویسی کے متعلق مولانا تھانوی نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''مولانا کے فتاوی پر مجھے تقریباً ایسا ہی اطمینان ہے جیسا کہ خود اپنے لکھے ہوئے فتاوی پر''۔ مولانا کے ان فتاوی کا ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو گیا تھا، جس کا نام حضرت تھانویؒ نے ''امداد الاحکام'' تجویز فرمایا۔ اس کا کچھ حصہ بالاقساط ماہنامہ ''الہادی''، دہلی میں شائع ہوا، لیکن بعد میں تمام فتاوی کو مرتب کر کے کتاب کی صورت میں ''امداد الاحکام فی مسائل الحلال والحرام'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ یہ کتاب خاصی ضخامت لئے ہوئے ہے۔ بعد میں اس کتاب کو جدید اور خوبصورت انداز پر دار العلوم، کراچی سے شائع کیا گیا، جس پر مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مولانا مفتی محمد رفیع صاحب کا مقدمہ ہے۔ (۱)

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے: امداد الاحکام فی مسائل الحلال والحرام/مولانا ظفر احمد عثمانی/مکتبہ دار العلوم، کراچی، بدون سن۔

۴-فاتحۃ الکلام فی القرأۃ خلف الامام:-

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اوران کے متبعین کے نزدیک امام کے پیچھے مقتدی کے لئے قرأت فاتحہ واجب نہیں۔مولانا مرحوم چوں کہ متشدد قسم کے حنفی تھے،اس لئے انہوں نے اس مسئلہ میں مسلک حنفیہ کی توضیح وترجمانی میں احادیث مبارکہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ احناف کا مسلک درست ومناسب ہے۔ (۱)

۵-سفرنامہ حجاز:-

مولانا جب دوسری مرتبہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو اس مبارک سفر (یہ سفر مولانا کی تحریر کے مطابق ۳ر شوال ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۵رفروری ۱۹۳۴ءکو شروع ہوا۔) (۲) کی تمام تفصیلات علمی انداز میں جمع فرمائیں۔لیکن اس کی اہمیت، افادیت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے کتابی شکل دے دی گئی،جس میں اضافے بھی ہوئے۔ یہ کتاب بصیرت افروز معلومات کے ذخیرہ کے علاوہ عازمینِ حج کے لئے نہایت ہی مفید ہے،اس سفر میں مولانا نے عربی ادب کے دو بلند پایہ نعتیہ قصائد بھی موزوں کیے،جو''نورعلی نور'' کے نام سے طبع ہوئے۔اس سفرنامہ کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ بعد میں یہ تین جلدوں میں ہوگئی،جس کی دوسری جلد ماہنامہ ''ندائے حرم'' میں قسط وار شائع ہوئی، (۳) اور مولانا نے اس کی تیسری جلد بھی ترتیب دی،جس کا مسودہ مولانا کی حیات تک محفوظ تھا،طبع ہوا یا نہیں،اس کی تحقیق نہیں ہوسکی۔

۶-اسلام میں پردہ کی حقیقت:-

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے پردہ کی تائید وحمایت میں ''ثبات الستور'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔جو اپنی ادق اور مشکل عبارتوں کے باعث عوام کی رسائی سے باہر تھا۔مولانا نے اس پر کام شروع کیا اور اسے عوام کو سمجھانے کی خاطر نہ صرف آسان اردو میں منتقل کردیا، بلکہ جہاں کہیں اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی اضافے بھی کردئے،جس نے تالیف کی شکل اختیار کرلی،اس کا نام آپ نے'القول المیسور فی تسہیل ثبات الستور'' رکھا،جو کتاب کی صورت میں ''اسلام میں پردہ کی حقیقت'' کے نام سے طبع کرایا،اور بہت زیادہ مقبول ہوا۔ (۴)

---

(۱) علمائے مظاہر ۰۰۰۰۰ /ص:۱۶۶۔

(۲) سفرنامہ حجاز وزیارت حرمین شریفین/مولانا ظفر احمد عثمانیؒ/امداد الغرباء،سہارنپور ۱۹۵۴ء/ص:۱۔

(۳) علمائے مظاہر علوم اوران کی تصنیفی خدمات/ص:۱۶۸۔

(۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ''اسلام میں پردہ کی حقیقت'' (القول المیسور فی تسہیل اثبات الستور)/مولانا ظفر احمد عثمانیؒ/اشرف المطابع، تھانہ بھون ۱۹۴۷ء۔

۷-القاء السکینۃ فی تحقیق ابداء الزینۃ :-

یہ رسالہ بھی پردہ کے سلسلہ کی ہی دوسری کڑی ہے۔ جو حجم کے اعتبار سے تو بہت مختصر، لیکن مضمون کے اعتبار سے بہت وقیع ہے۔ اس کتاب میں آپ نے پردہ کے متعلق تمام آیات قرآنیہ کی تفسیر اور ان کی بے مثل تحقیق پیش کی ہے، اور پردۂ مروجہ کو ثابت کیا ہے۔ یہ مختصر رسالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے جامع اور مفید ہے۔ (۱)

۸-ولادتِ محمدیہ کا راز :-

یہ اسلامی تاریخ پر مولانا کا ایک طویل مضمون تھا، جس میں سیرت کے اہم اہم پہلوؤں پر خصوصی طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب مولانا نے سہارنپور کے زمانۂ قیام میں ترتیب دی تھی، لیکن اسے شائع کرانے کی فرصت نہیں مل سکی تو ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون اور ماہنامہ ''الرشاد''، سہارنپور کے مدیران کی خواہش واصرار پر ان کے حوالے کردی، جنہوں نے ان کو مذکورہ بالا رسائل میں قسط وار شائع کیا۔ بعد میں یہ کتابی شکل میں شائع ہوئی یا نہیں، اس کی تحقیق نہیں ہو سکی۔

۹-انوار النظر فی آثار الظفر :-

مولانا علیہ الرحمہ کی خود نوشت سوانح ہے، جو دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصہ میں تعلیم و تدریس سے لے کر قیام پاکستان تک کے واقعات اور دوسرے حصے میں اپنی زندگی کے بیش قیمت واقعات درج فرمائے ہیں۔

۱۰-القول المنصور فی ابن منصور :-

ابو المغیث الحسین بن منصور بن محمی البیضاوی ۲۴۴ھ/ ۸۵۷ء میں صوبہ فارس کے مشہور شہر ''البیضاء'' کے شمال مشرق میں ''الطّور'' نامی مقام پر پیدا ہوئے۔ (۲) حسین بن منصور نسلاً ایرانی تھے، ان کا دادا پارسی تھا، باپ اسلام لائے تھے۔ (۳)

اہل ہند آپ کو ابو المغیث، اہلِ چین ابو المعین، اہلِ خراسان ابو المغیر، اہلِ فارس ابو عبد اللہ زاہد، اہلِ خورستان حلاج الاسرار، اہلِ بغداد مصطلم اور اہلِ بصرہ آپ کو محیَّر کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ (۴) حلاج کی شخصیت علماء کے درمیان متنازعہ رہی ہے۔ بہت سے علماء نے ان کے مختلف عقائد کی وجہ سے منصور حلاج کو خارج از اسلام قرار دیا، لیکن علمائے حق کا

---

(۱) علمائے مظاہر علوم ۰۰۰۰/ص: ۱۶۷۔

(۲) دائرۂ معارف اسلامیہ (اردو)/ دانش گاہِ پنجاب، لاہور ۱۹۷۳ء/ ج: ۸، ص: ۵۲۹۔

(۳) ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ، ۲/۴، اکتوبر ۱۹۱۷ء۔

(۴) انوار الاتقیاء/ محمد برکت اللہ رضا فرنگی محلی/ مکتبہ رحیمیہ، دیوبند ۱۳۹۱ھ/ ج: ۲، ص: ۶۵۔

ایک خیر پسند طبقہ ان کے ان عقائد کو ''احوال'' کا عنوان دے کر ان کی بزرگی کا قائل رہا۔ انہیں بزرگوں میں مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی تھے، جنہوں نے ایک رسالہ حسین بن منصور الحلاج کے اشعار کی شرح میں لکھا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اگر کوئی شخص ابن منصور کے تاریخی حالات واقعات کو قلم بند کر دیں تو زیادہ بہتر ہو، مولانا کے دل میں اس خواہش کو پورا کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے حضرت تھانویؒ کی اجازت سے یہ تالیف شروع کر دی۔ اس تالیف کا مقصد علمائے متقدمین کی ان بدگمانیوں کو دور کرنا تھا جو اس دور میں منصور بن حلاج کے متعلق پیدا ہو گئی تھیں۔ (۱)

مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اس کتاب میں حلاج کی پیدائش، تعلیم وتربیت، ان کے عقائد وغیرہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کی تالیف سے مولانا اس وقت فارغ ہوئے، جب کہ وہ بغرضِ ملازمت بنگلہ دیش میں مقیم تھے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حسین بن منصور حلاج کے سلسلے میں افراط وتفریط سے پاک اور علمائے اہلِ سنت والجماعت کی فکر کے مطابق ہے۔ جس کا اظہار خود حضرت تھانویؒ نے اس پر لکھی ہوئی تقریظ میں کیا ہے۔ (۲)

حلاج کے تعلق سے قدیم زمانہ سے چلی آ رہی غلط فہمیوں کو اس کتاب کے ذریعہ معتبر روایات اور بزرگوں کے اقوال کی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور حلاج کی دعوت کا صحیح مقصد مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ ہر آدمی کو اس قابل بنانا چاہتا تھا کہ آدمی اپنے ہی دل کے اندر اللہ تعالیٰ کو تلاش کر سکے۔ علمائے متقدمین ومتاخرین کو اس دعوت اور اس کے طریقے پر جو اعتراضات ہیں ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے۔ علمائے کرام کے حلاج سے اختلاف کی اصل ان کی دعوت کا یہ طریق کار ہی تھا، کیوں کہ یہ اسرار ورموز کی باتیں تھیں، جنہیں ہر کس وناکس کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ غالبًا اسی وجہ سے اس کا ایک نام ''حلاج الاسرار'' (بھیدوں کا دُھنتے والا) پڑا۔ (۳) المختصر حسین بن منصور المعروف بہ حلاج کی شخصیت کو سمجھنے اور اس کی دعوت کا تعارف مولانا نے مذکورہ کتاب میں بہت مناسب انداز میں افراط و تفریط سے مبرا ہو کر کرایا ہے۔ قدیم طرزِ طباعت کی معیاری کتابت وطباعت سے آراستہ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو یونائیٹڈ پریس، لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ اگر چہ سن طباعت درج نہیں ہے، لیکن آخری صفحہ پر شائع شدہ دائمی جنتری سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اکتوبر ۱۹۴۰ء میں طبع ہوئی ہوگی۔

---

(۱) القول المنصور فی ابن منصور/ مولانا ظفر احمد عثمانی/ یونائیٹڈ پریس، لکھنؤ، بدون سن/ ص:۵۔

(۲) ایضاً/ ص:۲۔

(۳) دائرۂ معارفِ اسلامیہ/ ج:۸، ص:۵۳۰۔

۱۱- مسئلہ ترکِ موالاۃ:-

ہندوستان کے سیاسی حالات کے پسِ منظر میں یہ مولانا کا مختصر ترین رسالہ ہے، جس میں مسلمانوں کی کانگریس میں شمولیت پر علمی انداز میں تنقید کی گئی ہے۔اس کا روئے سخن ان علمائے کرام کی طرف ہے جو کانگریس کی حمایت میں پیش پیش تھے۔مولانا مرحوم چونکہ نظریاتی طور پر کانگریس کو مسلم دشمن تصور کرتے تھے، اسی وجہ سے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''افسوس کہ لیڈرانِ قوم نے اس وقت اپنے سچے خیر خواہوں کو بد خواہ اور حقیقی دشمنوں کو خیر خواہ سمجھ لیا ہے۔''[۱] اس رسالہ کی تالیف کی اہم وجہ یہ ہوئی کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کانگریس کی تحریک ترک موالات میں شامل مسلمانوں کو اس سے روکنے کے لئے شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں ایک استفتاء کے جواب میں فتوی دیا تھا، جو کانگریسی علمائے کرام اور کانگریس حامی مسلمانوں کو بہت زیادہ ناگوار گذرا۔اس ناراضگی کے جواب میں مولانا مرحوم نے یہ مختصر رسالہ ترتیب دیا، جو چھوٹے سائز کے صرف بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۲- تحذیر المسلمین عن موالاۃ المشرکین:-

یہ کتاب بھی اسی سیاسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔اس کا مقصد مسلمانوں کو ان فتنوں سے آگاہ کرنا ہے، جو کفار و مشرکین سے موالات اور دوستی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں اور پھر ان تعلقات اور مودت ومحبت کی وجہ سے اسلامی احکام، شرعی حدود اور مسلم تہذیب وثقافت پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔یہ کتاب بھی ۱۳۳۹ھ کی مطبوعہ ہے۔اس پر تاریخِ تصنیف ۱۳/محرم ۱۳۳۹ھ پڑی ہوئی ہے۔غالبًا مذکورہ بالا دونوں کتابیں ایک ہی وقت میں (کچھ وقفہ کے فرق سے) لکھی گئی ہیں۔[۲]

۱۳- فضائل جہاد:-

مسلمانوں میں اسلامی جہاد اور دینِ حق کے لئے ہر طریقہ کی کوششیں کرنے کے لئے نیز حق کی خاطر باطل قوتوں سے قتال کے جذبہ کو زندہ رکھنے کے لئے یہ مختصر سی تالیف ہے۔چھیالیس احادیث مبارکہ جہاد کے تعلق سے جمع کی گئی ہیں۔[۳]

---

(۱) مسئلہ ترک موالاۃ/مولانا ظفر احمد عثمانی/علی گڑھ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، ۱۳۳۹ھ/ص:۲۰۔

(۲) تحذیر المسلمین عن موالاۃ المشرکین/ظفر احمد عثمانی/اشرف المطابع، تھانہ بھون ۱۳۳۹ھ۔

(۳) فضائل جہاد/مولانا ظفر احمد عثمانی/مکتبہ دار العلوم، کراچی ۱۳۹۲ھ۔

۱۴- القول الماضی فی نصب القاضی:-

ممالک اسلامیہ میں مقدمات کونمٹانے کی خاطر قاضیوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی یہ سلسلہ جاری تھا جب اسے بند کرنے کی سازشیں اپنے اثرات دکھانے لگیں تو مولانا مرحوم نے مذکورہ کتاب لکھی۔ اس کتاب میں قاضی کے تقرر کی ضرورت کو شرعی طور پر ثابت کر کے اس کی ضرورت واہمیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ (۱)

مولانا کی مذکورہ بالا کتب اردو کی وہ مشہور ومقبول تصنیفات وتالیفات ہیں جن کا مختصر تعارف کرانا ہم نے ضروری سمجھا۔ علاوہ ازیں مولانا کی بہت سی ایسی تصنیفات بھی ہیں جو یا تو منظر عام پر نہیں آئیں، یعنی ان کے شائع ہونے کی نوبت ہی نہیں آسکی، یا پھر وہ کسی وجہ سے اس درجہ پر نہیں پہونچ سکیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی اردو کاوشوں کا تذکرہ یہیں پر ختم کر کے مولانا کی عربی تصنیفات وتالیفات پر نظر ڈالی جائے، تاکہ مولانا کی عربی علوم وفنون سے دلچسپی کا اندازہ ہو سکے۔

---

(۱) القول الماضی فی نصب القاضی/ مولانا ظفر احمد عثمانی/ اشرف المطابع، تھانہ بھون ۱۳۴۵ھ۔

تیسری فصل :عربی تصانیف وتالیفات

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ عربی شعروادب سے گہرا شغف رکھتے تھے، بلکہ وہ ایک عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے قرآن وحدیث پر بھی کافی عبور رکھتے تھے، اور تفہیم وتشریح کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات پر قابلِ قدر خدمات انجام دیں جو اپنے مضامین کے اعتبار سے نہایت پیچیدہ تھے۔ اسی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ انہیں اردو سے زیادہ عربی زبان میں اظہارِ خیال پر قدرت تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ''اعلاءالسنن'' (جو بیس ضخیم جلدوں میں ہے)، ''احکام القرآن بدلائل القرآن علی مسائل النعمان'' اوران کے عربی نعتیہ قصائد، تقاریظ ومراثی کی شکل میں موجود ہیں، جو علمی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اخلاص وللّٰہیت کے جذبہ کے تحت تعریف وتوصیف سے بے نیاز ہوکر مولانا نے ان موضوعات کا حق اپنی حد تک پورا پورا ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا اعتراف اس وقت سے اب تک کیا جارہا ہے، لیکن بہرحال یہ انسانی کوشش ہے جس کو حرفِ آخر نہیں کہا جاسکتا۔ مولانا کی عربی زبان وادب کی خدمات کا جائزہ درج ذیل سطور میں قدرے تفصیل سے لیا جارہا ہے، تاکہ مولانا کی ان خدمات کا وضاحتی تعارف ہوسکے۔

اعلاءالسنن:-

مولانا فقہ حنفی کے معتبر ترین عالم تھے، اور مسائل فقہیہ میں انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسائل کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا، جس کے نتیجہ میں انہوں نے اپنے مرشد ومربی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایماء پر فقہ حنفی کے استدلال کے سلسلے میں احادیث کو جمع کیا۔ یہ کتاب معرکۃ الآراء مقدمہ ''انہاء السکن'' اور ''انجاء الوطن'' سمیت بیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تالیف کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حضرت تھانویؒ کی خواہش تھی کہ ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں صرف وہی احادیث ہوں جو حنفی مسلک کی تائید اور استدلال میں معاون ثابت ہوں، اور احناف ان احادیث کی تلاش وجستجو میں پریشان نہ ہوں۔[1] جب مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو مولانا نے ''جامع الآثار'' اور ''تابع الآثار'' نامی دو رسالے تصنیف فرمائے، جن میں ابواب الصلوٰۃ تک احناف کی قابلِ حجت احادیث جمع کریں۔ پھر تمام ابواب کے دلائل کا استیعاب کرنا چاہا اور احیاء السنن کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی، جس میں ابواب الحج تک تمام ابواب کی حدیثوں کو جمع کردیا گیا، لیکن جب اس پر نظرِ ثانی کرائی گئی تو اس میں اس قدر ترمیم وتنسیخ ہوگئی کہ وہ مولانا اشرف علی

(۱) علمائے مظاہر علوم اوران کی تصنیفی خدمات/ص:۱۶۱۔

کی تصنیف باقی نہیں رہی ، بلکہ مستقل کتاب ہوگئی ، جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ملتوی کردی گئی ۔ پھر آپ کی منشا کے مطابق مولانا تھانویؒ کے محبوب ترین شاگرد مولانا ظفر احمد صاحب کو اس خدمت کے لئے منتخب کیا گیا، جنہوں نے عرصۂ دراز کی محنت شاقہ کے بعد جملہ ابواب فقہیہ کے دلائل احکام حدیث سے جمع کر دیئے ۔[1] جس کی وجہ سے یہ کتاب حدیث وفقہ کا اعلیٰ ترین شاہ کار تو ہو ہی گئی، سلیس، سادہ اور مقفی و مسجع عبارتوں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بھی اس کی پذیرائی ہوئی ۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا عثمانی کی یہ کتاب تحقیق کے معیار پر پوری اترتی ہے ۔ اس کتاب کی تالیف سے پہلے ہندوستان کے بعض حلقوں کی طرف سے نامناسب انداز میں یہ بات پیش کی جارہی تھی کہ فقہِ حنفی کی بنیاد حدیثِ پاک پر نہیں ہے، اور اس میں قیاس سے کام لیا گیا ہے ۔ اعلاء السنن کے ذریعہ مولانا نے علمی انداز میں بغیر کسی مجادلہ وتنازعہ کے فقہِ حنفی کے دلائل صحیح احادیث سے جمع کر کے ان معترضین کو خاموش جواب دیا ہے ۔

اس کتاب کا تعلق تمام تر علمی تحقیقات سے ہے، جس کی وجہ سے اس میں ادبی چاشنی بہت کم نظر آتی ہے، تاہم اس کا اسلوب اتنا دل کش اور پُر اثر ہے کہ اس کی ادبی حیثیت بھی تسلیم کی جاسکتی ہے ۔ یہ مولانا کا سب سے بڑا علمی کام ہے، جس نے ان کی محققانہ وعالمانہ حیثیت کو علمی حلقوں میں اجاگر کیا ۔

مولانا نے اس کتاب کا مقدمہ ''انہاء السکن'' ایک جلد میں مکمل کیا جس میں محدثین کے تصحیح وتضعیف کے طریقوں کے ساتھ حنفیہ کے تصحیح و تضعیف کے طریقوں کو بھی مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ پھر ان طریقوں کو اپنی کتاب میں جگہ جگہ نمایاں طور پر استعمال کیا ہے ۔ یہ مقدمہ عرب وعجم میں مقبول ہوا، جس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مشہور شامی محدث شیخ عبد الفتاح ابوغدۃ (۱۹۱۷ء - ۱۹۹۷ء) نے اسے تعلیقات وتحشیہ کے ساتھ ''قواعد فی علوم الحدیث'' کے نام سے مرتب کیا، جو حلب (شام)، بیروت اور پاکستان سے مختلف اوقات میں طبع ہوا، جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔[2]

مولانا کا اندازِ تحقیق بہت منصفانہ ہے، جس کا اعتراف بعد کے سبھی علماء کو ہے، اس سے قبل حنفیہ کے متدلات مختلف کتابوں مثلاً طحاوی، الجواہر النقیہ، احکام القرآن للجصاص، فتح القدیر، عمدۃ القاری، نہایۃ، نصب الرایۃ وغیرہ میں منتشر تھے ۔ آپ نے اعلاء السنن میں ان دلائل سے بہترین انتخاب کر کے فقہِ حنفی کو حدیثِ پاک سے مدلل کیا اور اختلافی مسائل میں نہایت منصفانہ انداز میں فریقین کے دلائل پیش کرنے کے بعد پوری احتیاط کے ساتھ راجح جانب کو مدلل کر کے پیش کیا ہے ۔ اس میں جہاں ایک طرف آپ نے محدثانہ انداز پر گفتگو کی ہے، وہیں فقیہانہ بحثوں کو بھی پورے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فقہِ حنفی کا کوئی بھی مسئلہ کتاب وسنت سے متعارض نہیں ہے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولانا نے یہ

---

(۱) ''سلسلۂ شاہ ولی اللہ کی خدماتِ حدیث'' / مولانا ظفر احمد عثمانی / معارف، اعظم گڑھ؛ ۶/۵۳؛ جون ۴۴ء؛ ص: ۴۱۴ ۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: ''قواعد فی علوم الحدیث'' / شیخ عبد الفتاح ابوغدۃ / مطبوعہ: حلب (شام) ۔

التزام بھی کیا ہے کہ مناسب مواقع پر مقفی مسجع عبارتوں سے اپنی اس شاہ کار تالیف کو ادب کا بھی رنگ دے دیا ہے، مثلاً انہاء السکن کے سرِ ورق کی کتاب کو قرآن کریم کی آیت "وأتوا البیوت من ابوابہا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون" سے استدلال کرتے ہوئے اپنی تالیف کے جواز کو ادبی اسلوب میں اس طرح پیش کیا ہے:

" لما دلت الآية بعموم المجاز أو بالقياس فى البيوت و الابواب على تحصيل المقاصد بواسطة المبادئ و الأسباب، و كانت اصول الحديث للحديث عند التقاة بمنزلة الابواب للابيات ، و كانت رسالة انهاء السكن كا لمقدمة لما فى كتاب اعلاء السنن من احاديث خير اهل الزمن ما دامت المنن و المحن ، اعتنى باشاعتها خدام مدرسة امداد العلوم فى تهانه بهون ، و قال الله تعالى من الفتن ما ظهر منها و ما بطن، و بالطبع محمدشبير على مالك اشرف المطابع فى تهانه بهون"۔ (۱)

مذکورہ تحریر کتاب کے سرِ ورق پر ہے، لیکن مسجع اور مقفی ہونے کے باعث مولانا کے ادبی ذوق کی شہادت کے لئے کافی ہے، اگلے اوراق میں اپنی کتاب کا تعارف کراتے ہوئے انہاء السکن (مقدمہ اعلاء السنن) کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی ہے:

" وسمى هذه المقدمة انهاء السكن الى من يطالع اعلاء السنن ، و هى تشتمل على مقدمة و فصول، و الله اسال التوفيق و القبول ، فهو خيرموفق و اكرم مسئول ،ورضاه هو المطلوب ، و ارجى مأمول"۔ (۲)

اس کے بعد علم حدیث کی مبادیات کے سلسلے میں اقسام حدیث پر تفصیلی کلام کیا ہے، جس کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔

مولانا نے جس طریقہ پر مقدمہ کی مناسبت سے قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہوئے انہاء السکن کے سرورق پر عبارت درج کی تھی اسی طریقہ پر احیاء السنن اور اعلاء السنن کی ہر جلد کے سرورق پر حدیث سے استدلال کرتے ہوئے پہلے حدیث رسول بیان فرمائی اس کے بعد اسی مناسبت سے عبارت بیان کی۔ علم حدیث کی مناسبت سے آپ نے سرورق پر یہ حدیث تحریر فرمائی:

" من احيا سنة حسنة من سنتى قد اميتت بعدى كان له من الاجر مثل من عمل بها"

پھر اسی مناسبت سے مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمایئے جس سے اس کے ادبی اسلوب کا پتہ چلتا ہے، فرماتے

---

(۱) انہاء السکن الی من یطالع السنن/ظفر احمد عثمانی/ اشرف المطابع، امداد العلوم، تھانہ بھون ۱۳۴۴ھ/ص:۱۔

(۲) ایضاً/ص:۴۔

ہیں:

"لما دلّ الحديث على فضل احياء السنن النبوية و اعلائها ،التى اميتت بالجهل و الطغيان ، و كان من فتن هذا الزمان ، سمى بعض المتشددين فى امانة السنن التى اصول الفروع للامام ابى حنيفة النعمان ، فلنيل فضل احياء هذه السنن و اطفاء الفتن،دُوِّن فى مدرسة امداد العلوم هذا الكتاب الملقب باعلاء السنن ، الذى احد اجزائها احياء السنن"۔ (۱)

مقدمہ اعلاء السنن کی افتتاحی عبارت میں مولانا مرحوم کی سلاست بیانی ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں:

"و ليكن هذا مسك الختام ، و الحمد لله الملك العلام،على متواتر احسانه و انعامه على هذا العبد الغريق فى الآثام ، و ازكى الصلوة و ابهى السلام على سيد ولد آدم سيدنا النبى محمد على الدوام ، و على آله و اصحابه البررة الكرام الى يوم القيام ، بل الى بقاء دار السلام ، وقع الفراغ من تاليفه ضحوة يوم الاثنين لتسع خلون من شهر رجب سنة اربع و اربعين و ثلثمأة و الف من هجرة سيد الأنام"۔ (۲)

اسی مقدمہ میں آگے چل کر بات اس طرح مکمل کرتے ہیں۔

"قد تمت المقدمة و الحمد لله الذى بعزته و جلاله تتم الصالحات ، و انا المفتقر الى رحمة ربه الصمد ، عبده ظفر احمد العثمانى التهانوى ، و فقه الله و اصحابه ، و صلى الله تعالى على سيد نا النبى محمد و على آله و اصحابه ابد الابد"۔ (۳)

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے حالات زندگی سے متعلق مقدمہ کا ایک پورا باب الگ سے کتابی شکل میں ''انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن'' کے نام سے شائع شدہ ہے، جس میں امام صاحب علیہ الرحمہ کیساتھ ان کے ساتھیوں اور علم حدیث کی خدمت کرنے والی مشہور شخصیتوں کے حالات زندگی شامل ہیں۔

امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے لئے ابتدائی کلمات سے بھی صاحب اعلاء السنن کے ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں:

---

(۱) احیاء السنن (جلد اول اعلاء السنن)/ اشرف المطابع ،امداد العلوم، تھانہ بھون ۱۳۴۱ھ/ص:۱۔

(۲) مقدمہ اعلاء السنن/ص:۱۱۲، نیز مقدمہ اعلاء السنن مع تعلیقات مولانا تقی عثمانی/ دار العلوم، کراچی/ ج:۱/ص:۲۰ و ۲۳۔

(۳) ایضاً/ص:۳۔

" الحمد لله الذی تفرد بالعزة و العظمة و البقاء و الکمال ، و قسم بین عباده الارزاق و الآجال ، و العلوم و الاعمال ، و جعلهم شعوبا و قبائل لیتعارفوا و ملوکا و سوقا لیتنافصوا ، و متبوعین و اتباعا لیتعادلوا ، و رؤساء و مرؤسین و فقهاء و مقلدین لیتکاملوا"۔[۱]

استدراک الحسن کے آخر میں مولانا عثمانی نے اپنا ایک خواب بیان کیا ہے، جس سے کتاب کے عنداللہ مقبول ہونے کا اشارہ ملتا ہے، اس کی عبارت بھی ادبی رنگ لئے ہوئے ہے، فرماتے ہیں:

رأیت فی المنام قبل اتمام هذه الرسالة بأیام کأنی ذاهب الی الخانقاه الامدادیة مع سیدی حکیم الامة دام بفیوضه الارشادیة فلما وصلنا الی الباب اذا الشیخ قد اقبل من جانب بسمت حسن علیه الثیاب ، و علیه من انوار الذکر و المعرفةو الجلال و الجمال جلباب ، فسلم علی الشیخ و علیّ و قال له مشیرا الی ان هذا رجل صالح جید ذو عشق و معرفة "۔[۲]

الغرض اعلاء السنن کے مختلف پہلوؤں سے مولانا کی ادبی حیثیت کا اندازہ مشکل نہیں ہے، حالانکہ احادیث مبارکہ اور ان سے فقہی مسائل کا استنباط، نیز ان مسائل کے علمی دلائل کا میدان ادبی نہیں ہوتا، لیکن مولانا کی ادب سے فطری دل چسپی یہاں بھی مخفی نہ رہ سکی۔

اعلاء السنن کی اس تالیف کا علمی خصوصاً حنفی حلقوں میں جس قدر خیر مقدم کیا گیا، اس کا ذکر طوالت سے خالی نہیں، عرب وعجم ہر جگہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ثبوت کے لئے یہی کافی ہے کہ مشہور شامی عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اس کتاب کو دیکھنے کے بعد ہندوستان کا سفر کیا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا، ان سے اجازت حدیث لی، اور صرف مقدمۂ اعلاء السنن میں مذکورہ احادیث کی تخریج کی اور ان پر حواشی تحریر کیے جسے علمی دنیا "قواعد فی علوم الحدیث" کے نام سے جانتی ہے۔ اسے علمی حلقوں میں حد درجہ مقبولیت حاصل ہے۔[۳] مشہور مصری عالم علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں:

و الحق یقال انی دهشت من هذا الجمع و من هذا الاستقصاء و من هذا الاستیفاء البالغ فی الکلام علی کل حدیث بما تقتضی به الصناعة متناً و سنداً فاغتبطت به غایة الاغتباط "۔(۴)

جس وقت یہ کتاب مولانا نے اپنے پیرومرشد حکیم الامت کی خدمت میں پیش فرمائی تو مولانا تھانوی نے اس پر جس قدر مسرت کا اظہار فرمایا اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے: "لو لم یکن بالخانقاه الامدادیة (تهانه بهون) الا

---

(۱) انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن/ظفر احمد عثمانی (مع تعلیقات تقی عثمانی) مطبوعہ دار العلوم، کراچی/ص:۱۔

(۲) الاستدراک الحسن (مقدمہ اعلاء السنن) /ظفر احمد عثمانی/مطبوعہ تھانہ بھون ۱۳۴۴ھ/ص:۸۶۔

(۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: "قواعد فی علوم الحدیث" /عبدالفتاح ابوغدہ/مطبوعہ: حلب، شام ۱۳۹۱ھ-۱۹۷۱ء۔

(۴) مقالات الکوثری/الشیخ محمد زاہد الکوثری؛ مرتبہ: محمد الخیری/مطبعۃ الانوار، القاہرہ ۱۳۷۳ھ/ص:۷۵-۷۶۔

تالیف اعلاء السنن لکفی به کرامة و فضلا فانه عدیم النظیر فی بابه''۔ (۱)

حکیم الامت علیہ الرحمہ کی یہ خوشی اس وجہ سے بھی تھی کہ یہ کام ان کی خواہش کے عین مطابق کیا گیا تھا، اور اس وجہ سے بھی کہ ''احیاء السنن'' کا احیاء ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ۱۳۳۱ھ میں مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک شاگرد مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لئے مقرر کیا تھا، لیکن ان کے کام سے حکیم الامت کی تشفی نہیں ہوئی تھی اور اس پر ''استدراک'' لکھوانے کے لئے حکیم الامت نے اپنے مایہ ناز شاگرد مولانا ظفر احمد عثانی کا انتخاب کیا تھا، جنہوں نے بڑی عرق ریزی، وسعتِ نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اس کام کو انجام دینا شروع کیا اور سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر نظر ثانی کر کے اس کو ''الاستدراک الحسن'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر اعلاء السنن کے نام سے اس کام کو شروع کیا۔ (۲)

یہ کتاب فی الحقیقت مولانا ظفر احمد صاحب کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے۔ اس میں صرف حنفی دلائل سے متعلق متنِ کتاب میں وہ احادیث مذکور ہیں جن سے حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہے، حواشی میں بڑی تحقیق اور تفتیش سے جملہ احکام سے متعلقہ احادیث کے استیعاب کی کوشش کی گئی ہے۔ پھر غایت انصاف کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ اصول سے جملہ احادیث پر کلام کیا گیا ہے۔ (۳) اس طریقہ پر آپ نے حنفی مسلک کے پیروکاروں پر بعض مخالفین کے اس الزام کو علمی و عملی طور پر مسترد کر دیا کہ طبقۂ احناف حدیثِ نبوی کو نہیں مانتا، اور یہ محض ایک قیاس ہے۔ (۴) اس علمی کاوش سے مؤلف کا مقصد دیگر ائمۂ مجتہدین کے موقف کو معاذ اللہ غلط اور باطل قرار دینا نہیں تھا، بلکہ صرف یہ دکھانا تھا کہ ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی پیروی میں حنفی مسلک کا قدم کسی سے پیچھے نہیں، بلکہ بہتوں سے آگے ہے، اسے خلافِ سنت کہنا صحیح نہیں، بلکہ وہ سنت کے زیادہ موافق ہے۔ (۵) اس کتاب کی اشاعت پر تمام علمی دنیا نے مولانا کی خدمات کا جس طریقہ پر اعتراف کیا اس کے اظہار کیلئے طوالت درکار ہے۔ علامہ یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ ''اگر ان کی (مولانا ظفر صاحب کی) تصانیف میں اعلاء السنن کے علاوہ اور کوئی تصنیف نہیں ہوتی تو تنہا یہ کتاب ہی علمی کمالات، حدیث وفقہ، رجال کی قابلیت و مہارت اور بحث و

---

(۱) علمائے مظاہر ..... /ص:۱۶۷۔

(۲) حکیم الامت کے آثار علمیہ/سید سلیمان ندویؒ/معارف اعظم گڑھ: ۵۳/۲؛ فروری ۴۴ء؛ ص:۱۰۲۔

(۳) معارف، اعظم گڑھ: ۵۳/۲؛ ص:۴۱۴۔

(۴) ماہنامہ بنیات، کراچی؛ رجب ۱۳۸۸ھ؛ ص:۶۱۔

(۵) بینات، کراچی؛ رجب ۱۳۸۸ھ؛ ص:۶۳۔

تحقیق کے ذوق محنت وعرق ریزی کے سلیقہ کے لئے برہانِ قاطع ہے''۔ (۱)

مولانا نے اپنی اس تالیف میں احناف کی تائید کے ساتھ ساتھ اعتدال کا دامن نہیں چھوڑا۔ جس مسئلہ پر دوسرے مذاہب کے دلائل قوی ہوئے اس کا برملا اظہار کر دیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ امام ابو یوسف وامام محمد رحمہم اللہ میں سے جس کا قول حدیث کے زیادہ موافق پایا، اسے اختیار کیا، بلکہ بعض مسائل میں امام شافعی کے قول کو حنفیہ کے قول پر ترجیح دی اور لکھ دیا کہ ''کتبِ احادیث موجودہ میں حنفیہ کی تائید میں کوئی حدیث نہیں ملی، ممکن ہے ہمارے ائمہ کے پاس کوئی حدیث ہو جو کتابوں میں ہم کو نہیں ملی، اس لئے بحالت موجودہ قول امام شافعی قوی ہے اور ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے''۔ (۲)

اس طرح مولانا کی کوشش یہ رہی کہ اختلافی مسائل میں امام ابوحنیفہ کے تمام اقوال کو تلاش کیا جائے، پھر جو قول حدیث کے موافق ہو اسی کو مذہبِ حنفی قرار دے دیا جائے۔ مولاناؒ نے تحقیق کامل کے بعد پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ ''اعلاء السنن'' میں تقلید جامد سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے، جس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل کمزور تھی وہاں صاف صاف ضعفِ دلیل کا اعتراف کیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کر لیا گیا ہے''۔ (۳)

اعلاء السنن کی تالیف میں مولانا ظفر احمد صاحب تقریباً بیس سال مشغول رہے۔ (۴) اٹھارہ جلدوں میں کتاب اور دو جلدوں میں مقدمہ (انہاء السکن اور انجاء الوطن) الگ سے شائع ہوئے۔ اس طرح اگر مقدمہ کو کتاب کا حصہ مانا جائے تو یہ بیس جلدوں میں مکمل ہوئی، جس کی گیارہ جلدیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زندگی میں طبع ہوگئی تھیں۔

مقدمہ اعلاء السنن (قواعد فی علوم الحدیث) کو مولانا محمد تقی عثمانی نے تین جلدوں میں بہت ہی مرتب انداز میں پیش کیا۔ مولانا تقی صاحب نے مقدمہ اعلاء السنن میں اپنی تحقیق زیادہ تر شیخ ابوغدۃ کی تحقیق پر مرکوز رکھی۔ مکمل اعلاء السنن کا خلاصہ اگر ہم چند الفاظ میں کرنا چاہیں تو اس طرح کر سکتے ہیں:

انہاء السکن الی من یطالع اعلاء السنن) یعنی مقدمہ اعلاء السنن میں اصولِ حدیث پر سیر حاصل اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اس کا ایک مقدمہ اور دس فصلیں ہیں۔ مقدمہ میں اصولِ حدیث کی تمام اصطلاحات خالص علمی وتحقیقی بنیادوں پر جمع کی گئی ہیں اور فصلوں میں اصولی احکام ومسائل ہیں۔ ہر مسئلہ میں محدثین کرام اور فقہاء کے ساتھ ساتھ احناف کا نقطۂ نظر بھی

---

(۱) بینات/ ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ - جنوری ۱۹۷۵ء؛ ص: ۳۳۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ ص: ۱۷۲۔

(۳) معارف، اعظم گڑھ: ۶/۵۳؛ ص: ۴۱۴۔

(۴) مقالات الکوثری/ ص: ۷۵۔

پیش کیا گیا ہے۔ اس میں حدیث، اصولِ حدیث، اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کی ضخیم کتابوں سے اہم اقتباسات اور ان سے اخذ کردہ مفید نتائج جمع کر دیے گئے ہیں۔ بعد میں یہی مقدمہ شیخ عبد الفتاح ابو غدۃ کی توجہ کا مرکز بنا اور ''قواعد فی علوم الحدیث'' کے نام سے جانا گیا، اس کے بعد مولانا تقی عثمانی صاحب ادھر متوجہ ہوئے۔ (۱) مولانا محمد تقی عثمانی نے نہ صرف یہ کہ مقدمہ تک ہی اپنے کو محدود رکھا، بلکہ مکمل اعلاء السنن پر تحقیق وتعلیق سے مولانا ظفر احمد عثمانی کی اس تالیف کو زندہ وجاوید بنادیا۔ اس کی تمام جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور تا ہنوز مقبول ہیں۔ اس کی پہلی جلد کتاب الطہارۃ پر مشتمل ہے، جس میں وضو کی صفت و فضیلت سے لے کر آداب الاستنجاء تک کے تمام مباحث پر فقہ حنفی کے دلائل کو احادیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم، سے مدلل کیا گیا ہے۔

چوں کہ نماز کے فروعی مسائل میں احناف اور دیگر مسالک کے متبعین کے یہاں کافی اختلاف واقع ہوئے ہیں، اس لئے ان مسائل کو مولانا نے تمام جزئیات کے ساتھ شرحِ صدر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جلد نمبر '۲' میں اوقاتِ صلوٰۃ، آمین بالجہر وبالسر کی بحثیں، تیسری جلد میں رسول اللہ ﷺ کے رکوع میں جانے سے لے کر آدابِ دعاء تک کے معمولات، چوتھی جلد میں قرأت بالجہر اور قرأت بالسر سے ابواب الامامت تک کے مباحث، جلد نمبر ۵ میں حدث فی الصلوٰۃ، آدابِ دخولِ مسجد، چھٹی جلد میں وجوبِ وتر اور اس کے اوقات، نیز رکعتین بعد الوتر کی بحث، ساتویں جلد میں نوافل وسنن کے تعلق سے احادیث مبارکہ اور ان کے مطابق فقہِ حنفی کی تطبیق، نیز قصر فی الصلوٰۃ اور ابواب السفر اور جلد نمبر ۸ میں ابواب الجمعۃ سے لے کر ابواب الجنائز تک کے تمام مباحث کو شامل کیا گیا ہے۔ اسطرح مجموعی طور پر اعلاء السنن کی جلد ۲ تا ۸ یعنی کل سات جلدیں نماز اور متعلقاتِ نماز کے مباحث سے تعلق رکھتی ہیں۔ زکوٰۃ اور روزہ سے متعلق مولانا نے تمام مسائل کا احاطہ صرف ایک جلد (جلد نمبر ۹) میں کر دیا ہے۔

دسویں جلد میں کتاب الحج اور اس کے متعلقات سے بحث کی گئی ہے، جس میں زیارۃ قبر النبی ﷺ کا باب بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طریقہ پر عبادات دس جلدوں میں مکمل ہو جاتی ہیں۔

معاملات کی ابتداء گیارہویں جلد سے ہوتی ہے۔ ترتیب کے مطابق عائلی زندگی کے اہم ترین شعبہ ''نکاح'' سے اس کا آغاز کیا گیا ہے۔ طلاق، ظہار، لعان کے بعد حدود وسرقہ کے ابواب بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ اخیر میں تتمہ کی شکل میں کتاب الطلاق پر سیر حاصل تفصیلی بحث کی گئی ہے جس میں حنفی دلائل کو صحیح احادیث سے مدلل کیا گیا ہے۔

بارہویں جلد کتاب السیر پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز جہاد کے ابواب سے ہوتا ہے اور اختتام اس وقت کی مشہور و معروف بحث ''متحدہ قومیت'' پر ہوتا ہے۔ مولانا نے اس موضوع پر نہایت علمی وتحقیقی بحث کر کے کانگریس کے متحدہ قومیت

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے: ''قواعد فی علوم الحدیث'' (مع تعلیقات مولانا محمد تقی عثمانی) مطبوعہ: دار العلوم، کراچی، پاکستان ۱۳۹۶ھ-۱۹۷۶ء۔

کے نعرہ کو دلائل کیساتھ شریعتِ اسلامیہ سے متصادم قرار دیا ہے، اوران علماء پر سخت تنقید کی ہے جو اس موضوع پر کانگریس کی ہم نوائی کرر ہے تھے۔

جلد ۱۳ میں لقیط[1]، لقطہ، مفقود، شرکت اور وقف وغیرہ کے احکام سے متعلق حنفی دلائل کو احادیث کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

چودہویں جلد میں کتاب البیوع سے کتاب الربوا تک کی احادیث کا احاطہ ہے۔ ربوا کے تعلق سے مولانا ظفر احمد صاحب کا مشہور عربی رسالہ ''کشف الدجی عن وجہ الربوا'' بھی اس جلد میں شامل ہے، جس پر مشہور ادیب و مؤرخ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تقریظ بھی شامل ہے۔ یہ رسالہ کتابی صورت میں بھی شائع شدہ ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو اس کے ضمن میں کی جائے گی۔

کتاب القضاء، کتاب الشہادات، کتاب الوکالۃ، کتاب الدعوی، اور کتاب الاقرار جیسے اہم موضوعات پر پندرہویں جلد میں تفصیلی مباحث شامل ہیں۔

سولہویں جلد میں کتاب الصلح سے کتاب الغصب تک کی ان تمام احادیث مبارکہ کو شامل کیا گیا ہے، جو ان فقہی مسائل میں احناف کے دلائل ہیں۔

سترہویں جلد میں کتاب الشفعۃ، مزارعت، ذبائح، اضاحی، اور اباحت کے مسائل ہیں نیز آخری جلد (۱۸) میں احیاء الموتی، کتاب الاشربۃ، کتاب الصید، کتاب الجنایات، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض اور کتاب الادب والتصوف تک کے فقہی مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے، اور حنفی مسلک کے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

اس طریقہ پر مقدمہ کی دو جلدیں اور کتاب کی اٹھارہ جلدوں کے ساتھ یہ کتاب تکمیل کو پہونچتی ہے۔ فی الحقیقت یہ ان کی اہم علمی تصنیف ہے، جس کے لئے علمائے احناف قیامت تک ان کے مرہونِ منت رہیں گے۔[2] مولانا کی یہ عظیم تالیف جہاں ایک طرف حدیث وفقہ اور حنفی مسلک کا علمی ذخیرہ ہے، وہیں اپنے اسلوبِ بیان کے اعتبار سے عربی زبان و ادب کا بھی عظیم شاہ کار ہے۔

انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن:-

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل یہ رسالہ اگرچہ مقدمہ اعلاء السنن میں شامل ہو چکا تھا

---

(۱) لقیط بمعنی اٹھایا ہوا، نومولود بچہ جو پھینک دیا جائے۔ ملاحظہ کیجئے: مصباح اللغات، عربی، اردو؛ مرتبہ: عبدالحفیظ بلیاوی/ مکتبہ برہان، دہلی؛ طبع نہم ۱۹۹۲ء/ ص: ۷۷۵۔

(۲) تبصرہ ماہنامہ بینات، کراچی؛ ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ؛ ص: ۴۔

،لیکن اس کی علمی وادبی اہمیت کے پیش نظر بعد میں اسے باقاعدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔اس میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کی محدثانہ شخصیت کواجاگر کر کے ان کی فقیہانہ جلالتِ شان کو بیان کیا گیا ہے۔[1] (اس کا تذکرہ اعلاء السنن کے ضمن میں بھی آ چکا ہے)۔

کشف الدجی عن وجہ الربوا :۔

ربوا (سود) اسلام میں نصِ صریح کے ذریعہ قطعاً حرام ہے۔قرآن مجید میں صاف الفاظ میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿و احل اللـه البيع و حرم الربوا﴾ [2] شریعتِ اسلامیہ میں ابتداء سے آج تک جب بھی اس سلسلے میں تاویلات کی راہیں نکالنے کی کوشش کی تبھی علماء کی ایک جماعت اس کے رد کے لئے بھرپور انداز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مفتی عبداللطیف صاحب، مفتی ریاست حیدرآباد دکن نے ایک رسالہ صدارتِ عالیہ اور محکمۂ شرعیہ، دولتِ آصفیہ سے الاستفتاء کے نام سے شائع فرمایا۔اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ربوا (سود) صرف بیع وشراء میں ہی ہوتا ہے، قرض کی صورت میں اس کا تحقق نہیں ہوتا۔لہٰذا قرض میں نفع لینا جائز ہے، اور وہ ربوا نہیں۔یہ رسالہ اصلاً عربی میں تھا، لیکن چوں کہ اس رسالہ سے عوام ہی نہیں، بلکہ بعض خواص اہلِ علم کی بھی گمراہی کا اندیشہ تھا، اس لئے مولانا اشرف علی تھانوی کے حکم کے بموجب مولانا ظفر احمد صاحب نے اس کا جواب عربی زبان میں ''کشف الدجی عن وجہ الربوا'' کے نام سے لکھا۔[3]

بعد میں حضرت تھانوی کی خواہش ہوئی کہ اسے کتابی شکل میں شائع کرنے سے پہلے علمائے کرام کو دکھا کر ان کی آراء بھی شاملِ اشاعت کردی جائیں۔چنانچہ یہ مضمون مختلف علمائے کرام کو اس غرض سے بھیجا گیا۔جن میں ایک نام مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بھی تھا۔

(یہ اتفاق کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حلقۂ تھانویؒ میں داخل ہونے کا سبب یہی مضمون بنا اور یہ بھی اتفاقات میں سے ہی ہے کہ مولانا عبداللطیف صاحب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے استاد تھے، اور انہوں نے اپنا متنازعہ مضمون مولانا سید سلیمان صاحب کو بھی دکھایا تھا، جس پر مولانا ندویؒ نے یہ کہہ کر واپس کردیا تھا کہ ''آپ جس کو مکروہ سمجھتے ہیں میں اس کو عینِ ربوا کہتا ہوں''۔[4]

---

(۱) انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن/ مولانا ظفر احمد عثمانی/ اشرف المطابع تھانہ بھون، ۱۳۴۱ھ۔

(۲) القرآن الکریم؛ سورہ:۲، الآیۃ: ۲۷۵۔

(۳) تذکرۂ سلیمان/ غلام محمد بی، اے/ مجلس علمی، کراچی ۱۹۶۰ء/ ص: ۸۴۔

(۴) ایضاً/ ص: ۸۵۔

مولانا ظفر احمد صاحب کے جوابی مضمون (کشف الدجی عن وجہ الربوا) کو مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے جہاں مذکورہ بالا حقیقت کا اظہار کیا وہیں اس کی عربیت اور سلاست سے متاثر ہونے کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''رسالہ کشف الدجیٰ'' کے مطالعہ سے بہرہ مند ہوا، طرزِ عبارت اور انشاء کی سلاست اور جاذبیت نورٌ علیٰ نور ہے''۔ (۱)

پھر آپ نے اس پر عربی زبان میں بڑی عمدہ تقریظ بھی تحریر فرمائی، جو کتاب کا جزو بنی۔ اصل کتاب اگر چہ اس وقت نایاب ہے، تاہم اعلاء السنن کی جلد نمبر ۱۴ میں مولانا نے اسے ضمنی ابحاث میں شامل کر کے ان تمام تقاریظ اور اصل کتاب کو محفوظ کر دیا ہے۔ بعد میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔ (۲) یہ ترجمہ علیٰحدہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوا، لیکن اب یہ بھی نایاب ہو چکا ہے، البتہ مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے امداد الفتاویٰ مرتب کرتے وقت اس کی تیسری جلد میں اس اردو ترجمہ کو شائع کر کے اسے محفوظ کر دیا ہے، جس سے اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کتاب پر جن دوسرے مستند علمائے کرام کی تقاریظ شامل ہیں ان میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علاوہ مفتی محمد شفیع عثمانی، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا سید شاہ محمد قادریؒ، مولانا سید مختار اللہ صاحبؒ، مولانا سید عبداللطیف سہارنپوریؒ، مولانا عبدالحیؒ سہارنپوریؒ موالا نا محمد یعقوبؒ مدرسہ نظامیہ، حیدرآباد اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ علیہم الرحمہ کی تقاریظ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں علماءِ جالندھر، علمائے کانپور و علمائے لاہور کی بھی اس مسئلہ پر تقاریظ شامل کر کے مسئلہ ربوا کی حرمت پر امت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے حیدرآباد کے مفتی عبداللطیف صاحب کے اس فتوے کو باطل قرار دیدیا کہ ''ربوا (سود) صرف بیع وشرا میں ہی ہوتا ہے، قرض میں اس کا تحقق نہیں ہوتا''۔

مولانا نے اس رسالہ کے اخیر میں ان علمائے کرام کی تقاریظ کا سہارا لے کر اس کی ادبی حیثیت بھی بنا دی ہے۔ ان تقاریظ کے تعارف کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس لئے ان سے احتراز کرتے ہوئے مولانا کی دیگر تصانیف کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

احکام القرآن الملقب بدلائل القرآن علی مسائل النعمان :-

فقہ اسلامی حنفی قرآن کریم کی کن کن آیات سے ماخوذ ہے حنفی علماء نے کون کون سی آیات سے کن کن مسائل فقہیہ کا استنباط کیا ہے؟ ان کو اس کتاب جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ علم تفسیر میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ قرآن کریم سے فقہِ حنفی کے دلائل کا ایک بہت عمدہ اور مستند مجموعہ عربی زبان میں یکجا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ کام تنہا مولانا عثمانی صاحبؒ نے نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ ان کے تذکروں میں اس کی صرف دو جلدوں کی تفصیل ملتی ہے جو سورۂ

---

(۱) تذکرۂ سلیمان / ص: ۸۵۔

(۲) ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون: ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ/ستمبر ۱۹۳۹ء۔

فاتحہ سے سورۂ نساء تک شامل ہے۔[۱]

غالبًا اس عظیم کام میں ان کے ساتھ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ (متوفی: ۱۹۷۴ء) بھی شامل تھے۔ ان دونوں حضرات نے مولانا اشرف علی تھانوی کے حکم سے اس کام کو کیا کیوں کہ مولانا شاہد صاحب سہارنپوری نے مولانا ظفر احمد صاحب کی تصنیفات کے تذکرے میں ''احکام القرآن'' کے ذیل میں مولانا ادریس کاندھلوی کا تذکرہ کیا ہے۔[۲] لیکن صاحب تذکرۃ الظفر کا یہ کہنا کہ ''اس پیرانہ سالی اور ضعفِ عمر کے زمانہ میں بھی مولانا نے سورۃ المائدہ سے آگے لکھنا شروع فرمادیا تھا مگر تکمیل نہیں ہوسکی''۔[۳] اس کا اشارہ کرتا ہے کہ یہ کتاب مکمل نہیں ہوسکی۔

''علمائے مظاہر کی تصنیفی خدمات'' میں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے تذکرے کے ضمن میں مولانا شاہد صاحبؒ نے تحریر کیا ہے کہ ''یہ کام چونکہ طویل تھا اور بڑی محنت وعرق ریزی کا طالب تھا اس لئے حضرت تھانویؒ نے یہ کام چار افراد کے سپرد فرمایا پہلی دو منزلیں (اختتامِ سورۂ توبہ تک) مولانا ظفر صاحب کے سپرد ہوئیں اس کے بعد دو منزلیں (تا اختتام سورۃ الفرقان) مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ اور دوسرا حصہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ (متوفی: ۱۹۷۶ء) اور آخری حصہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے سپرد فرمائیں''۔[۴]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس خدمت میں سب سے بڑا حصہ مولانا ظفر صاحبؒ کے ہی حصہ میں آیا۔

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا عربی زبان کے بلند پایہ نثر نگار تھے، جنہیں اظہارِ خیال پر پوری قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس زبان کے ذریعہ فقہِ حنفی کی عظیم خدمت کی، بلکہ علم تفسیر وحدیث، اور عربی نثر انشاء پردازی میں بھی اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی آپ نے عربی شعر وادب میں بھی زندۂ جاوید قصائد ومراثی کے ذریعہ زبانِ نبویؐ کے تئیں اپنی سچی محبت اور تعلق کا ثبوت فراہم کیا۔

اسی لئے اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی عربی شاعری پر بھی ایک نظر ڈال کر اس پر گفتگو کرلی جائے۔

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۱۶۴۔

(۲) علمائے مظاہر ...../ص:۱۶۵۔

(۳) تذکرۃ الظفر/ص:۱۶۴۔

(۴) علمائے مظاہر ...../ج:۱/ص:۴۲۳۔

پانچواں باب

مولانا ظفر احمد عثمانی کی عربی شاعری

شعروادب انسان کا وہ سرمایہ ہے جس کے ذریعہ وہ خود تو ذہنی تسکین حاصل کرتا ہی ہے، دوسروں کو بھی سکون فراہم کرتا ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں بڑے بڑے واقعات کو سمو دینا شاعر کا ہی کام ہے۔ دنیا کی ہر زبان اس سرمایہ سے اپنا دامن بھرے ہوئے ہے، لیکن عربی زبان وادب میں اس کو ابتداء سے ہی قدر و قیمت کی نظروں سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاہلی دور کی شاعری آج تک زندۂ و جاوید ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد عربی شاعری کو ایک نئی جہت ملی۔ اور اس میں تفاخر وتکبر کا وہ جاہلی انداز نہ رہا جو عربوں کا شعار سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اس میں شائستگی وشیفتگی آ ئی۔

عربی زبان سے چونکہ مسلمانوں کا مذہبی رشتہ ہے جس کی وجہ سے وہ جس ملک میں بھی گئی اس ملک کے باشندوں نے اسے عقیدت واحترام کے ساتھ لیا۔ اسلامی علوم وفنون کا ماخذ عربی زبان ہی ہے اس وجہ سے بھی مسلمانوں کا علمی تعلق اس زبان سے قائم رہا، اور آج تک ہے اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ عربی زبان ہندوستان میں داخل ہوئی تو یہاں کے باشندوں نے نہ صرف یہ کہ اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا، بلکہ علوم وفنون اور شعروادب میں اپنی خداداد صلاحیتوں و شبانہ روز محنتوں سے نت نئے اضافے کئے اور اس طریقے پر پہلی صدی ہجری سے ہی عربی شعروادب کے میدان میں مسلمانانِ برِصغیر (ہندو پاک و بنگلہ دیش) مسلسل نظر آتے ہیں۔ جن کا تذکرہ ہم نے گذشتہ صفحات میں تفصیل سے کر دیا ہے۔ اس وقت ان تفصیلات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہمیں مولانا کی عربی شعروادب کی خدمات کا جائزہ لینا ہے۔

مولانا عربی شعروادب سے فطری تعلق رکھتے تھے۔ بچپن سے ہی ان کا رجحان عربی شعروشاعری کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب آپ عربی کی ابتدائی کتابیں نحومیر وغیرہ پڑھ رہے تھے (جس وقت آپ کی عمر بھی بارہ تیرہ سال سے زائد نہ ہوگی) تو آپ نے اپنے کسی متعلق کو خط لکھتے ہوئے اپنی عدمِ ملاقات کا شکوہ شعری زبان میں اس طرح پیش کیا تھا:

انا ما رأيتك من زمن فازدادني قلبي الشجن [1]

اس شعر کو اگر ہم مولانا کا پہلا شعر مان لیں تو اس کم عمری اور بالکل ابتدائی کتب کے طالب علم کا یہ شعر مستقبل کے اچھے شاعر کی نشان دہی کرتا ہے۔ چنانچہ ان میں یہ شعری جذبات پروان چڑھنے لگے اور انہوں نے عمر کے سولہویں سال

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۶۱۔

(۱۳۲۶ھ) میں قدم رکھا، جب کہ وہ جلالین، مشکوۃ وغیرہ کے طالب علم تھے اوران کے والد کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو ایسے غمگین ماحول میں بھی شاعری سے آپ کا تعلق قائم رہا اور آپ نے منظوم طریقہ پر استاد سے رخصت چاہی۔ درخواست رخصت میں آپ نے مندرجہ ذیل اشعار فی البدیہہ نظم فرمائے:

الی این ابکی و احدا بعد واحد	فلیس امرؤ منا هناك بخالد
و اول من قد ذاب قلبی لفقده	و طار یلی موته موت والدی [۱]

ان اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے والد کے انتقال سے پہلے کسی ایک اور صدمہ سے بھی دو چار ہو چکے تھے ''واحدا بعد واحد'' اور دوسرے شعر کی ضمائر اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں)۔ لیکن یہ **کس** صدمہ کی طرف اشارہ ہے اس کا پتہ تحقیق بسیار کے بعد بھی نہیں چلا۔ ان تحقیقات سے اجتناب کرتے ہوئے اسی غرض پر اکتفاء کریں گے کہ اس سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ مولانا مرحوم میں عربی اشعار نظم کرنے کی صلاحیت ابتدائے عمر سے ہی تھی، اور اگر اس صلاحیت کو فطری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، جب بھی انہیں وقت ملتا یا کوئی موقع ہوتا تو وہ اس صلاحیت کا مظاہرہ کرتے۔ مولانا مرحوم کا عربی زبان کا شعری سرمایہ کسی منظم دیوان کی شکل میں نہ ہونے کے باعث عوام وخواص کی نظروں میں وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن ان کے جو قصائد یا مراثی طبع ہوئے انہوں نے علمی حلقوں میں دادِ تحسین وصول کی۔ اس سے یہ انداز ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کا اصل شعری سرمایہ بڑی وافر مقدار میں ہوگا، لیکن مولانا مرحوم تعریف وتوصیف سے بے نیاز طبیعت اور منکسر المزاجی کے باعث اپنے کو اس میدان میں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے، لیکن جب جب پیمانہ لبریز ہوا تو اس کلام کو عوام تک پہونچانے کی خاطر انہوں نے بغرضِ اشاعت مختلف رسائل وجرائد کو ارسال کیا جو سنجیدہ حلقوں میں قدر ومنزلت کی نظروں سے دیکھا گیا۔

ان کے نعتیہ قصائد ''نور علی نور'' و ''وسیلۃ الظفر'' مختصر کتابچے کی شکل میں طبع ہو کر مقبول خواص عوام ہو چکے، ثانی الذکر کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ اس وقت کے انتہائی سنجیدہ علمی ادارے سے اس کی اشاعت ہی اس کے علمی وادبی ہونے کی دلیل ہے۔ [۲] اس طریقہ پر مولانا کے مختلف مراثی وقصائد متعدد علمی مجلات میں شائع ہوئے جو وقت کی نذر ہو کر اس وقت کا غذوں کی تہوں میں ''متاعِ گم شدہ'' کی مانند ہو گئے۔ تاہم کچھ چیزیں تلاشِ بسیار کے بعد دستیاب ہو سکی ہیں، جنہیں پیمانہ مانتے ہوئے مولانا مرحوم کی شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس حقیقت کے اظہار کے ساتھ کہ یہ کوئی علمی کاوش نہیں بلکہ

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص:۲۰۹۔

(۲) وسیلۃ الظفر/مولانا ظفر احمد عثمانی/مطبع معارف، اعظم گڑھ ۱۳۶۳ھ۔

تحقیق کی طالب علمانہ کوشش ہے۔

مولانا کا جو شعری سرمایہ ہم کو دستیاب ہوا ہے، ان میں کچھ نعتیہ قصائد کچھ عمومی قصائد، کچھ کتابوں کی منظوم تقاریظ اور کچھ معاصر علماء سے متعلق مراثی ہیں۔ اس سلسلہ میں جو ترتیب ہم نے اختیار کی ہے اس کے مطابق سب سے پہلے مولانا مرحوم کے نعتیہ قصائد کا ناقدانہ مطالعہ ہمارے پیشِ نظر ہے۔

مولانا کی شاعری کا عمومی جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس صنف کے تعلق سے ہندوستانی شعراء کے سرسری تذکرہ کے ساتھ مختصر تمہیدی گفتگو کی جائے اور پھر اس کے ضمن میں مولانا مرحوم کی شاعری کو دیکھا جائے تاکہ مولانا کی شاعری کے ان مضامین کا (جو انہوں نے قلم بند کئے ہیں) فنی جائزہ لینے میں بھی آسانی ہو۔

نعت گوئی کا سلسلہ حضورِ اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی شروع ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے نعتیہ کلام کہنے کا سہرا حضورِ اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب کے سر بندھتا ہے۔ تحقیق کے مطابق ابو طالب کے قصیدے سے پہلے کوئی ایسا کلام نہیں ملتا جس میں نبی اکرم ﷺ کی مدح ہو۔[1] حضرت حسانؓ بن ثابت نے حضورِ اکرم ﷺ کے دفاع میں مدحیہ شاعری کا سرمایہ جمع کیا، جس کی وجہ سے انہیں شاعرِ رسالت مآب ﷺ کا قابلِ فخر خطاب زمانہ نے دیا۔[2] اس طریقہ پر نعت گوئی کا سلسلہ چودہ سو سال سے زیادہ ہوتا ہے۔

عربوں کی ہندوستان آمد اور باشندگانِ ہند کے اسلام سے متعارف ہونے اور اسے قبول کرنے کے بعد عربی سے دینی تعلق قائم ہونے کے باعث عربی زبان و ادب کی دیگر اصنافِ سخن کی طرح اس صنف میں بھی باشندگانِ ہند نے دادِ تحسین وصول کی۔

برِ عظیم ہند و پاک و بنگلہ دیش میں شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے فضلاء بارگاہِ نبوت میں گلہائے عقیدت پیش کرنے میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہے۔ شروع ہی سے ہندوستانی شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی کو سعادت دارین تصور کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کو قابلِ فخر مانا ہے۔ چنانچہ ابتدائی عہد کے ہندوستانی شعراء ہارون بن موسیٰ ملتانی (متوفی: ۱۴۰ھ) افلح بن یسار المعروف بہ حسین مرزوق بن یسار المتخلص بہ ابو عطاء السندی (متوفی: ۱۸۰ھ) ابو الضلع سندی (متوفی: ۲۴۰ھ) ابو الفتح محمود بن حسین المعروف بہ کشاجم السندی (متوفی: ۳۳۰ھ) ابو محمد الحسن بن حامد الأدیب الدیبلی البغدادی (المتوفی: ۴۰۷ھ)، عطاء بن یعقوب بن ناکل الغزنوی (متوفی: ۴۹۱ھ) سعد بن سعد بن سلمان لاہوری (متوفی: ۵۱۵ھ) رضی الدین صاغانی (متوفی: ۶۵۰ھ) وغیرہم جیسے قدیم ہندوستانی عربی شعراء کے کلام کو

---

(۱) عربی میں نعتیہ کلام/عبداللہ عباس ندوی/مکتبہ اسلام، لکھنؤ ۱۳۹۵ھ-۱۹۷۵ء/ص: ۳۳۔

(۲) نقوش (رسول نمبر)؛ جنوری ۸۴ء؛ ۱۰/۱۲۴۔

دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں نعت کا رنگ کا خاصی مقدار میں پایا جاتا ہے۔[1] عہد تیموری میں اس وقت کے بلند پایہ ہندوستانی ادیب احمد التھانیسری (متوفی: ۸۲۰ھ) کے بھی بہت سے قصائد ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی: ۱۱۷۶ھ) کی نعت ''اطیب النغم'' جس کا مطلع:

''کأن نجوما او مضت فی الغیاھب عیون الافاعی اور رؤس العقارب''

ہے نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ آج تک زندۂ وجاوید ادبی شاہ کار ہے۔ اسی طریقہ پر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی: ۱۲۰۰ھ) نے اس صنف میں بہت شہرت حاصل کی۔ مشہور عارف عبد النبی شامی کا ایک قصیدہ آں حضور ﷺ سے ان کی گہری محبت وعقیدت کا آئینہ دار ہے۔[2]

ماضی قریب میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا حبیب الرحمان عثمانی رحمہم اللہ کے نعتیہ قصائد نے کافی شہرت حاصل کی۔ خصوصاً مؤخر الذکر کا قصیدہ ''لامیۃ المعجزات'' سلاستِ زبان اور وضاحتِ بیان کا بہترین نمونہ ہے۔[3]

اسی سلسلہ کی کڑی مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنہوں نے جذبۂ حب رسول ﷺ سے سرشار ہو کر خلوص وعقیدت کے ساتھ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں نعتیہ شاعری کے گلدستہ پیش کئے۔ انشاء اللہ العزیز یہ نعتیں عند اللہ وعند الرسول تو مقبول ہوئیں ہوں گی ہی عوام الناس میں بھی اپنی نادر تشبیہات واستعارات اور متنوع مضامین کے سبب بہت مقبول ہوئیں۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: ''ہندوستان میں عربی شاعری'' میں درجِ بالا شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام۔

(۲) دائرۂ معارف اسلامیہ: ۴۰۰/۲۲۔

(۳) دائرۂ معارف اسلامیہ: ۴۰۰/۲۲۔

پہلی فصل

نعتیہ شاعری

آپ کی نعتیہ شاعری کا پہلا مجموعۂ قصائد ''نور علی نور'' ہے [۱]۔ اس کا دوسرا نام ''رطب العرب'' بھی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حجاز کے مقدس سفر کے دوران لکھے جانے کے باعث ''سفر نامۂ حجاز'' کا بھی جزو ہے۔ اس کا پہلا قصیدہ ''رائیہ'' اور دوسرا قصیدہ ''قافیہ'' ہے۔ [۲]

پہلا قصیدہ رائیہ: یہ قصیدہ اٹھاسی اشعار پر مشتمل ہے ان میں جن مضامین کو ذکر کیا گیا ہے، ان میں آپ ﷺ کی رسالت، دنیا و آخرت کے لئے آپ ﷺ کی ذات بابرکات کی رحمتیں، نورِ محمدی، آپؐ کی محبوبیت بنی نوع انسان سے آپ کی رافت و محبت، آپ پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعامات، آپ کی فضیلت، معجزات نیز آپ کے جاں نثار ساتھیوں کا آپ کے ساتھ جاں نثارانہ تعلق کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ اور ان تمام مضامین کا مرکزی موضوع آپ کی ذات مبارکہ کا صدق و صفا سے معمور ہونا ہے۔ [۳]

اهذی سلیمی فی جمال منور	تلوح علی بعد کبدر مدور
ام النجم فی أفق من الشرق طالع	ام الزهراء لاحت بمشتری
ام البرق فی جنح من اللیل لامع	ینم علی غیث من الله منشر
ام الرأیة البیضاء فی ارض طیبة	قد اضطربت لیلا بجند مظفر

ان اشعار میں قصیدہ کی ہیئت ترکیبی کے مطابق رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے جمال اور خوبصورتی کی تعریف مختلف روشن مثالوں سے کی گئی ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کا نام وضاحت سے نہیں لیا گیا ہے تاہم تمام اشارات اتنے واضح ہیں کہ ان کی تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ شاعری کے قدیم قاعدوں کے مطابق 'سلیمی'' کے خیالی نام سے ابتداء کر کے مختلف مثالیں دے کر عمدہ تشبیہات مذکورہ بالا اشعار میں ملتی ہیں۔ اس کے بعد سات اشعار میں آپ کے اخلاق عالیہ اور بلند اوصاف کے باعث آپ کے ان جاں نثار ساتھیوں کا بڑے خوبصورت انداز سے ذکر کیا گیا ہے جو آپ کے اشارۂ چشم کے منتظر رہتے تھے۔ اور آپ کے ایک اشارے پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کو

---

(۱)
(۲) ملاحظہ کیجئے: ''نور علی نور'' / مولانا ظفر احمد عثمانی / مکتبہ امداد الغرباء، سہارنپور ۱۳۵۴ھ۔
(۳) یہ قصیدہ ماہنامہ ''الرشید''، لاہور کے نعت نمبر (۱۴۱۱ھ) میں بھی شائع ہوا ہے: ملاحظہ فرمائیں صفحہ: ۲۰۵ تا ۲۲۰۔

سعادت تصور کرتے تھے۔ملاحظہ فرمائیے یہ اشعار:

یلوذ بها الأقیال من آل هاشم	و من آل عدنان و من آل حمیر
ابو بکر ن الصدیق اول مؤمن	و خیر رفیق بالمغار المحجر
ابو حفص ن الفاروق خیر خلیفة	اعز به الاسلام فی کل محضر
و عثمان ذو النورین افضل صابر	علی المو ت ظلماً بالقضیب المشهر
علی فتی الفتیان بطل مجرب	و ما ابصرت عینا شجا ع کحیدر
و حمزة اسد الله اسد رسوله	کابن اخیه ذی الجناحین جعفر
وسعد بن وقاص وعمر و و عامر	و سیف الاله خالد کالغضنفر

مذکورہ بالا اشعار میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کی شخصیت کے عظیم الشان وصف اور آپ کی جاذبیت نیز آپ کے معزز ومکرم ہونے کو بڑے اچھے انداز میں نظم کیا ہے۔کیوں کہ آپ کے معزز ومکرم ہونے کے باعث نہ صرف یہ کہ آپ کی ذات ستودہ صفات بلکہ آپ کا قبیلہ، آپ کا خاندان اور آپ کے رفقاء بھی ان اوصاف میں آپ کو مقتدا و پیشوا ماننے کی وجہ سے اعزاز واکرام سے نوازے گئے۔

پھر یہ آپ کی ذات مبارکہ ہی تو تھی کہ عرب کے مشہور ومعروف دو متحارب قبیلے اوس وخزرج جو میدانِ جنگ میں لوہے کی زرہ پہن کر اور ہاتھوں میں یمنی تلوار لے کر بلا تکلف گھس جاتے تھے اور کشتوں کے پشتے لگا دیتے تھے وہ قبیلے بھی آپ کی صدائے حق پر حق کے حامی اور دینِ الٰہی کے مددگار ہو گئے۔

اسود الوغا ابطال اوس و خزرج	و لم یلعبوا الا بسیف و خنجر
مقادیم سباق الی کل غایة	بصبر و ایمان و رأی مدبر
بهالیل خواضون فی کل غمرة	بسیف یمان فی حدید مسمر
حماة لحق الله انصار دینه	و من ینصر الاسلام و الحق ینصر

اوس وخزرج کے تذکرے کے بعد شاعر پھر گریز سے کام لیتے ہوئے حضورِ اکرم ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں کی جاں نثاری کی زندۂ جاوید مثالوں کو غزوات بدر، اور حنین، خندق اور خیبر کو ذکر کرتا ہے، اور جس طریقہ پر آپ کے ساتھیوں نے ان غزوات میں اپنے آپ کو پیش کیا ان کا اشارۃً ذکر کیا گیا ہے۔فرماتے ہیں:

هم جبل الاسلام فی کل موطن	هم شهداء الله فی کل منحر

فسل عنهم بدراً حنينا و خندقا   و سل احداً عنهم و اطلال خيبر

و سل عنهم شاما و مصرا و فارسا   دمشقا و يرموكا ديار التنصر

قد اقتحموا الحوض المنايا بعزمة   تخر لها شم الجبال بمنخر

لقد جاهدوا فی الله حق جهاده   صلوا فی لهيب الحرب ذات التسعر

غداة مضوا مثل الليوث يقودهم   الی الموت حب الله من غير مضجر

فلما تلاقوا غادروا كل فاجر   عليه العوافی كالضواری بعثر

فلم تبق الا اثربة بعد عينها   و الاحديث مفتری عند مفتر

تزلزل اركان الضلال بعزمهم   و هدت جبال الكفر بالله اكبر

اولئك اقمار الهدی و نجومه   بهم يهتدی فی كل امر محير

ولن تبتغی الا لديهم هداية   و ما حاد عنهم غير غمر مزور

و من يبتغی المعروف من غير اهله   يجازی جزاء النادم المتحسر

اولئك خير الناس بعد نبيهم   و من يعتصم بالله يسعد و يظفر

اولئك اصحاب النبی و حزبه   كفاهم به فخرا علی كل مفخر

اس کے بعد کے اشعار میں مولانا نے بہت ہی برجستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تاریخی طور پر ان تاریک حالات کا مجملاً ذکر کیا ہے۔ جن میں عرب آپ کی آمد سے پہلے پھنسے ہوئے تھے۔ پھر آپ کی آمد سے حق اور ہدایت کا جو نور پھیلا، اس نے نہ صرف یہ کہ آپ کی ذاتِ پر انوار کو منور کیا بلکہ آپ کے متبعین کو بھی منور بنا دیا۔ اور یہ کام صرف صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کے دور تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ اس پیغام حق و صداقت کو نسل در نسل منتقل کرنے کے لئے ہمیشہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی رہی ہے، جو اللہ کے بندوں تک اس پیغام کو پہونچاتی رہی۔

و يتلو هم من كل بطن عصابة   علی نصرة الداعی النبی المطهر

نبی اتی و الناس فی فحمة الدجی   من الظلم فی شر من الجهل منكر

فلألأ نور الحق و الرشد ساطعا   بطلعة ميمون النقيبة ازهر

محمد المبعوث للناس رحمة   بوجه منير مستنير منور

یہاں تک پہونچنے کے بعد آپ کا ذہن پھر آنحضرت ﷺ کی ذات مبارکہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر وہ ان اشعار کو قلم بند کرتے ہیں جن میں آپ کے خاندانی طور پر معزز و مکرم ہونے کے تذکرے کے ساتھ ساتھ آپ کے سراپا نور

ہونے، آپ کے ذریعہ ایسی روشن آیات (قرآن) کے آنے کو علم وہدایت کی مستحکم دلیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان اشعار میں آپ کی سخاوت، پریشان وغمزدہ لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے، ذلیل وخوار کو عزت بخشنے، گمراہوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بننے، غریبوں پر رحم کرنے دشمنوں کو معاف کرنے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے جیسے اوصاف کا تذکرہ بھی ہے، اور مخاطب سے آپ ﷺ کے حسن وملاحت کی تعریف وتوصیف نادر تشبیہات کے ذریعہ کرتے ہوئے معجزۂ شق القمر کو بھی بڑے ہی خوبصورت اور بلیغ انداز میں نظم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بافضل بيت كان من آل هاشم	و اكرم قوم كان في خير معشر
سلالة امجاد كرام ذوى العلى	ذوى نسب من خندف مثل نير
اتانا بنور لن ترى العين مثله	و لم تر حقا مثله من مخبر
اتانا بآيات كشمس منيرة	تجلت على الاقطار في خير منظر
اتانا ببرهان من العلم و الهدى	فيا خير مورود و يا خير مصدر
جواد اذا ما افقر الدهر اهله	و ما مثله في الجود من متبكر
هو الغيث جودا بل هو البحر زاخرا	بلى فوق بحر زاخر متزخر
غياث لملهوف ملاذ لخائف	مغيث لمحروق الجوى متصور
مجير لمن لا ياخذ الناس كفه	معز لمقهور ذليل مصغر
نظام لحق بل قيام لأهله	نكال لباغي الشر للحق منكر
حيوة لمن قد مات بالجهل قلبه	نجاة لاسرى في ضلال محرر
رحيم على الادنى عفو عن العدى	و ما لكسير مثله من مجبر
تراه اذا ما جئته متهللا	فاحبب به من ازهر اللون انور
مليح ملاح الدهر سكرى بحسنه	و كم من قتيل باللحاظ مقطر
قد انشق صدر البدر حبا لوجهه	طوبى لقلب بالهوى متفطر

پھر آپ ﷺ کی ان جلیل القدر داعیانہ خدمات کا تذکرہ ہے جن کے تحت آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی امانت وصداقت پر ان کی گواہی لینے کے بعد انہیں توحید کی دعوت دی اور اسے قبول کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری اور نہ ماننے والوں کو ہلاکت وعذاب سے ڈرایا، جسے سن کر وہ لوگ حیران وششدر رہ گئے۔ سعید لوگوں نے اس

پیغام کو قبول کیا، لیکن بدبختوں نے جن میں آپؐ کا چچا ابولہب بھی شامل تھا، اس کا مضحکہ اڑایا۔ ابولہب نے آپؐ کو برا بھلا کہا، جس کے جواب میں قرآن کریم کی سورۃ ''اللہب'' نازل ہوئی۔

لقد انذر الاقوام سراً و جهرة   و ما مثله لله من متشمر

فصار ينادیهم خلال بيوتهم   و طورا ينادیهم بجمع و مشعر

دعا هم الی التوحيد و البر والتقی   و ترك المعاصی و الاذی و التجبر

و قام بامر الله يوما علی الصفا   فنادی الاهل من سميع و مبصر

الا خبروا عنی بما تعلمونه   فقد عشت فيكم مدة بين اظهر

فقالوا امين صادق غير كاذب   و ما قلت زوراً قط يا ابن المخير

فنادی بصوت زلزل الارض مرة   الا فاقبلوا قول النذير المذكر

الا فاهجروا ما تنحتون و سارعوا   الی ربكم قبل العذاب المدمر

اقروا بان الله لا رب غيره   و انی رسول من مليك مقدر

ففتح آذانا بحق مصدع   و بصر عميانا بنطق مفسر

فصاروا كأ ن الطير فوق رؤسهم   حياری جميعا للكلام المؤثر

و نادی شقی القوم تبا لمن دعا   فتبت يداه فی لهيب مسعر

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے سفرِ طائف اور وہاں پر آپؐ کو پیش آمدہ پریشانیوں اور ان پر آپؐ کے استقلال اور ثابت قدمی کے تذکرہ کے ساتھ آپؐ کی صفتِ رحم کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ان حالات میں بھی آپؐ نے ایسی قوم کو بددعا کے بجائے اللہ سے ہدایت کی دعاء مانگی، جو آپؐ کی اولوالعزمی کے ساتھ ساتھ ''رحمۃ اللعالمین'' ہونے کا بھی ثبوت ہے، کیوں کہ یہ وقت وہ وقت تھا جب کہ پہاڑوں کے فرشتہ نے خود آپؐ کے سامنے حاضر ہو کر ان گستاخوں کو پہاڑوں کے درمیان نیست و نابود کرنے کی تجویز رکھی تھی، لیکن رحمت و رافت کے پتلے اس اللہ کے بندے نے ان کی ہلاکت کے بجائے اللہ سے ان کی ہدایت کی دعا مانگی تھی۔ فرماتے ہیں:

و لما رأی من اهل مكة جفوة   اتی طائفا يرجو لنصر مؤزر

فلم يستجيبوا للرسول و اغلظوا   له القول سبّاً ثم ضربا باحجر

فباء بقلب مطمئن بربه   حزين علی اعمال قوم متبر

فلو شاء ان یدعو علیهم لطبقت   علیهم جبال فی نکال منکر
و لکن دعا رب اهد قومی فانهم   سکاری بجهل فی القلوب محبر

ان تاریخی واقعات کونظم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حلم و بردباری، صبر و ثبات، عفو و درگذر جیسے بلند اخلاق کے حوالوں سے شاعر مخاطب سے مختلف سوالات کرتے ہوئے خود ہی جواب دیتا ہے کہ ایسا شریف عرب و عجم (بلکہ بساطِ عالم پر) نہ کوئی ہوا ہے نہ ہوگا۔ ملاحظہ فرمائیے:

فهل نظرت عین کمثل محمد   رؤوفا علی الاعداء بعد التبصر
و هل مثله فی الناس من متحلم   و هل مثله فی الخلق من متصبر
و هل مثله فی العرب و العجم ماجد   و هل مثله فی البیض و السود من جری
فمن کان او من قد یکون کاحمد   عفوا عن الزلات للمتعثر
هو الرحمة المهداة من عند ربنا   تجلی علی الاقوام فی خیر مأثر

آپ ؐ کی افضلیت، عظمت، اور جلالت کا ثبوت واقعۂ معراج النبی ﷺ ہے، جب کہ آپ ؐ کو تمام انبیاء کرام کی سرداری کا شرف حاصل ہوا اور آپ ؐ اللہ کے مقرب فرشتے حضرت جبرئیلِ امین علیہ السلام کی رفعتوں کو بھی پار کر گئے، اور دیدارِ الٰہی سے مستفیض ہوئے۔ واقعۂ معراج کا ذکر بہت ہی خوبصورت انداز میں مندرجہ ذیل اشعار میں ملتا ہے:

دعاه اله العرش لیلا الی العلی   و عزره وا ها له من معزر
فسار یلاقی واحدا بعد واحد   من الرسل فی عز منیع موقر
و یخترق السبع السماوات کلها   طِباقا ویعلو مظهرا فوق مظهر
و جبریل یمشی آخذا برکابه   فواها له من راکب اللیل اقمر
فکان له ما کان من فضل ربه   و نال مکانا قد علا عن تصور
هو الاول العالی و ان جاء آخرا   فاعجب به من عاقب متصدر

اس کے بعد ہجرتِ مدینہ کے اہم واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے اسے اہلِ مدینہ کی خوش بختی اور سعادت اور مدینہ منورہ کے تقدس و پاکیزگی کی وجہ آپ ؐ کی آمد کو قرار دیا ہے۔ اسی کے ساتھ آپ ؐ کے روضۂ مبارک کا تذکرہ ہے کہ جس کی موجودگی دنیا بھر کو معطر کئے ہوئے ہے۔ یہ اشعار بھی بلند پایہ ادب کا نمونہ ہیں، فرماتے ہیں:

و لما تمادی القوم فی الغی و الاذی   ترحل عنهم رحلة المتضجّر

ترحل عن قوم فمالت جدودهم   و حل علی قوم بخیر مفجر

و قد نزلت منه علی اهل طیبة   شآبیب فضل فی سناء مشهر

هنیئا لانصار النبی سعادة   أبتها فئام من ضلال التفکر

فطیبة طابت و اشمخرّت الی العلی   و قد لألأت اقطارها بالتنوّر

بها قبة خضراء زهراء بهجة   یحل بها قبر الحبیب المعطر

یہاں تک پہونچ کر مولانا نے فدایانہ انداز اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ آپ کا ذکر بھی حیات افزا ہے، اس کو حیات نصیب ہو جاتی ہے جو آپؐ کے ذکر میں سرشار رہتا ہے میری جان اس زندہ کے قربان جو چند قبروں کے درمیان آرام فرما ہیں:

و ما مات من تحیی القلوب بذکره   بنفسی حی راقد بین اقبر

فدته نفوس العالمین فانه   هو الروح فی هذا الوجود المصوّر

مولانا مرحوم اپنے اس شعری سرمایہ میں اس تمنا کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ کاش آنکھوں کے بل چلنا ممکن ہوتا تو میں تیز رو گھوڑے کی طرح دوڑ کر آپؐ تک پہونچ جاتا۔ میں، میری جان، میرے آباؤ اجداد اور میرا سب کچھ اس ذاتِ اقدس پر قربان:

و لو کان یمشی بالعیون محبة   عدوت له بالعین عدو المضمر

فدی لرسول الله نفسی و مهجتی   و أمی و آبائی اقلی و اکثری

اخیر میں حسبِ معمول آپؐ پر، آپؐ کے تمام صحابہ اور تمام آل و اولاد پر سلام کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے قصیدہ مکمل ہو جاتا ہے:

علیه صلوٰة الله ثم سلامه   و اصحابه اهل التقی و التبرر

و آل رسول الله فی کل ساعة   سلاما کمسك اطیب الریح اذفر

اس قصیدہ کا مطالعہ کرنے سے جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مولانا مرحوم کی شاعری کا بنیادی محور قرآن اور اسلامی تعلیمات رہا ہے۔ ان کے فکر و ادب پر قرآن و حدیث کے گہرے اثرات نمایاں ہیں۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے کے باوجود انہوں نے قرآن و حدیث کی بنیادی تعلیمات کو شعر و ادب میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی۔ اور اس میں ایک ماہر ادیب کی مانند کامیابی بھی حاصل کی۔ فنی ہئیت کے اعتبار سے یہ نعت اگرچہ قصیدہ کی صنف میں آتی ہے، کیوں کہ اس میں تشبیب بھی ہے، گریز بھی، مدح بھی ہے طلب بھی اور خاتمہ بھی۔ لیکن شاعر نے اس فنی ترتیب کا باقاعدہ التزام نہیں کیا، بلکہ وقت

اور موقع کی مناسبت سے جہاں جس مضمون کو چاہا قلم بند کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تشبیب کے بعد گریز اور پھر تشبیب کے اشعار ملتے ہیں۔ البتہ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ پوری نعت کا کوئی بھی شعر بلا وجہ محض لفاظی کے لئے نہیں کہا، بلکہ اس میں خلوص و عقیدت کے ساتھ ساتھ اسلامی آداب اور تعلیمات کا خیال رکھا گیا ہے۔

جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر جس شان کے ساتھ خوبصورت انداز میں مناسب موقع پر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مشہور و معروف عرب قبائل اوس وخزرج اسلام کی بدولت خوں ریز لڑائیوں سے اجتناب اور ان کے جوانوں کی غزوات میں شرکت اور مجاہدانہ کارناموں کے پیچھے جو شخصیت کارفرما رہی اس کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔

اس طریقہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس نعت کا ایک تہائی جز و تشبیب اور گریز کے بعد پھر مدح محمدؐ کی طرف رجوع کرتا ہے ، اور پھر ان کے اوصاف کے تذکروں میں کوہِ صفا پر آپ کا مکہ کے قبیلوں کو جمع کر کے اپنی صداقت وامانت کی گواہی لینا پھر تکلیف دہ واقعات کے پیش آنے کے ساتھ ساتھ سورۂ لہب کے شانِ نزول کو جتنے جامع انداز میں شعری لباس پہنایا گیا ہے وہ بہت ہی دل کش ہے فرماتے ہیں:

و نادی شقی القوم تبا لمن دعا فتبت یداہ فی لھیب مسعر

ایسے ہی جب طائف کے سفر میں آپؐ کے ساتھ کچھ بدبختوں نے ناروا اور نازیبا سلوک کئے اور پہاڑوں کے فرشتے نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی ہلاکت کی اجازت چاہی، لیکن آپؐ نے رحمۃ للعالمین ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے ہدایت کی دعا مانگی اسے بھی بہت بلیغ انداز میں نظم کیا ہے:

و لکن دعا رب اھد قومی فانھم سکاری بجھل فی القلوب محبر

واقعۂ معراج اور ہجرت مدینہ کے تاریخی واقعات کو چند اشعار میں سمو کر ''دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا'' محاورہ صادق کر دیا ہے۔ مدینہ کے تذکرہ میں یہ شعر مولانا مرحوم کے شوق، تڑپ اور جذبہ کو نمایاں کرنے کو کافی ہے:

و لو کان یمشی بالعیون محبۃ عدوت لہ بالعین عدو المضمر

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے جذبات پر قابو نہیں پا رہا ہے اور وہ اس جذبۂ صادق میں تمام ناممکنات کو ممکن کر دینا چاہتا ہے اور جب کچھ بس نہیں چلتا تو وہ درود وصلوۃ کے ساتھ قصیدے خاتمہ کا اعلان کر دیتا ہے۔

الغرض یہ نعتیہ قصیدہ عشق ومحبت کے اظہار کے علاوہ خلوص وعقیدت کا آئینہ دار بھی ہے، جس میں مستند تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کی تعلیمات بھی نمایاں ہیں، اور سیرت مبارکہ کے اہم واقعات بھی۔

دوسرا قصیدہ قافیہ

یہ قصیدہ تریسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ حسب روایت اس کی ابتداء ان خوش نما مناظر سے ہوتی ہے کہ جب حضورِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے وجودِ پاک نے اس دنیا کو زینت و رونق بخشی۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے دنیا پر گھٹا ٹوپ تاریکی سی چھائی ہوئی تھی، لیکن آپ کی آمد نے اسے منور و روشن کر دیا اور وہ روشنی ایسی تھی جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی کی چمک۔ یا طور کی بجلی یا مکہ کی پہاڑیوں پر نکلا ہوا چاند:

زال الظلام و لاح النور فی الافق — برق تألق فی داج من الغسق [1]

برق من الطور؟ أو بدر علی جبل — ببطن مکة منشق علی فلق

چاند کی مناسبت سے شاعر کا ذہن معجزۂ شق القمر کی طرف چلا جاتا ہے اس کو بہت ہی خوبصورت انداز میں ایسی نادر تشبیہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو نا قابلِ مثال ہے، فرماتے ہیں:

باصبع من ید کانت اشارتها — فی البدر انکی من الصمصام فی العنق

اسکے بعد مولانا نے اپنے تجاہلِ عارفانہ کو دور کرتے ہوئے اس روشنی اور نور کی موجودگی کو حضور اکرم ﷺ کی آمد پر خوشی کے اظہار سے تعبیر کیا ہے:

و اها له من نبی لا مثال له — فاق الخلائق فی خلق و فی خلق

محمد خاتم الانبیاء سیدهم — حامی الحقیقة مفتاح لمنغلق

شاعر یہیں سے اپنا رخ مدحِ نبی ﷺ کی طرف موڑ دیتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف عظمی اور اخلاق عالیہ کو نظم کرتا چلا جاتا ہے۔

درمیان میں مولانا اس وقت کے ماحول اور حضورِ اکرم ﷺ کی آمد سے اس ماحول کے بدلے ہوئے اثرات کو بہت دل چسپ انداز میں اس طرح نظم کرتے ہیں:

اتقی الانام و ازکاهم و اعلمهم — بالله احلمهم فی الرتق و الفتق

زاکی النجار جمیل الوجه انوره — یمحو الظلام کبدر التم فی الافق

قد جاء و الناس فی هرج و فی مرج — و الظلم عم بسیط الارض بالقلق

و الجهل کالليل قد أرخی ذوائبه — فی غیم کفر علی الآفاق منطبق

---

(۱) یہ قصیدہ بھی "الرشید"، لاہور کے نعت نمبر میں شائع ہوا ہے؛ ملاحظہ فرمائیں صفحہ: ۲۳۲ تا ۲۳۷۔

فانشق صبح الهدى من نور طلعته	يجلو غياهب ليل الجهل و الحمق
فاصبح الناس فى علم و فى حكم	بنعمة الله بعد الضل و الخرق
و اصبحت امة امية عرفت	بالجهل سابقة الاقوام و الفرق
فالعلم و العدل سارا تحت رأيتها	و الفتح و النصر و الاقبال فى الطرق
و الصبر و الصدق و الاخلاص حلتها	و رأية العز فى الآفاق بالخفق
حب النبى و تقوى الله شيمتها	و اليمن و السعد مثل العقد فى العنق
يا اكرم الناس عند الله منزلة	و افضل الخلق من جمع و مفترق

پھر شاعر کا ذہن واقعۂ معراج کیطرف منتقل ہوجا تا ہے ،اور وہاں آپ کو اللہ تعالی نے اپنے جن خصوصی انعامات سے نوازا ان کا تذکرہ چند اشعار میں اس طرح کیا گیا ہے:

قد خصك الله بالاسراء ليلة اذ	ترقى السموات من طبق الى طبق
حتى بلغت من العليا ء ذروتها	و غاية لم تدع شأوا لمستبق
آتاك ربك ما لم يؤته احدا	من الجمال كمثل اللؤلؤ الفلق
اوتيت علما و حلما زانه خلق	و حكمة انت فيها حائز السبق
جودا يعم الورى نيلاو مرحمة	على الاعادى و عدلا غير ذى رنق
امانة صلة للرحم مكرمة	فصل الخطاب و وحيا غير مختلق
بلاغة اخجلت من رامها و رمت	مبارزيها بذل الابكم الخرق
و باهرات من الآيات معجزة	تبدو لناظرها بالليل كا لشفق
شجاعة و اصطبارا يوم ملحمة	اذا تطيش يد الرعديدة الفرق

ان انعامات کے تذکرے کے بعد شاعر پھر اوصافِ نبی ﷺ کا ذکر فرماتے ہیں:

كنت الغياث لايتام و ارملة	امست من الجوع كالبالى من الورق
كنت الملاذ لمضطر و مضطرب	من المساكين للآفات معتنق
حصنا حصينا و مأوى كل ذى شرف	عزيز قوم رماه الدهر من حلق

کنت المجیر لمظلوم تقلبہ ایدی الزمان کریش فی الھوا قلق

پھر ہجرت نبوی ﷺ کا تذکرہ ہے جس کے اثرات یہ مرتب ہوئے کہ مدینہ منورہ بارونق ہوگیا اور پھر جہاد و غزوات کا سلسلہ شروع ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینِ حق کا بول بالا ہوا اور ان غزوات میں بھی آپؐ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ بدسلوکی گوارا نہیں کی ن بلکہ انتہائی حلم و بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی ہدایت کی دعائیں کیں:

ھاجرت من وطن قد کنت تألفہ لظلم قوم بشر الکفر ملتزق

طابت بغرتك المیمون طلعتھا مدینة احدقت بالبیض و الدرق

جاھدت کل کفور قد عصی و طغی و زادہ غیہ رھقا علی رھق

فاصبحوا لایری الا مساکنھم و ادخلوا فی سعیر دائم الحرق

و اظھر اللہ دینا قد اتیت بہ و تم نورك رغم الحاسد الحنق

و ما دعوت علی الاعداء اذظلموا بشدة البأس من خسف و من غرق

بل قد دعوت لھم بالرشد اذ جھلوا ما قد تبین عند الراشد الحذق

مولانا اس تذکرہ کے ضمن میں پھر محبت عقیدت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے اور رسولِ اکرم ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنی عقیدت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ آپ، رسول اکرم ﷺ کے سامنے دو زانو ہو کر گفتگو کر رہے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ ان اشعار کو بہ نفسِ نفیس سماعت فرما رہے ہیں:

یا خیر مقتتل یا خیر مصطلح باللہ مفترق ، للہ متفق

احییت جامدة ، اشعلت خامدة بمنطق کنظام الدر متسق

انت النذیر لخلق اللہ قاطبة و انت ایاہ من حر الجحیم تقی

انت البشیر من طابت سریرتہ بجنة یالھامن خیر مرتفق

انت الحبیب لمن حلت سعادتہ و لیس یرغب عنھا غیر کل شقی

انت العماد لقوم لا عماد لہ انت الرشاد لمن قد ضل فی طرق

انت الحیاة لمن ماتت عزیمتہ انت الربیع لاھل الجدب و الرمق

انت النجاة عن امسی بمرتکم من الظلام ببحر زاخر عمق

یا خاتم الرسل حب اللہ صفوتہ یا بکر آمنة الزھراء کالفلق

ارجو رضاك فلا تحرم نوالك من	يدعى باسمك فى البلدان و الرفق
فانت اكرم من اوفى بذمته	و انت ارحم من يرثى لمرتبق
و انت اشرفهم بيتا و منزلة	و انت ذو نسب كالشمس مؤتلق
و انت اجمل من يرنو بمقلته	و خير لاق بوجه مشرق طلق
و انت افضل خلق الله قد علموا	و انت اكملهم فيما مضى و بقى
فانت فى الناس كالياقوت فى حجر	و انت فى الخلق مثل النور فى الحدق

اس کے بعد مولانا نے دعایا طلب کے انداز پر شعر کے خوبصورت قالب میں آپؐ پر اپنی جان فدا کرنے کی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے اپنی طرف نظر کرنے، اپنی مغفرت طلب کرنے، اور آپ کے ذریعہ اپنی شفاعت کی درخواست کی ہے۔ ایسے وقت جب کہ آپ ﷺ کے سوا کوئی کسی پیاسے کو پانی دینے والا نہیں ہوگا، اور آپ ﷺ کا دیا ہوا پانی کا لبریز جام تمام غموں کو کافور کر دے گا، ملاحظہ فرمایئے:

يا خير من عا ش فى الدنيا و مات بها	نفسى الفداء لقبر منك ملتصق
و انظر الى ظفر قدجاء معتذرا	و الطف بصب كئيب هائم شقق
و استغفر الله لى حتى يجاوز عن	زلات نفس هوت بالجهل فى الزلق
عسى انال غدا منك الشفاعة اذ	قد الجم الناس للآثام بالعرق
فامنن علينا رسول الله ليس لنا	الااليك النجا فى الحادث الازق
انت الشفيع لنا اذ لا يقوم لها	سواك فى الناس يوم الحشر و الصعق
و انت تسقى و لا ساق سواك لنا	كأسا يطاف بماء بارد غدق

اس کے بعد کے اشعار میں جنہیں حاصل قصیدہ کہا جا سکتا ہے مولانا مرحوم نے اپنی ایک خاص حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہیں تلمیحی اشعار بھی کہہ سکتے ہیں، (حضرت یوسفؑ نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے لئے جو قمیص ارسال فرمائی تھی اس کو چہرہ پر ملنے سے ان کی بینائی واپس آ گئی تھی)۔ شاعر نے اپنی حالت کو اسی سے مشابہت دے کر اس حالت پر خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ جس نے اسے تقوی کا لباس عطا فرمایا، اور اس قادر مطلق کی ذات ایسی ہے جو جمع ہوئے خون سے انسان پیدا کرنے پر قادر ہے:

جاء البشير فرد الله لى بصرى	لما اتى بقميص فائح عبق

فالحمد لله ان لم يأتني اجلي   حتى لبست لباسا زاد كل تقى

سبحان من برء الاكوان من كلم   سبحان من خلق الانسان من علق

اخیر میں مولانا نے رسول اللہ ﷺ، آپؐ کے اصحابِ کرام، اہل بیت اور تمام رفقاء پر درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا ہے، اور اس طریقہ پر اس نعتیہ قصیدہ کا اختتام کیا ہے:

ثم الصلاة صلاة لاانقضاء لها   على النبي مع الاصحاب و الرفق

و اهل بيت رسول الله كلهم   مالاح بدر الدجى و الشمس في الافق (۱)

مجموعی اعتبار سے یہ نعت بھی اپنی ہیئت کے اعتبار سے قصیدہ کی صنف میں ہی آتی ہے۔ شروع سے آخر تک تمام اشعار گویا کہ ایک لڑی میں پرودیئے گئے ہیں، جن کا تسلسل برقرار ہے۔ اس قصیدے میں جن مضامین کو خاص طور پر نظم بند کیا گیا ہے، ان میں آپ ﷺ کی افضلیت، محبت، اللہ تعالی کے آپؐ کے ساتھ خصوصی انعامات، معراج کا واقعہ، معجزۂ شق القمر، غزوات اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آپ ﷺ کے تئیں محبت، نیز آپؐ کے اخلاق عالیہ کو نظم کیا گیا ہے۔ اس قصیدہ میں بھی قرآنی آیات کو بہت ہی برمحل، برجستہ اور مناسب انداز میں نظم کیا گیا ہے۔ خصوصی طور پر معجزۂ شق القمر کو جس خوبصورت تشبیہ کے ساتھ شعر میں پرویا ہے اس کی مثال شاذ و نادر ہی مل پائے گی۔ فرماتے ہیں:

بأصبع من يد كانت اشارتها   في البدر انكى من الصمصام في العنق

حقیقت یہ ہے کہ ہاتھ کی انگلی کے اشارہ کی معجزانہ طاقت کو بیان کرنے کے لئے اس سے زیادہ مناسب الفاظ مشکل سے ہی مل پائیں گے۔

اسی طریقہ پر معراج کے موقع پر اللہ تعالی نے اپنے محبوب، آقائے نامدار ﷺ کو جن انعامات واکرامات سے نوازا ان کو بہت ہی جامع انداز میں چند مصرعوں میں سمو کر مولانا مرحوم نے اپنی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرالیا ہے۔

مولانا کے شاعرانہ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو قرآنی آیات میں ملکہ حاصل تھا، اسی لئے وہ جس طرح چاہتے قرآنی آیات کا برمحل استعمال کر لیتے اور وہ وہاں پر اس انداز سے چسپاں ہو جاتیں گویا کہ وہ داخلِ شعر ہیں۔ اس نعت میں بھی آپ نے قرآنی آیات کو اشارات و کنایات کے علاوہ جہاں مناسب سمجھا وضاحت سے بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ احقاف کی آیت کے مندرجہ ذیل ٹکڑے کو جس خوبصورتی سے نظم کیا ہے وہ داد کے قابل ہے:

---

(۱) یہ قصیدہ ماہنامہ ''قاسم العلوم'' دیوبند میں ''بضاعۃ مزجاۃ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے؛ ملاحظہ کیجئے: عربی قصیدہ ''بضاعۃ مزجاۃ'' / مولانا ظفر احمد عثانی / ماہنامہ قاسم العلوم، دیوبند: ۲/۴؛ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ؛ ص: ۵-۸۔

فاصبحوا لا یری الا مساکنهم (۱)　　　و أدخلوا فی سعیر دائم الحرق

قرآنِ پاک نے حضورِ اقدس ﷺ کو ''بشیر ونذیر'' کے اوصاف کے ساتھ متصف کیا ہے۔ (۲) مولانا نے ان اوصاف کو بہت مہارت کے ساتھ یوں نظم کیا ہے:

انت النذیر لخلق الله قاطبة　　　و انت ایاه من حر الجحیم تقی

انت البشیر لمن طابت سریرته　　　بجنة یا لها من خیر مرتفق

اپنی مخصوص حالت کو بیان کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے جو شعر کہا ہے اس کے پسِ منظر میں بھی قرآن کریم کی سورۃ یوسف کی اس آیت کا اگرچہ صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے، لیکن شعر کو دیکھ کر خود بخود قرآن کریم کی آیت ﴿ فلما ان جاء البشیر القاه علی وجهه فارتد بصیرا ﴾ (۳) ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے مولانا کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

جاء البشیر فرد الله لی بصری　　　لما اتی بقمیص فائح عبق

الختصر مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیش کردہ دونوں نعتیہ قصائد کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا اسلامی تعلیمات اور قرآنیات واحادیث مبارکہ کو اشعار کے سانچے میں ڈھالنے کے فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

---

(۱) القرآن الکریم: ۲۵/۴۶۔

(۲) و ما ارسلناك الا مبشرا و نذیرا☆؛ القرآن الکریم: ۱۰۵/۱۷۔

(۳) القرآن الکریم: ۹۶/۱۲۔

نعتیہ قصیدہ: وسیلۃ الظفر

مولانا ظفر احمد عثمانی کا یہ نعتیہ قصیدہ ۱۹۳ اشعار پر مشتمل ہے، اس قصیدہ میں بھی مولانا کے زیادہ تر وہی مضامین ہیں جو پہلے قصائد میں آچکے ہیں۔ لیکن تبدیلیٔ اسلوب کی وجہ سے اس میں جدت، ندرت اور حسن آ گیا ہے۔ حسبِ معمول اس قصیدہ کی ابتداء بھی تشبیب سے ہوئی ہے، لیکن عام طور پر تشبیب میں سلمٰی، لیلیٰ یا سعاد وغیرہ کے ذکر سے قطع نظر اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ما للظلام تبدلت بالنور	ما للزمان أتى بكل حبور
هل لاح نجم فى مطالع صور	ام أونست نار بجانب طور
او اومض البرق العقيق بحاجر	فتلألأت منها جبال حضير
او اسفرت عن وجهها بدرية	أَمْطَرَتْ فؤادى ليلة بضفير
دع عنك ذكر سعاد و الزمن الذى	منى مضى فى حب ذات خدور
فمتاعه وسروره و حبوره	يفنى و لو فى مدة و شهور
لا تأمنن الى وداد احبة	يمضى النهار عليه و ابن جمير
ما بين رقدة ليلة فى يقظة	تتغير الاحوال يا ابن سميرى
لو ساوت الدنيا جناح بعوضة	عند الاله لمات كل كفور
تبا لدنيا لا يدوم نعيمها	شيبت حلاوتها بمر كدور
لا تجزعن اذا ابتُليت بفادح	فالسهل يأتى بعد كل عوير
و اعلم بان اليسر توأم عسرة	ورديفها كالجود بعد حرور
فوض امورك للاله و لا تكن	كالفلسفى مكذب التقدير
و اطلب نعيما لا يزال ولم يزل	فى بهجة و غضارة و نضور

اشعار بالا میں مولانا نے رسول اللہ ﷺ کی شان مبارک میں جس انداز سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ جہاں نعت کا رنگ لئے ہوئے ہے، وہیں دوسری طرف موعظ ونصیحت کا خزینہ بھی ہے۔ خصوصا دنیا کی بے ثباتی، اور غم و پریشانی میں گریہ وزاری نہ کرنے کا ذکر جس ناصحانہ انداز میں کیا گیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

اس کے بعد درج ذیل اشعار میں آں حضور ﷺ کی مدینہ تشریف آوری اور مدینہ منورہ کے حسین وجمیل مناظر کی بہت ہی خوب پیکر تراشی کی گئی ہے۔ان اشعار میں مدینہ منورہ کے تقدس و پاکیزگی کو قرآنی تلمیح میں جدید انداز میں پیش کیا گیا ہے:

بجوار احمد خير من وطى الثرى	و اجل من فى الارض من مقبور
انى اطلعت على معالم طيبة	و شممت ريح جنابها المعطير
بلد يحل به المطيب طيب [1]	و به تزول هموم كل ضجور
و به وجدت النور بعد تحير	و به عرفت الحق عند خبير
و به استرحت من الزمان و ريبه	و علمت ان محمدا لمجيرى
محبوب رب العالمين خليله	و صفيه حقا و خير سفير
منه الحياة لكل حق ميت	منه الممات لكل قول زور
منه البياض لكل قلب اسود	منه السواد لكل عين ضرير
منه البهاء لكل وجه عابس	منه الضياء لكل ذات قتور

اس کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر یوں روشنی ڈالتے ہوئے رسول اکرم ﷺ کے فاضلانہ وکریمانہ اخلاق پر مولانا نے خصوصی توجہ مبذول کرائی ہے:

نفسى و ما بيدى فداه فانه	اصل الخلائق مركز التدوير
لو لاه لم تكن السماء و ارضها	كلا و لا روح بتلك الصور
هو سيد رسل الكرام امامهم	و له لواء الحمد يوم نشور

قد كان آية ربه فى الخَلق و الخُلُق العظيم ملاك كل امور

یہیں سے مولانا کا ذہن ان حالات کی طرف منتقل ہوا، جن میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ وہ دور جہالتوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا، اچھائیوں اور نیکیوں کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ان تمام حالات کو بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں عربوں کے اس عہد کے معاشرتی عیوب مثلاً: عہد شکنی، امانت میں خیانت، لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا، بت پرستی وغیرہ ایسے عیوب تھے جو نا قابلِ معافی اور انسانیت کے ماتھے پر کلنک تھے۔اس لئے مولانا

---

(۱) لا اقسم بهذا البلد ☆ و انت حل بهذا البلد☆؛القرآن الکریم:۹۰/۱-۲۔

نے خاص طور پر ان کو ذکر کیا ہے:

قد جاء نا و الناس فی ظلماتهم	و الجهل قائد هم لکل فجور
مرجت عهودهم و ضاع امانهم	و الظلم شیمة تابع و خفیر
و أدوا البنات فیا لها من قسوة	کادت تخر لها جبال ثبیر
عبدوا الحجارة من سفاهة رأیهم	و صبوا الی حب النساء الخور
کانت صلوتهم المکاء برقصة	فیها الصیاح بشهقة و زفیر
و طوافهم بالبیت کان معرة	عریا اناثهم و کل ذکور
و الیوم یبدو بعضه او کله	تسبیحة للعاریات البور
سحقا لذلك من اشد وقاحة	بعداً لذلك من خنا و عهور
کانوا کذلك اذا اتاهم ربهم	بهدایة من عنده و بنور

پھر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد حالات میں جو تبدیلی رونما ہوئی اسے تفصیل کے ساتھ مولانا نے مندرجہ ذیل اشعار میں اس طرح پیش کیا ہے:

بمحمد انسان عین محامد	و اجل من قد جاء نا بزبور
أحیا به الأرض الموات فأصبحت	مخضرة الاکناف ذات عطور
قد سمّعت کلماته صم الهوی	و بوجهه انفتحت عیون العور
شمس أضاء بها الزمان و أهله	بالعلم و الحکم العُلی و الخیر
بدر به انمحت الدیاجر کلها	و وهت به ارکان کل غرور
و اللّه ما انسی الجبال خلائه	بحرا منعزلا عن المعمور
کلا و بطحاء مکة و طاًة	و سلام احجار علیه و فور
صار الحماد بعنکبوت حلقة	موضونة لوقایة المحصور

رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے ساتھ قریشِ مکہ نے جو ناروا برتاؤ کیا تھا وہ تاریخ کا بدترین باب ہے، اسی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اپنی شرافتِ نفسی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر طریق پر ان کی رہنمائی فرمائی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آخری دو اشعار میں آپ کی ہجرت کے وقت آپ کی غار میں پناہ گزینی، دشمنوں کو آپ کی تلاش اور غار کے منھ پر مکڑیوں

کا جالا بُن لینے کے ذکر کرنے کے بعد ذیل کے اشعار میں کچھ معجزات اور غزوۂ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت کے اظہار کے بعد فتحِ مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے حسنِ سلوک کو اشارۃً ذکر کیا گیا ہے:

و البیت یعرف حین طهره من الأصنام بالتوحید و التکبیر

و کذالك الجمرات تعرف رمیه	و الرکن یعرف لثمه بفریر
و کذلك الأشجار تعرف أمره	فأنت تشق الأرض ذات فهور
و البدن قد عرفت حلاوة نحره	فمشت الی خطیة بطمور
و الجذع حنّ الی الحبیب برنّة	کالطفل حنّ لأمه بزحیر
جاء الملائکة الکرام لنصره	فی یوم بدر بالعلاء شهیر
بالرعب أیده الاله و بالصبا	و تألف فی جنده المنصور
ملأ البسیطة بالعدالة و التقی	من بعد مُلئت بکل شرور
فتح البلاد بحلمه و بجوده	و عطاء ه و نواله المشکور
واهاً لخطبته بمکة بعد ما	قهر العدو بسیفه المشهور
یا اهل مکة ما ترون جزاء من	قطع الحبال و عضنی کعقور
قالوا کریم انت و ابن کریمنا	فافعل بنا فعل الجیا بمریر
فاغرورقت عیناه حین رثی لهم	قال اذهبوا طلقاء غیر أسیر

مذکورہ حالات کی تبدیلی میں آقائے نامدار سرکارِ دوعالم رسولِ مقبول ﷺ نے غیر معمولی کارنامہ انجام دیا، انہی خدمات کے توسط سے آپؐ کی عظیم شخصیت کے متعدد پہلوؤں کو اس طرح سمیٹا گیا ہے:

عجبا لرحمته علی اعدائه	ولعفوه عن خصمه المقهور
فلقد عفا عن قدرة عمن طغی	و بغی علیه و سامه بفطیر
فاولئك الطلقاء منّ علیهم	کرما فاسلم کلهم بشکور
ارأیت فی الدنیا یتیما مثله؟	ملك القلوب بهکذا التسخیر
او ابصرت عیناك مثل محمد؟	من ارعیّ بالعطاء درور
ا رأیت یا عین الزمان کاحمد؟	من واهب المأة الهجان غیور

کلا و لم یجدوا کاحمد مدرھا	متقدما فی کل یوم نفیر
کلا و لن یجدوا کاحمد ماجدا	جبل الوقار بحومة العاثور
فاق الخلائق بالسماحة و الندی	و دوام رفعة ذکرہ المذکور
و بعزمہ و بصبرہ و ثباتہ	و بجدہ و بجَدّہ المقدور

آں حضرت ﷺ کی کرامت، سخاوت، عفو و درگذر اور آپؐ کی ذاتِ مبارک سے عالم انسانیت کو جو فیض پہونچا اس کی مثال زمانہ آج تک پیش نہیں کر سکا۔ مولانا نے اشعارِ بالا میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔

حسن و جمال، کمال و خصال کسی بھی چیز میں آپؐ کا ثانی کوئی نہیں تھا۔ ذیل کے اشعار میں مولانا نے آپؐ کے معمولاتِ شب و روز کے ساتھ سفرِ معراج، نیز وحیِ الٰہی کے تذکرے کے ساتھ شیخ سعدی کے نعتیہ اشعار:

بلغ العلیٰ بکمالہ	کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ	صلوا علیہ و آلہ

کو اپنے اسلوب میں ایک ہی شعر میں سمیٹ دیا ہے:

و بحسنہ و جمالہ و کمالہ	و خصالہ و سخاءہ الموفور
فتراہ اذ ما جئتہ متبسما	متھللا کالبدر فی التنویر
ترك التنعم بالحظوظ لغیرہ	و اختار ضیق معیشة بتمور
یھب الجزیل عدوہ و صدیقہ	و یبیت ملتوی الحشا بحصیر
واللہ زیّنہ بحسن براعة	وبلاغة بجوامع المأثور
و بعفة و أمانة و بوصلة	للرحم من بر و من فاجور
و عبادة و طھارة وریاضة	للنفس فی المیسور و المعسور
جُعِلت صلاة اللیل قرة عینہ	و الناس فی الغفلات فوق سریر
احیی اللیالی فی عبادة ربہ	حتی اشتکی قدماہ ضُرًّ فطور
یبکی علی غِیَر الزمان و اھلہ	یأ سی علی قوم اذل خسیر

اسری الالہ بعبدہ لیلاالی البیت الذی سماہ بالمعمور

و سما بہ فوق السماوات العلی	و اری من الآیات کل کبیر

حتی تأخر عنه جبرائیل فی	متشامخ عن غیره محظور
حتی دنا من ربه فی منزل	من قاب قوسین بخیر ضمیر
و اللّٰه حیاه بخیر تحیة	لا تنقضی ما اوحی من المأمور
بلغ العلی بکماله و خصاله	کشف الدجی بجماله المغضور

ان اشعار کے بعد صحابۂ کرامؓ کی مقتدر ہستیوں کی خصوصیات کو بڑے پرلطف انداز میں بیان کیا گیا ہے:

و بدت صحابته نجوما للهدی	فی کل ناحیة و کل ضفیر
منهم ابو بکر امام اولی التقی	بفراسة و رزانة التفکیر
ما کان اثبته لکل مهمة	کادت تزول لها ذوات صخور
و اها لخطبته البلیغة عند ما	مات النبی و ضج کل صبور
من کان یعبد احمدا فوربکم	مات الحبیب و لات حین نکیر

من کان یعبد ربه فهو الالٰه الواحد القیوم خیر نصیر

هذا الثبات فهل سمعت بمثله؟	هذا الوقار و کان خیر وقور
هذا هو الصدیق خیر خلیفة	خلف النبی و کان خیر وزیر
نصر الحبیب بنفسه و باهله	و بعرضه و المال غیر قتور
قد کان ارحمهم بامة أحمدؐ	اسخی الانام بفضله الموفور

حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اول ہیں، اس لئے ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلے ان کی منقبت میں اشعار کہے گئے ہیں۔ اس کے بعد خلیفۂ دوئم حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ کو مندرجۂ ذیل اشعار میں خراجِ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں:

ثم الخلیفة بعده عمر الذی	فتح البلاد و کان خیر امیر
و اشدهم فی اللّٰه اطوعهم له	قرما هما ما رغم کل فجور
لیث النهار و راعیا فی لیله	لم ینخدع ابداً لدار غرور
فاق الملوك بعدله و بفضله	و بعلمه بسیاسة التدبیر
اهل السیاسة کلهم تبع له	فیا اتی من اعدل الدستور

پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، سے نسلی تعلق کی بنا پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے ان کے مناقب یوں بیان کیے گئے ہیں:

ثم الخليفة بعده جدی الذی فاق الوری بحیائه المشهور
عثمان ذو النورين افضل موسر ساس الخلائق فی خصال فقير
لم يرض لما حاصروه بداره ظلما بشقٍّ عصاهم المسمور
لم ينتهض لقتال قوم مسلم باغٍ و جاد بنفسه المبرور
اكرم به من ماجد بلغ العلى بفتوحه و بصالحات خيور
جمع الكتاب مرتبا ليصونه من كل محتمل من التغيير

اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مشہور حدیث ''انا مدینة العلم و علی بابها'' کی طرف بڑے لطیف پیرائے میں اشارہ کیا ہے:

زان الخلافة بعده علم الهدى بطل الوغى حلّال كل عسير
اعنى عليا خير باب مدينة العلم الذى هو منبع التفسير
اسد الاله و سيفه المسلول فى ميدان خيبر فى اجل ظهور
اعطاه رأيته النبى فيا لها من عزة قد نالها و فُخور
قد كان مولى المؤمنين امامهم فى الفصل بين خليقة و مغير
فاق الانام بعلمه و بزهده و بسبقه و بفضله المسطور

اس کے بعد حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما، کو عقیدت و احترام کے پھولوں کا منظوم گلدستہ اس طرح پیش کی گیا ہے۔ اس میں اہلِ بیت کی حرمت و تقدس کا بھی تذکرہ ہے اور کربلا کے لرزہ خیز و ہولناک مظالم پر سرسری مگر جامع تبصرہ بھی:

ثم ابنه الحسن الرضى المجتبى غوث الانام بكل يوم ثبور
قد اصلح الله العظيم بوجهه بين القسام قد اشرفوا الدمور
صدقت بشارة جده فيه وقد يئسوا من الاصلاح بعد شغور
احبب بعترته الزكية انها لنجوم بدر بالفلاح منير

و اللـه طهرهم و اذهب رجسهم   اهل النبی بأحسن التطهیر
و وجوه من عاداهم مسودّة   بدم الحسین بکربلاء القور
تباً لمن قتل ابن بنت نبینا   تباً له من ظالم ختّیر
قتلوه منفردا وحیدا عاطشا   اللـه اکبر یا لثار غریر
قتلوا وقد علموا بان قتیلهم   حب النبی نعم و بدر بدور
ریحانة الاسلام قرة عینه   زین العشیرة رغم کل فخور

حالات کربلا کے ضمن میں جو تکلیف دہ حالات پیش آئے اور کچھ منافقین نے ان حالات میں اپنی خباثتوں سے محبت واتحاد کے ماحول کو نقصان پہونچانے کی مذموم کوشش کی، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے اس طرح ذکر کیا ہے:

حق له ان لا یبایع کل من   عبد الهوی و اطاع امر غدور
من کان مرکبه النبی و ظهره   تبا لهم ترکوه رهن قتیر
یلقون احمد خشعا ابصارهم   سودا وجوههم کلون القیر
أحسین لا تبعد فذکرك خالد   و الذکر للانسان خیر عمور

اس کے بعد مولانا، رسول اللہ ﷺ کی مدح پر آجاتے ہیں اور محبت بھرے انداز میں رسول اللہ ﷺ کی مدح ''مدحِ حاضر'' میں کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

ختم الرسالة انت آخر لبنة   فی قصرها فعلا جمیع قصور
قد کان فی قصر النبوة خلة   سُدّت بوجهك یا اجل نذیر
انت الذی ادّبت قومك بعد ما   کانوا اضل بِمُهْمهٍ کبعیر
انت الذی قوّمت اعوج ملة   امیة بنظامك المنشور
فغدت اماما فی المعارف و التقی   و العدل و الاصلاح و التعمیر
سبقت علی الاقوام طرا بغتة   بعلومها و عفافها بطهور
و خصالها و کمالها و جهادها   و ظهورها و فتوحها لثغور
هذا لعمرك من اجلّ کرامة   و اعز معجزة اتی بظهور

ا رأیت یا عین الزمان کمثلہ؟ — من مصلح امثالھا و ظفیر

من کان اومن قد یکون کاحمد؟ — کلا و لن یأتوا لہ بنظیر

یا خاتم النبیاء یا خیر الوری — ارحم لمحروق الجوی مضرور

فلانت اکرم من و فی بذمامہ — و لانت ارحم من رثی لعقیر

انت الغیاث لکل من خشی الوری — و لکل مضطرب الفؤاد حصیر

انت المعاذ لکل من خاف العدی — و ملاذ کل مذلل مقسور

انت الامان لکل مظلوم الجفا — و معز ل کل مصغر مدحور

انت المغیث لکل محروم الاسی — و لفاقد الاعوان خیر ظھیر

انت الجواد بل انت قاموس الندی — انت العماد لمثقل موزور

انت النذیر لکل عاص قد طغا — انت البشیر لجاھل معذور

انت السداد لکل باب للھوی — انت الرشاد لتائہ مغرور

انت الانیس لمن توحش بالنوی — انت الجلیس لمفرد مکسور

انت الحبیب رجاء کل مؤمل — انت الطبیب لمبتلیً محصور

قد شق صدرا لبدر منك اشارۃ — بالفلقتین و انت خیر مشیر

انت الکریم ابن الکرام ذوی العلی — و لانت ذو نسب اضاء نمیر

انت الشفیع و انت خیر مشفع — یوم التناد و انت خیر صبیر

ان الذین یبایعونك انما — قد بایعوا اللہ بغیر نکور

و سوف یعطیك الالہ رضاك فی — یوم النشور باجمل التخییر

قصیدے کا اختتام شاعر کی خواہشات ومطالبات سے جڑا ہوا ہے، جس میں مولانا مرحوم ایک سچے مؤمن کی مانند اپنی ،اپنے والدین اور اپنے خاندان اور اپنے اہل وعیال کے لئے آپ ؐ کے حضور آپ کی صفاتِ عالیہ کے حوالے سے دست بدعا ہیں:

ھذا الفخار و لا فخار مثلہ — و اھا لہ علَما علی التوقیر

بابی فلا تك راضیا حتی تری — ان قد ظفرتُ بجنة و نھور

و کذاك آبائی و کل عشیرتی — و احبتی من اقرب و شطیر

بــابــى فـلا تـحـرم نوالك قـاصدا — يـرجـو رضــاك بـغيبة و حـضـور
بــابــى فــانك لـم تـخيـب سائلا — ابــدا و انــت كــزاخــر مسـجـور
ا حبيـب انك لـو رأيـت بـنـظـرة — حـالـى رثيـت لهـا و كنت عذيرى
مـولاى انك لـو مـننـت بـجـلـوة — لشـفيـت نـفسـى من جوى مستور
و صـعـقـت مـن رؤيـا جمالك بغتة — صـعـق الـكـلـيـم او ان دكّ الـطـور
مــا كــان ضـرك لـو مـننت فربمـا — مـن الـكـريـم عـلـى فتـى مهجور
يــا بــكــر آمنة الـكـريـمة انـنـى — قـد جـئـت عـنـدك مفضيا بشقورى
فــارحـم رعــاك الـلـه كربة عـاجز — دنف كـئيــب هــائـم متبـور
يــا رحــمة لـلـعـالـمـين غيـاثهـم — انـظــر الـى ظـفـر هـوى بقـعيـر
انـظــر فــلا احـد سـواك لـنــااذا — صـعـق الانـام بـنـقـرة الـنـاقـور
و انـصـر اذا حـضر الحمام و افردو — نـى فـى البقيـع لـمـنكـر و نكيـر
و اشفع اذا اقترب الحساب ولـم يكن — الا اليك نــجــاء كـل حسيـر
و الـلــه لا انســاك احـمـد كـلـمـا — لاح الـصبــاح بـطـلـعة الـفـاثـور
و الـلــه لا انســاك احـمـد كـلـمـا — راح الـحـجيـج الى مـنـى بـنـذور
كــلا و لا انســاك احـمـد كـلـمـا — فــاح الـنسيـم سُحيــرة بــعبيـر
كــلا و لا انســاك احـمـد كـلـمـا — نــاح الـحـمــام عـلـى النقـا بهدير
كــلا و لا انســاك احـمـد كـلـمـا — بــاح الـمـحـب بسـره المضمور
كــلا و أنســاك أحــمـد كـلـمــا — هــب الـصبــا بـعشية و بـكـور

اپنی التماس و درخواست کے ساتھ ساتھ محدثین کرام نیز حدیث سے متعلقہ خدمات انجام دینے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، جو ہندی لب ولہجہ میں ہونے کے باوجود اظہار بیان میں عربی کے مشہور شعراء فرزدق [۱] و جریر [۲] کے

---

(۱) ابوفراس ہمام بن غالب المعروف بہ فرزدق (۲۰-۱۱۴ھ/ ۶۴۱-۷۳۳ء) بصرہ میں پیدا ہوا۔ عہد بنی امیہ کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ جریر اس کا حریف تھا۔ دونوں کی مقابلہ آرائی نے شعر کی ایک نئی قسم ''نقائض'' کو جنم دیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: دیوان الفرزدق مع شرح استاد علی فاعور؛ دارالکتب العلمیہ، بیروت؛ طبع اول ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء؛ ص:۵-۸۔

(۲) جریر بن عطیۃ الخطفی (۳۳-۱۱۴ھ/ ۶۵۳-۷۳۳ء) یمامہ میں پیدا ہوا۔ شعر گوئی فطرت میں داخل تھی، جس نے فرزدق کے مقابل لا کھڑا کیا۔ فرزدق کی وفات کے چالیس یا اسی دن کے بعد انتقال کیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: شرح دیوانِ جریر؛ محمد اسماعیل عبداللہ الصاوی؛ دارالاندلس، بیروت؛ بدون تاریخ؛ ص:۳-۷۔

کلام سے کم نہیں ہے:

خیر الکلام کلام احمد بعد ما ۔۔۔ اوحی الالہ بنظمہ فی السور

طوبی لحفاظ الحدیث و مرحبا ۔۔۔ بالناظمین لدرہ المنثور

و الجامعین صحیحہ و سقیمہ ۔۔۔ و النابذین لمفتری بالزور

انی و ان کانت بهند نشأتی ۔۔۔ فالشعر شعر فرزدق و جریر

قصیدہ کا آخری حصہ دعاء ہوتا ہے، اسی کا اہتمام کرتے ہوئے اس قصیدہ کے آخری حصہ میں شاعر نے اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعاء کا نذرانہ اس طرح پیش کیا ہے، جن سے شاعر کے جذبات واحساسات اور باطنی کیفیات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

یا ربنا ارحمنا بحق نبینا ۔۔۔ و اغفر خطایا نا و کل اطیر

و تقبل الاعمال و ارض قصیدتی ۔۔۔ و اجبر بها یارب کل کسوری

و اکشف بها کربی وضع عنی بها ۔۔۔ وزری فانك رب خیر غفوری

یا رب فارزقنی الفلاح و نجنی ۔۔۔ یوم القیامة من عذاب سعیر

و اجعل لنا فی دار قربك منزلا ۔۔۔ حسنا و انك رب خیر قدیر

دعا کے ساتھ ہی مولا نا مولا نا مرحوم کا ذہن درود کی طرف منتقل ہوا اور وہ رسول اللہ ﷺ، ان کے اصحاب، اہل بیت، ائمہ کرام، فقہاء عظام، علمائے کرام کے ساتھ ساتھ اس میں اپنے اہل وعیال، اعزاء اقارب اور خود کو شامل کرتے ہوئے قصیدہ کا اختتام اس طرح کرتے ہیں:

یا رب صل علی النبی و آلہ ۔۔۔ بتحیة تربو میاہ بحور

و علی صحابتہ الکرام و اهلهم ۔۔۔ ما افترّت الأزهار بالباكور

و علی أئمتنا الذین تفقهوا ۔۔۔ فی الدین ما هب الصبا بد بور

و العالمین العاملین بعلمهم ۔۔۔ ما غنت الاطیار بین شجیر

و کذا علینا و العیال و اهلنا ۔۔۔ و الاقربین عدادقطر الضور

و علی احبتنا و من ادنی بنا ۔۔۔ و المؤمنین لیوم نفخ الصور

ثم الصلاة مع السلام علی الذی ۔۔۔ هو روح کل کبیرنا و صغیر

قد جئت عندك سيدی متوسلا   بجميل عفوك و الرجاء ظهيری

صلی عليك الله يا زين الوری   عون الخلائق جابراً لکسير

ما لاح نجم فی السماء و مابه   بدر يزيل حنادس الديجور

اس طرح قصیدہ کا اختتام ہوا، مولانا نے اس قصیدہ میں شاعرانہ فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، جو آپ کے حب نبیؐ کا مظہر ہے، اور اس سے آپ کی علمی بلندیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

نعتیہ قصائد کا جائزہ

مولانا کے تین نعتیہ قصائد، ہم نے پیش کیے۔ ان تینوں کے مطالعہ سے مشترکہ طور پر جو بات سامنے آئی وہ یہ کہ قرآن مجید اور اس کی اصطلاحات مولانا کے پیشِ نظر تھیں، حب رسول ﷺ میں انہوں نے جس سچی عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ اگر چہ قصیدہ کی ان بلندیوں کو نہ چھوتا ہو جو ماہرینِ قصیدہ نے قصیدہ کا معیار بنایا ہے، لیکن اس میں کوئی دورائے نہیں کہ یہ نعتیہ قصائد رسمیہ نہیں، بلکہ ان کا تعلق نعت حقیقی سے ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ''(نعت گو) نعت کو ایک ادبی صنفِ سخن کے تحت نہیں، بلکہ اس کے لوازماتِ فن اور صنفی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے گہرے شغف اور توجہ اور جذب وانہماک سے اسے ایک ادبی وفنی معیار عطا کرنے کی سنجیدہ کوشش کرتا ہے''۔[1] اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کی نعتوں میں کیفیات کا اظہار ایک عقیدہ اور رسم کے طور پر نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف گوشوں جیسے سیرت، تعلیمات، غزوات، معجزات، عادات، اور خصائل مبارکہ کا ذکر جزوی اور سرسری انداز کی بجائے گہری دل چسپی اور وابستگی سے ملتا ہے۔ نیز آں حضرتؐ سے محبت کے ضمن میں رسمی عقیدت کے بجائے جذب ومستی اور جوش ومحبت کا گہرا اور مؤثر اظہار موجود ہے، اسی وجہ سے یہ نعتیں دل کشی اور تاثیر سے بھرپور ہیں۔

یوں تو مولانا نے ان نعتیہ قصائد میں مختلف قسم کے بہت سے مضامین نظم کئے ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کے مضامین پر قرآنی فکر کے گہرے اثرات ہیں۔ انہوں نے قرآنی آیات کو سلیس، دل کش اور لطیف پیرائے میں نظم کر کے قرآنی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ ذیل میں اسی ضمن کی کچھ مثالیں قرآنی حوالوں سے پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ، مؤمنین سے مخاطب ہے: ﴿وجاهدوا في الله حق جهاده﴾[2] اس آیت میں لفظ ''جاہدوا'' امر کا صیغہ ہے، مولانا مرحوم نے اسی آیت میں ''جاهدوا'' کو فعلِ ماضی، جمع مذکر غائب کے صیغے کے ساتھ ''جاهَدوا'' بنا کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، کی زندگی کا عملی نمونہ بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے:

لقد جاهدوا في الله حق جهاده ☆ صَلَوا في لهيب الحرب ذات التسعر[3]

(۲) قرآن پاک نے انسانوں کی کامیابی اس میں مضمر رکھی ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں؛ ﴿ومن يعتصم بالله فقد هُدِيَ الى صراط مستقيم﴾[4] اس آیت کے ضمن میں مولانا نے اپنے خیال کو صحابۂ کرام

---

(۱) نعت (لغوی مفہوم)؛ ڈاکٹر ریاض مجید؛ نقوش، لاہور؛ رسول نمبر؛ جنوری ۸۴ء؛ ۱۰/۴۳۔

(۲) القرآن الکریم؛ ۲۲/۷۸۔

(۳) نورعلی نور/ص:۴۔

(۴) القرآن الکریم؛ ۳/۱۰۱۔

رضوان اللہ علیہم اجمعین، کے ہی تذکرے میں اس طرح نظم کیا ہے:

اولـئك خيـر الـنـاس بـعـد نبيهـم ☆ و مـن يعتصم بالله يسعد و يظفر (۱)

(۳) سورۂ آل عمران کی آیت ﴿و سـارعـوا الـى مغفرة من ربكم ﴾ (۲) کے ضمن میں مولانا نے جو شعر کہا ہے وہ نصیحت و تبلیغ کا بڑا دل کش پیرایہ لیے ہوئے ہے۔فرماتے ہیں:

اَلا فـاهـجـروا ما تنحتون و سارعوا الـى ربـكـم قبل العذاب المدمر (۳)

یقینی طور پر اللہ کی طرف نہ چلنے کا نتیجہ چونکہ ہلاکت وتباہی ہے، اسی لئے اس شعر میں مولانا انسانوں کو اس راہ پر چلنے کا مشورہ دیا ہے، جو تباہی و ہلاکت سے بچانے والی ہو اور وہ صرف اللہ سے مغفرت کا طلب گار ہو۔

(۴) کوہِ صفا پر حضورِ اکرم ﷺ کا قریش کے لوگوں کو جمع کر کے اپنی امانت و صداقت کی گواہی لینا، اور اس کے بعد اللہ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی دعوت دینا، اور بد بخت ابولہب کا رسول اکرم ﷺ کی شان مبارک میں نا زیبا کلمات کہنا، جو سورۂ لہب کے نازل ہونے کی وجہ بنا۔ان تمام واقعات کے پسِ منظر میں قرآن کریم کی آیت ﴿تبّت يَدا ابـى لهـبٍ و تـبّ ﴾ (۴) کو پیشِ نظر رکھ کر انہیں حالات کے تناظر میں مولانا نے صرف ایک شعر میں ابولہب کی بدبختی کو کس طرح سمویا ہے وہ لائق توجہ ہے:

و نـادى شـقـى الـقـوم تبا لمن دعا فتبـت يـداه فـى لهـيـب مسعر (۵)

(۵) نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ تعالی نے معراج کے سفر میں اپنی بے شمار نشانیاں دکھلائیں ،رات کے ایک حصہ میں اللہ تعالی نے اپنے اس مقرب ترین بندہ کو حرمِ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتوں آسمان اور سدرۃ المنتہی تک پہونچایا۔رسول اللہ ﷺ کے اس سفر مبارک کا تذکرہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں متفرق انداز میں مذکور ہے۔معراج کے تعلق سے مولانا نے اس قصیدہ میں جو اشعار کہے ہیں وہ بھی قرآنی الفاظ کا پرتو ہیں۔قرآن مجید میں ﴿سبـحـان الذى اسرى بعبده ليلا من المسجد الحرام الى المسجد الاقصى الذى با ركنا حوله لنريه من آياتنا ﴾ (۶) اسی طرح سورۂ نجم میں: ﴿ولقد رآه نزلة اخرى O عند سدرة المنتهى ﴾ (۷) واقعۂ معراج کے تعلق سے

(۱) نورعلی نور/ص:۵۔
(۲) القرآن الکریم:۳/۱۳۳۔
(۳) نورعلی نور/ص:۷۔
(۴) القرآن الکریم:۱۱۱/۱۔
(۵) نورعلی نور/ص:۸۔
(۶) القرآن الکریم:۱۷/۱۔
(۷) القرآن الکریم:۵۳/۱۳-۱۴۔

ملتی ہیں۔ مولانا نے اس سے متعلق مندرجہ ذیل شعر:

و یخترق السبع السماوات کلھا　　طباقا و یعلو مظھرا فوق مظھر [(۱)]

میں جہاں ایک طرف سفرِ معراج کی تصویر کشی کی ہے وہیں دوسری طرف اس کے الفاظ بھی قرآن کریم سے مستعار ہیں۔ جو اگرچہ معراج کے تناظر میں نہیں، بلکہ سات آسمانوں کی تخلیق کے پس منظر میں ہیں؛ ﴿ھو العزیز الغفور الذی خلق سبع سماوات طباقا﴾ اور؛ ﴿الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقا﴾ [(۲)] اسی سفرِ معراج کا تذکرہ مولانا کے دوسرے قصیدوں میں اس طرح بھی ملتا ہے:

قد خصک اللہ بالاسراء لیلۃ اذ　　ترقی السماوات من طبق الی طبق

حتی بلغت من العلیاء ذروتھا　　و غایۃ لم تدع شاوا لمستبق [(۳)]

(۶)　حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کے تذکرہ کے ساتھ ان کی ہلاکت وتباہی کی وضاحت کرتے ہوئے ان مجرمین کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فاصبحوا لایری الا مساکنھم . کذلک نجزی القوم المجرمین﴾ [(۴)] مولانا نے اس آیت مبارکہ سے استشہاد کرتے ہوئے غزوۂ بدر کے ضمن میں کفار مکہ کی شکست اور ان کے مقتولین کے انجام کی اس طرح تصویر کشی کی ہے:

فاصبحوا لا یری الا مساکنھم　☆　و ادخلوا فی سعیر دائم الحرق [(۵)]

(۷)　معجزۂ شق القمر، نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا وہ معجزہ ہے جسے اپنوں اور غیروں سبھی نے مشاہدہ کیا تھا۔ ہاتھ کی انگلی کے ایک اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا ایسا واقعہ تھا جو نہ اس سے پہلے ظہور پذیر ہوا تھا اور نہ ہی قیامت تک پھر کبھی ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس معجزہ کے حوالے سے کفارِ مکہ کو تنبیہ کرتے ہوئے اسے قیامت کی گھڑی سے تعبیر کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ﴿اقتربت الساعۃ و انشق القمر﴾ [(۶)] مولانا نے اس خیال کو اس طرح شعری جامہ عطا کیا:

---

(۱)　نور علی نور/ص:۹۔

(۲)　القرآن الکریم؛ ۶۷/۳، ۷۱/۱۵۔

(۳)　نور علی نور/ص:۱۲۔

(۴)　القرآن الکریم؛ ۴۶/۲۵۔

(۵)　نور علی نور/ص:۱۴۔

(۶)　القرآن الکریم؛ ۵۴/۱۔

قد انشق صدر البدر حبا لوجهه ☆ و طوبی لقلب بالهوی متفطر [1]

اور پھر نادر تشبیہ اور خوبصورت استعارہ کا یہ انداز بھی ملاحظہ فرمائیے:

باصبع من ید کانت اشارتها ☆ فی البدر انکی من الصمصام فی العنق [2]

(۸) حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے لاڈلے بیٹے کی جدائی کے غم میں روتے روتے بصارت کا زائل ہو جانا اور پھر اس بصارت کی واپسی کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کے ذریعہ اپنے والد کی خدمت میں کرتہ کا بھیجنا، جس کو ڈال کر انکی بینائی واپس آ گئی تھی۔ یہ واقعہ تفصیلی طور پر سورۂ یوسف میں موجود ہے۔ اس واقعہ کا ذکر اس سورہ کی آیت: ﴿فلما ان جاء البشیر القاه علی وجهه فارتد بصیرا﴾ [3] اس آیت کو پسِ منظر میں رکھ کر مولانا نے مندرجہ ذیل شعر میں رسول اللہ ﷺ کے تعلق سے اپنی مخصوص حالت کا ذکر کرتے ہوئے اس کو خالصۂ محبت کا رنگ دے دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

جاء البشیر فرد اللہ لی بصری　　لما اتی بقیص فائح عبق
فالحمد للہ ان لم یأتنی اجلی　　حتی لبست لباسا زاد کل تقی [4]

(۹) روزِ جزا میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہر مؤمن کی خواہش اور تمنا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑی دولت مؤمن کے لئے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ متاعِ دارین ہے۔ سورۂ دہر [5] میں ان حالات کا تذکرہ ہے، جب جنتی لوگ چاندی کے پیالے، جن میں ٹھنڈا پانی ہوگا، لئے پھر رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی بدولت ہی ممکن ہو سکے گا۔ مولانا کا اسی قصیدے میں مدحِ حاضر کا یہ شعر ان قرآنی آیات کے تناظر میں ملاحظہ فرمائیے:

و انت تسقی و لا ساق سواك لنا　　كأسا یطاف بماء باردغدق [6]

---

(۱) نور علی نور/ص: ۷۔
(۲) ایضاً/ص: ۱۱۔
(۳) القرآن الکریم: ۱۲/۹۶۔
(۴) نور علی نور/ص: ۱۶۔
(۵) القرآن الکریم: ۷۶/۱۵-۲۰۔
(۶) نور علی نور/ص: ۱۶۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ مولانا کوقرآن کریم کے مفاہیم ومطالب پر ہی عبور نہیں، بلکہ قرآنی مباحث والفاظ کو اشعار میں چسپاں کرنے میں بھی انہیں ملکہ حاصل تھا۔ ''نور علی نور'' کے جن اشعار کو ہم نے اوپر پیش کیا ہے وہ تو وہ مثالیں ہیں جو صراحۃً آیات قرآنیہ سے ماخوذ ہیں یا ان آیات سے ان اشعار کا انطباق کیا گیا ہے، ورنہ جہاں تک مفاہیم ومعانی کا تعلق ہے تو مولانا کے بیشتر اشعار قرآنی مفاہیم سے ہی مترشح ہیں۔

مولانا کے دوسرے مطبوعہ نعتیہ قصیدہ ''وسیلۃ الظفر'' کے اشعار کا بھی تقریباً یہی انداز ہے، اس قصیدے میں کل ۱۹۳ اشعار ہیں جن میں بیشتر قرآنی مفہوم کے حامل ہیں لیکن ہم یہاں صرف انہیں اشعار پر تبصرہ کرینگے جو واضح طور پر قرآنی آیات سے مستنبط ہیں۔

(۱) قرآن کریم کی آیت: ﴿فلما قضی موسی الاجل و سار باهله آنس من جانب الطور نارا ﴾[۱] سے استشہاد کرتے ہوئے مولانا نے اپنے قصیدہ کے مطلع ثانی میں تشبیب کا مندرجہ ذیل شعر کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے وہ لائقِ داد ہے:

هل لاح نجم فی مطالع صور ☆ ام اونست نار بجانب طور[۲]

اس قصیدہ کے ابتدائی چار اشعار میں (جو تشبیب سے متعلق ہیں) مولانا نے مدینہ منورہ کے قریب بسی ہوئی غیر معروف وادیوں اور پہاڑیوں مثلاً عقیق، صور، حاجر، بدر، حضیر، ضفیر وغیرہ کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مدینہ منورہ اور اس کے اطراف سے بھی بخوبی واقف تھے یہاں تک کہ انہیں ان پہاڑیوں اور وادیوں کے نام بھی معلوم تھے جو عام طور پر غیر متعارف تھیں۔

(۲) پریشانیاں اور آسانیاں لازم ملزوم ہیں۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿ان مع العسر یسرا ﴾[۳] مولانا اس آیت کو ناصحانہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

و اعلم بان الیسر توأمُ عسرة ☆ و ردیفها کالجود بعد الحرور[۴]

(۳) قرآن کریم نے مکہ مکرمہ کی قسم کھاتے ہوئے سورۂ بلد کی ابتداء اس طرح کی ہے: ﴿لا اقسم بهذا البلد . و انت حل بهذا البلد ﴾[۵] ان آیات کے تناظر میں مولانا نے مدینہ منورہ کے تعلق سے اپنے جذبات کو اس طرح

---

(۱) القرآن الکریم: ۲۸/۲۹۔
(۲) وسیلۃ الظفر/ص:۳۔
(۳) القرآن الکریم: ۹۴/۶۔
(۴) وسیلۃ الظفر/ص:۳۔
(۵) القرآن الکریم: ۹۰/۱-۲۔

نظم کیا ہے:

بـلـد یـحـل بـه الـمـطـیـب طیـب ☆ و بـه تـزول هـمـوم کل ضجور [۱]

رسول اکرم ﷺ اخلاقِ عالیہ کے جس منصب پر فائز تھے، ان سے دنیا کی کوئی دوسری ہستی نہیں پا سکتی۔ خود قرآن کریم میں مذکور ہے "انک لعلی خلق عظیم"۔ [۲] مولانا، رسول اللہ ﷺ کے اوصافِ کریمانہ واخلاقِ فاضلانہ کے متعلق اپنے مخلصانہ جذبات کو پیش کرتے ہیں تو اس میں ایک شعر آیتِ بالا کی تفسیر معلوم ہوتا ہے:

قـد کـان آیة ربـه فـی الـخـلـق و ☆ الـخـلـق العظیم ملاك كل امور [۳]

(۴) غزوۂ بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے تہی دست مؤمنین کی قلیل جماعت کو مشرکینِ مکہ کی مسلح فوج کے مقابلے میں جس کامیابی سے ہم کنار کیا تھا وہ بظاہر ایک عجیب انہونی سی بات تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کی سربلندی کے لئے فرشتوں کی جماعت مؤمنین کی مدد کے لئے بھیجی، جس سے کفار کے دلوں پر ہیبت طاری ہوگئی۔ اس واقعہ کے متعلق قرآن مجید میں سورۂ انفال کی آیت ﴿هو الذی ایدك بنصره و بالمؤمنین و الّف بین قلوبهم﴾ [۴] سے اشارۃً ذکر کیا گیا ہے ۔مولانا نے اسے شعری جامہ اس انداز سے پہنایا ہے:

جـاء الـمـلائـکـة الـکـرام لـنـصـره ☆ فـی یـوم بـالـعـلاء شهیـر
بـالـرعـب ایّـده الالـه و بـالصبا ☆ و تـالـف فـی جـنـده الـمنصور [۵]

(۵) معراج کے تذکرے میں اس قصیدے میں سورۂ طور کی آیت "و البیت المعمور" [۶] کو بھی شامل کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:

اسـری الالــه بـعـبـد ه لیـلا الـی ☆ البیـت الـذی سمّـاه بالمعمور [۷]

---

(۱) وسیلۃ الظفر/ص:۴۔
(۲) القرآن الکریم؛۶۸:۴۔
(۳) وسیلۃ الظفر/ص:۵۔
(۴) القرآن الکریم؛۸:۶۳-۶۴۔
(۵) وسیلۃ الظفر/ص:۶۔
(۶) القرآن الکریم؛۵۳:۳۔
(۷) وسیلۃ الظفر/ص:۷۔

(۶) رسولِ اکرم ﷺ کے کلام مبارک کے سلسلہ میں قرآن کریم میں آتا ہے ﴿و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی﴾ ان آیات کی ترجمانی اگرچہ مولانا رومی نے فارسی زبان میں ہو بہو کردی ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ☆ گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود (۱)

(انکی کہی ہوئی بات اللہ کی کہی ہوئی ہوتی ہے، اگرچہ بندہ کی زبان سے ہوتی ہے)

مولانا نے اپنے قصیدے میں درج بالا آیت کی تشریح اس انداز میں کی ہے:

حتـــی اذا اوحـــی الیـــه ربـــه ☆ مـن بعض ما اوحیٰ من المأمور (۲)

(۷) حضورِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور عیال کی پاکیزگی کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت و یطهرکم تطهیرا﴾ (۳) اسی مضمون کو مولانا نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

و اللــه طهـرهـم و اذهب رجسهم ☆ اهـل الـنبـی بـاحسن التطهیر (۴)

(۸) معجزۂ شق قمر کو مولانا نے اس قصیدے میں تھوڑی سی جدت کے ساتھ بیان کیا ہے جو کافی حد تک پہلے قصیدے کے اشعار سے مماثل ہے، لیکن ''اشارہ'' نے جدت پیدا کردی ہے:

قـد شـق صـدر البـدر مـنك اشـارة بـالـفِـلـقَـتیـن و انت خیر مشیر (۵)

(۹) گناہ گاروں کے قبر سے اٹھنے کا ہولناک تذکرہ کرتے ہوئے قرآن پاک نے ان کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اس طرح ہے ﴿خشعا ابصارهم یخرجون من الاجداث کانهم جراد منتشر﴾ (۶) اس آیت کے پہلے جزو کو مولانا نے منافقین مدینہ کیطرف اشارہ کرتے ہوئے کس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے یہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے، فرماتے ہیں:

یـلـقـون احـمـد خشعـا ابصـارهـم سـودا وجـوهـهـم كـلـون القیر (۷)

---

(۱) مثنوی رومی، مولانا جلال الدین رومی، مطبوعہ بریل (لیڈن) ۱۹۲۶ء ص ۱۱۸ شعر ۱۹۳۶
(۲) وسیلۃ الظفر/ص:۹۔
(۳) القرآن الکریم:۳۳:۳۳۔
(۴) وسیلۃ الظفر/ص:۱۱۔
(۵) ایضاً/ص:۱۳۔
(۶) القرآن الکریم:۵۴:۷۔
(۷) وسیلۃ الظفر/ص:۱۲۔

(۱۰) اسی طریقہ پر صلحِ حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرر ہے صحابۂ کرام کے بارے میں قرآن کہتا ہے ﴿ان الذین یبایعونك انما یبایعون الله ﴾ [۱] مولاناؒ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صحابۂ کرامؓ کی اس مقدس جماعت کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

ان الذین یبایعونك انما ☆ قدبایعوا الله بغیر نکور [۲]

ایسے ہی قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿و سوف یعطیك ربك فترضی ﴾ [۳] اس آیت کے تناظر میں مولانا کے اس شعر کو ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے دونوں میں کتنی مماثلت ہے:

و سوف یعطیك الاله رضاك فی ☆ یوم النشور باجمل التخییر [۴]

ان مثالوں سے یہ چیز وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی ہے کہ قرآنی مضامین ومباحث پر مولانا کی نظر کس قدر گہری تھی اور انہیں اپنی شاعری میں کتنے سلیقے سے برتتے تھے۔علاوہ ازیں مولانا نے قرآنی مفاہیم کو جس طرح اشعار کی زینت بنایا ہے، اس کی متعدد مثالیں ہیں، جن کا تذکرہ طوالت سے خالی نہیں ہوگا۔اسی طرح بہت سے اشعار میں مفاہیم احادیث کو سمونے کی قابلِ ذکر کوشش کی گئی ہے۔مولانا کے یہ قصائد بعض دوسری خصوصیات وامتیازات کے بھی حامل ہیں۔ان میں تاریخی واقعات کے علاوہ جغرافیائی معلومات بھی دی گئی ہیں۔

الغرض مولانا کی نعتیہ شاعری میں جہاں ایک طرف عشق ومحبت کا دریا موج زن ہے، وہیں علم وادب کی شناوری بھی مولانا نے کی ہے،اور اپنی شاعری کو قرآن کریم کے الفاظ سے صاف ستھرا بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اور اس میں انہوں نے شاعری کے فن کارانہ اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان قصائد کو قرآن وحدیث، تاریخ وادب،سوانح وسیرت مبارکہ کا علمی مرقع بنادیا جو بہر طور قابلِ داد ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عربی کے قادر الکلام ہندوستانی نعت گو شعراء میں سے ایک تھے، جو نعت گوئی میں یدِ طولی رکھتے تھے۔

---

(۱) القرآن الکریم:۴۸:۱۰۔

(۲) وسیلۃ الظفر/ص:۱۴۔

(۳) القرآن الکریم:۹۳:۵۔

(۴) وسیلۃ الظفر/ص:۱۴۔

فصلِ دوم: عمومی قصائد

مولانا ظفر احمد صاحب نے عربی زبان میں تحقیق وتجزیہ کے ساتھ ساتھ شعر وادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ نعت گوئی میں ہم انکے مقام کو گذشتہ صفحات میں واضح کر چکے ہیں۔ یہاں ان کے ان چند قصائد کا تذکرہ مقصود ہے جن میں شخصیات کو موضوعِ سخن بنایا گیا، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے شخصیات سے متأثر ہو کر جو کچھ تعریف وتوصیف کی، اس میں بھی انہوں نے نعتِ نبی کو پیش نظر رکھا۔ وہ کسی شخصیت کے اوصاف کو ذکر کرتے ہوئے ممدوحِ حقیقی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے اخلاقِ عالیہ کا تذکرہ اتنا برمحل کرتے ہیں کہ وہ شعری ضرورت معلوم ہونے لگتا ہے، اور ان کے ذوقِ نعت گوئی کی تسکین بھی ہو جاتی ہے۔ ذیل میں کچھ ایسے قصائد کا بطورِ مثال تجزیہ کیا جاتا ہے۔

قصیدہ:-

۱۳۲۸ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم، سہارنپور میں (جہاں مولانا نے کچھ دن پہلے ہی تدریسی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں) وہاں ریاست خیرپور (سندھ) کے وزیرِ اعظم آنریبل نواب صادق علی، اپنے ساتھیوں شیخ ممتاز علی اور مولانا مشتاق احمد صاحب کے ہمراہ مدرسہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تو اس موقع پر ان حضرات کے استقبال کے لئے ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں مولانا ظفر نے وزیرِ اعظم موصوف اور دیگر رفقاء کی شان میں ایک عربی قصیدہ پیش فرمایا۔(۱)

اس قصیدے میں ہمیں غزل کی چاشنی بھی ملتی ہے، اور نعت کی جاذبیت بھی، مدح سرائی کے طریقے بھی معلوم ہوتے ہیں اور حسنِ طلب بھی، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ قصیدہ اپنی بنیاد پر قائم ہے۔ حسبِ دستور اس کی ابتداء تشبیب سے ہوتی ہے، اور ابتدائی چار اشعار خالصۃً غزل کا رنگ لئے ہوئے ہیں، جو ممدوح کی مدح کی تمہید کا بھی حق ادا کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

جُلِيتُ حياة العاشقين نوار	فتلألأ بوميضها الاسحار
ان اسفرت عن وجهها و تبخترت	ازرى الغصون قوامها الخطار
و اذا تجلت للانام بحسنها	شخصت لرؤية وجهها الابصار

(۱) روداد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور ۱۹۲۹ء۔

و اذا رنت اسرت فیالعیونها ترمی القلوب و ما لها اوتار

اس مجازی مدح سے شاعر کا ذہن مدحِ حقیقی (رسول اکرم ﷺ کی مدح) کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، اور وہ اپنے ذہن کو حبِ رسول ﷺ سے سرشار محسوس کرتے ہوئے مدحِ نبوی کی طرف گریز کرتے ہیں، جس کا اظہار آپ نے اس انداز سے کیا ہے:

قد کنت احسب مذ ولدت بانها لم تأت قط بمثلها الاقدار

لکنني لما انتهیت الی الذی ظلم الزمان بوجهه انوار

ایقنت ان الغیب لله الذی ما فی خزائن علمه اضمار

بشری فقد عاد الزمان بخیره و الشر کان لجیشه الادبار

مدحِ نبوی کے اظہار کے بعد نواب صادق علی اور ان کے ساتھیوں کی مدرسہ آمد پر خوشی و مسرت کا اظہار، اور ان کے اوصاف جود و سخا، لطف و عنایات کی طرف اشارے کے ساتھ ساتھ ان کی آمد سے مدرسہ کی فضاؤں پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

جاء الامیر ففاحت الازهار و تعطرت لشمیمه الاقطار

لبست ریاض العلم ثوب بهائها و تغردت طربابها الاطیار

و بدت تسر الناظرین رواؤها و تفتقت بثناء ها النوار

یدعی بصادق العلی فانه شهدت بصدق فعاله الاخیار

لو لاح طلعته المنیرة فی الدجی لتلت نشید ثناء ہ الاقمار

او ان رأته الساجعات ترنمت نعم الامیر و نعمت الانصار

طوبی لمدرسة اضاء ربوعها بسناء ها فاحاطها الانوار

اهلا و سهلا بالوزیر و مرحبا عطرت لطیب قدومه الامصار

قصیدہ کا ایک حصہ طلب پر مبنی ہے، جس کا دوسرا نام مدعا ہے۔ یہ حاصل قصیدہ کہلاتا ہے، مدرسہ کی ضروریات کی طرف توجہ دلانے کے لئے وزیرِ اعظم کی سخاوت، لطف و عنایات اور غرباء پروری کے اوصاف کا تذکرہ کرکے اشارۃً یوں تذکرہ کیا گیا ہے:

یا من سقی تلك الدیار وزانها زینت بقصة جودك الاسمار

زاد الالــــه ســنــاء و جهك انـــه	قــضيــت لـغـرة و جهك الاوطـار
شــرفــت مـدرسة تـلـوح كـانـمـا	لـلـنــاس فــى ليـل الـجهـالة نـار
لا زلــت مبتهـج الـفـؤاد و لـم تـزل	تسـقــى الـعـلـوم غيـوثك الـمدرار

آخری دو اشعار دعاء سے متعلق ہیں، جن پر قصیدہ ختم کر دیا گیا ہے:

و وقيت عـن ريب الزمان و لـم تزل	تتـلــى لشـكــر صـنيـعك الاشعـار
اقــصــر ظـريف عـن الاطـالة انـه	يـكـفــى الـقـليـل و يكـره الاكـثـار

شیخ الحدیث حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی اپنی ہاتھ سے لکھی ہوئی عربی نظم

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی ایک نظم ان کی تحریر میں ہمیں موصول ہوئی ہے۔[1] اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ ابوظبی کے موجودہ سلطان شیخ زائد (جو اس وقت غالبا قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز رہے ہوں گے) مولانا کے مدرسہ ٹنڈو الہیار میں تشریف لے گئے ہوں گے، جہاں ان کے استقبال میں مولانا نے یہ عربی نظم پڑھی، لیکن یہ واقعہ کب ہوا؟ اس کے متعلق کوئی حتمی رائے تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں قائم کی جاسکی۔ بہرحال یہ قصیدہ پیشِ خدمت ہے:

أهلا وسهلا بزين الحل والحرم - يهتز منه رياح الجود والكرم

أكرم به من فقيه عظيم القدر ذي رتب - قد زانه ربه بالعلم والحكم

قاضي القضاة أمين في القضاء بما - جاء الرسول به من بارئ النسم

وأيد الله سلطانا أصفاه به - نهج العدالة في دار نزح من الظلم

خير البلاد أبوظبي ببهجتها - بنعمة الملك المدرار بالنعم

هو ابن لقوم غدا في ظله أمته - يعيش باليمن والإيمان والسلم

وأرحالهم من مليك ماجد بطل - رحبا به في سبيل الله ذو همم

يا زائدا أجزاك الله مكرمة - وخصك الله بالنعماء كالديم

زين الملوك عزيز في عيونهم - معظم في قلوب العرب والعجم

ثم الصلاة على من لا مثال له - في الناس أفضل خلق الله كلهم

---

(۱) بہ شکریہ:- ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب، ڈائرکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کی اپنی ہاتھ سے لکھی ہوئی عربی نظم

اهـلا و سهـلا بـزيـن الحل و الحرم — تهـب مـنــه ريــاح الـجـود و الكرم

اكــرم بــه، مــن فــقيــه عــابد ورع — قـد زانــه ربــه بــالـعـلـم و الحكم

قـاضـى القضاة امين فى القضاء بما — جـاء الـرسـول بـه مـن بادئ النسم

و ايـد الـلـه سـلـطـانـا اضـاء بـه — نهـج الـعـدالة فـى داج مـن الـظلم

خيـر البـلاد ابـو ظبى لبهـجتهـا — بـنـعـمة الـمـلك الـمـدرار بـالـنعم

طـوبـى لـقـوم غـدا فـى ظل رأفتـه — يـعيـش بـاليـمن و الايمان و السلَم

و اهـا لـه مـن مـليك مـاجد بطل — مـجـاهـد فـى سبيـل الله ذو همم

يـا زائـرا فـجزاك الـلـه مـكـرمة — و خـصك الـلـه بـالـنعماء كالديم

زيـن الـمـلـوك عـزيـز فـى عيونهم — مـعـظـم فـى قلوب العرب و العجم

ثـم الـصـلا ة عـلـى من لا مثـال لـه — فـى الـنـاس افـضـل خلق الله كلهم

مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کے سفرِ حجاز پر کہا گیا قصیدہ

مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ رحمۃ اللہ علیہ (صفر ۱۲۶۹ھ/ دسمبر ۱۸۵۲ء - ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ) مولانا ظفر صاحب کے مرشد و مربی تھے۔ ''بذل المجہود فی شرح ابی داوٗد'' ان کی مشہور معروف تالیف ہے۔ ۱۳۳۳ھ میں جب سفرِ حجاز کے لئے تشریف لے گئے تو عام اندازہ یہی تھا کہ وہ ہجرت کر گئے ہیں۔ جس کا تاثر مولانا کے پیش آمدہ قصیدہ سے بھی ملتا ہے۔ لیکن مولانا خلیل احمد صاحب کا یہ سفرِ حج کے بعد پورا ہوا اور پھر غالباً ۳۴ھ میں واپس تشریف لے آئے۔ (۱)

اپنے شیخ طریقت کے اس سفرِ حج کے موقع پر مولانا ظفر احمد صاحب نے ایک عربی قصیدہ مدرسہ مظاہر العلوم، سہارنپور کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۴/ جمادی الاول ۱۳۳۴ھ (۱۹/ مارچ ۱۹۱۶ء) میں پیش کیا، (۲) اس قصیدہ میں مولانا نے اپنے مرشد مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی وقتی جدائی پر اپنی بے صبری، بے چینی اور جذباتی کیفیت کو اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر عاشقانہ انداز سے پیش کیا ہے، ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

یقولون لی صبرا غداۃ رحیل — فکیف اصطباری و الرحیل مزیلی

سقتنی سلیمی کأس خمر و غادرت — اهیم بوادی الحب غیر عقیل

اری تارۃ خلفی و انظر تارۃ — امامی و زادت حسرتی و نحولی

اسائل هذا ثم هذا و اتقی — لسماع کلام مشعر برحیل

لقد حملتنی منیۃ القلب بعدها — بحمل عظیم لا یُطاق ثقیل

ہجر و فراق کے اسی طرز کو جاری رکھتے ہوئے اس کو اپنی ہلاکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ شیخ کی جدائی کتنا مشکل مرحلہ ہے، اس کا اندازہ درجِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

الم تر ان الهجر یقتل صبّها — الم تر ضعفی و رقتی و ذبولی

فلما تبینت الزمان کأنه — بسیف رقیق الشفرتین صقیل

یقطع اوصال الوصال مفجعا — بطول بعادٍ بعد طول وصول

تکدرت الدنیا بعینی و لم یطب — لی العیش الا فی بکا و عویل

---

(۱) تذکرۃ الخلیل سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا خلیل احمد صاحب شوال ۱۳۳۳ھ میں پانچویں سفرِ حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، اور کچھ ماہ بعد واپس تشریف لائے تھے۔ ملاحظہ کیجئے: ''تذکرۃ الخلیل/ مولانا عاشق الٰہی بلند شہری/ مطبوعہ: اشاعت العلوم، سہارنپور، بدون تاریخ؛ ص: ۲۷۳۔

(۲) روداد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور، ۱۳۳۴ھ/ ص: ۲۲-۲۳۔

اس کے بعد وہ مخاطب سے فرماتے ہیں کہ حب خلیل پر مجھے ملامت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، کیوں کہ میرے دل سے ان کی محبت نکل نہیں سکتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ ہر بیمار دل کی شفا بن گئے ہیں، اور انکے چہرے پر ایک مخصوص قسم کا نور چمکنے لگا ہے:

تلوم علی حب الخلیل و لم یکن　　لیسلو قلبی عن وداد خلیل

فدته نفوس العاشقین فانه　　لعمری شفاء کل قلب علیل

تراه اذا ما جئته متهللا　　بنور من اللہ العظیم جلیل

اسی وجہ سے مولانا ان ملامت کرنے والوں کو جنہوں نے اب تک مولانا کی زیارت نہیں کی یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ ان کی زیارت کر کے دیکھنے سے ہی ان کے نور کا اندازہ ہو سکے گا، جب ان کے باجمال چہرے پر نظر پڑے گی تو ملامت کرنے والے ان کے جمال کو دیکھ کر اللہ کی بڑائی کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور ان کی محبت خود بہ خود دلوں میں گھر کر جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ محبت انسان کے لئے قاتل ہے، لیکن اگر محبت سچی ہو تو عاشق اور معشوق دونوں کے لئے باعثِ برکت ہے۔ اسی کے ساتھ مولانا اس کیفیت کا اظہار بھی کر رہے ہیں کہ سہارنپور سے مولانا خلیل احمد صاحب کی عدم موجودگی کے سبب یہ شہر صحرا اور بیابان میں تبدیل ہو جاتا ہے:

ا یعذلنی من لم یشف بعد وجهه　　و لن یجدوا حقا له بمثیل

فلو لاح من بعد محیا جماله　　لکبّر للّٰه الجلیل عذولی

یقولون ان الحب قتالة الفتی　　و طوبی لصب فی الغرام قتیل

کأن سهارنبور ما فیه واحد　　اذا لم یکن فیه جمال خلیل

مولانا نے اپنی اس عاشقانہ کیفیت کو حب نبیؐ کی طرف موڑ کر اس قصیدہ کو نعت کا رنگ دے دیا ہے، اس کا اظہار لفظ ''ینبوع'' سے کیا گیا ہے، جسے مولانا نے اس قصیدہ میں ذو معنیین استعمال کیا ہے۔ ''ینبوع'' مدینہ منورہ کے قریب ایک بستی کا بھی نام ہے اور اس کا لغوی مفہوم چشمہ، ندی، بہت پانی والا نالہ کے لئے بھی لیا جاتا ہے:

فیا لیت امی لم تلدنی او اننی　　شفیت بینبوع الوصال غلیلی

تری هل یعود الشمل بعد تفرق　　مشتت قلب المستهام طویل

دعته دواعی الشوق من حب احمد　　فاضحی بخیر الارض خیر نزیل

چوں کہ مولانا خلیل احمد صاحب کا سفرِ مدینہ منورہ حضورِ اکرم ﷺ سے قلبی محبت و عشقِ حقیقی کا عملی اظہار تھا،

اسی وجہ سے شاعر کا خیال بھی رسول اکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف کی طرف منتقل ہوگیا۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ جب تمام جہانوں کے لئے ہادی بن کر تشریف لائے تو آپ کی یہ آمد طلوعِ آفتاب و ماہتاب سے بڑھ کر تھی۔ اور پھر ایسی روشن دلیل (قرآن) کے ساتھ تشریف لائے کہ جس کی نظیر تا قیامت پیش نہیں کی جاسکتی، جس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی ہر ہر بات سچی ہے، کیوں کہ قرآن کریم خود آپ کا مؤید ہے:

نبی اتی للعالمین هداية	بوجه يفوق النبيرين جميل
اتانا بنور اعجز الناس مثله	فلا يسمع الدعوى بغير دليل
فامسٰى كتاب الله ردءاً مصدقا	لقول رسول الله خير رسول

ایسے صادق و سچے رسولؐ جو کہ نسبی و نسلی شرافت کے بھی حامل تھے اور ان کا قبیلہ اپنی شرافت و کرامت کے اعتبار سے عرب کا معزز ترین قبیلہ تھا، ان پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو کسی عاشق کو وصالِ محبوب نصیب نہیں ہوسکتا تھا:

فاكرم به من طاهر الاصل ماجد	من اشرف بيت من اعز قبيل
بنفسي و روحي المصطفى سيد الورى	ابو القاسم الهادى لخير سبيل
فلو لم يكن لم يعرف الله واحد	ولم يُحظَ مشتاق بوصل خليل

آخری شعر میں سلام و درود پر قصیدہ تمام ہوا:

عليه سلام الله ما رام عاشق ☆ وصال حبيب او ذهاب تليل

قصیدہ قبرستانِ عشق بازاں

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۱۳۴۴ھ میں ایک قطعہ اراضی اپنی مملوکہ زمین سے اپنے قصبہ تھانہ بھون میں قبرستان کیلئے وقف کیا تھا، جس کے متعلق مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ قصیدہ کہا۔ اگر چہ یہ قصیدہ بہت مختصر ہے، لیکن پند و نصائح اور موعظت و نصیحت کو بہت ہی اچھے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ قصیدہ دس اشعار پر مشتمل ہے۔[1]

ابتدائی اشعار میں قبرستان کے تعلق سے موت کی یاد دلاتے ہوئے مولانا نے بڑے ہی ناصحانہ انداز میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کے فنا ہونے کے فلسفہ کو بہت مؤثر طریقہ سے پیش کیا ہے:

یا غافلا بلذة عيش معجل	ابصر فتلك عم قليل تدمر
كل امرئ يريد بقاه و انما	و الله ان ذاك خيال يصور
لايمكن القرار بارض اساسها	ماء يموج ثم بناء يدور

دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ باقی رہنے والی چیزیں انسان کے اعمال ہیں، اور وہ تعلق مع اللہ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ذاتِ حق کی تلاش میں فنا ہونے کے بعد ہی اللہ کی مشیت (رضا) حاصل ہوتی ہے، اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

فاعلم ، هُدِيْتَ، ليس بقاء الحادث	الا بان يكون مع الله يذكر
من كان طالبا لرضاه و فانيا	فى ذاته فذاك مدى الدهر يظهر
هذا له البقاء و لكن مثله	يا صاح فى الزمان قليل و اندر

خانقاہیں انسانوں کی روحانی تربیت کا مرکز ہوتی ہیں۔ ان میں انسان روحانی سکون محسوس کرتا ہے، اور اس کے لئے حق کو تلاش کرنا آسان ہوتا ہے۔ دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت ان خانقاہوں کا مقصد ہے، اور چوں کہ قبرستان آخرت تک پہونچنے کا ذریعہ ہے، انہیں سب کی طرف اشارہ مندرجہ ذیل اشعار میں موجود ہے:

فاطلبهم ، فديتك ، حيا و ميتا	فى الخانقاه ثم بذى الدار تنفر
هذا المقام فيه نعيم برحمة	من ضمه التراب فذاك المطهر
من شاء ان يبيت بروضات جنة	فلياته فذالك روض معطر

---

(۱) ملاحظہ کیجئے: ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون، شوال المکرم ۱۳۴۴ھ/ص: ۲۱۔

آخری شعر میں مولانا نے مدینۃ الرسولؐ (مدینہ منورہ) اور روضۂ اطہر کی طرف بہت بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے ''اشرف المقابر نجم منور'' سے جہاں ایک طرف روضۂ نبوی، علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم، کی طرف اشارہ ہے، وہیں اس سے قلعۂ اراضی کے وقف کرنے کے ہجری سال (۱۳۴۴ھ) کی تخریج کر کے اسے ذو معنیین بنا دیا گیا ہے:

ان يسألوك اين رياحين طيبة　　　قل " اشرف المقابر نجم منور"

۱۳۴۴ھ

مولانا اشرف علی کی شان میں کہے گئے کچھ اشعار

مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ظفر احمد صاحب کے حقیقی ماموں تو تھے ہی، ان کے حقیقی مربی، پیرومرشد اور امامِ طریقت بھی تھے۔ غرضیکہ شریعت وطریقت اور تصوف وسلوک کی تمام منازل آپ نے مولانا اشرف علی صاحبؒ کی نگرانی میں طے کی تھیں، اور آپ کی تمام تر تصنیفی وتالیفی کاوشیں انہیں کی خصوصی عنایات کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ آپ نے اعلاء السنن جلد سوم کے ابتدائی صفحات میں مولانا اشرف علی صاحبؒ کے تذکرہ کے ساتھ چند اشعار بھی کہے ہیں۔ (۱)

مولانا اشرف علی صاحبؒ نے مخلوقِ خداوندی کو اپنی ذات سے جو فیض پہونچایا اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

روی الأنام بفیضه وأظلهم ☆ من نوره ظل بغیر حرور

بحر الندی قطب الرشاد مجدد ☆ و حکیم أمة احمد المنصور

اشرف علی المقتدی بفعاله ☆ غوث البریة کل یوم ثبور

اس کے بعد مولانا نے اپنے نعتیہ قصیدہ ''وسیلۃ الظفر'' کے مندرجہ ذیل دو اشعار کو موقع ومحل کی مناسبت سے اس طرح چسپاں کیا ہے:

منه الحیاة لکل حق میت ☆ منه الممات لکل قول زور

منه البیاض لکل قلب أسود ☆ منه السوادلکل عین ضریر

آخری شعر سے دعاء کا اظہار بھی ہے اور مولانا کی ان کوششوں کو خراجِ عقیدت بھی ہے جو انہوں نے زبون حال ملت کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کے لئے وقتاً فوقتاً کیں:

لا زال فی کنف الاله و لم یزل ☆ عون الخلائق جابر المکسور

اس طریقہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا نے ہندوستان میں بسنے اور یہاں کے ماحول میں رہنے سہنے کے باوجود وقتاً فوقتاً اپنی عربی شاعری سے سامعین کو بھی محظوظ کیا اور قارئین وناظرین کو بھی لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کیے۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا نے خاصی تعداد میں عربی قصائد کہے ہوں گے، جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہیں

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: ''اعلاء السنن''/مطبوعہ: کراچی ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء/ج:۳/ص:۳۔

رہ سکے۔ جو قصائد مطبوعہ شکل میں محفوظ رہ گئے وہ بھی اب پوری طرح دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم کچھ ہی قصائد ہیں جو ہمیں مختلف منتشر اوراق میں تلاش بسیار کے بعد ملے، جن کو ہم نے اپنی طالب علمانہ تحریر کا جزو بنایا۔ اس لئے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ کام ''حرفِ آخر'' نہیں ہے۔ علاوہ ازیں کچھ منظوم تقاریظ اور مراثی بھی ہیں، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

تیسری فصل: مولانا ظفر احمد کے مراثی

مرثیہ آہ و بکا اور ذکر محاسن و مآثر کا نام ہے، مراثی کا اطلاق ان اشعار پر ہوتا ہے جن سے غم وحزن کا اظہار ہو۔[1] یہ عربی ادب کی اولین اصناف سخن میں سے ایک ہے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ "عربوں کے یہاں مرثیہ گوئی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ ان کی شاعری"۔[2] زمانہ جاہلیت کی مرثیہ شاعری کے نمونے آج بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ وہ اس صنف کے ذریعہ مردہ شخص کے اوصاف کو فخریہ انداز میں پیش کر کے اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔[3]

قدیم زمانے سے لے کر آج تک دنیا کے ہر ادب میں اس صنف کے نمونے موجود ہیں۔ عربی ادب کا یہ پہلو اس قدر مالا مال ہے کہ دوسری زبانیں اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ عرب شعراء نے مرثیہ گوئی کو فن کا درجہ دے کر زندۂ و جاوید بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ جاہلی دور سے عہدِ جدید تک کے شعراء نے اپنے متعلقین، احباء، اقرباء، قومی سربراہان، ملی قائدین، روحانی پیشوا، علماء، صلحاء، ادباء اور دانشوروں کے مراثی اپنے اپنے انداز سے کہے ہیں۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے ادبی ذوق کی تسکین کی خاطر دیگر اصنافِ سخن کی طرح مراثی میں بھی اپنے اعلی تخیل اور افکار کی بلندی کے ذریعہ اپنی جذباتی کیفیت کا اظہار خالص شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ مولانا کے جو مراثی دستیاب ہوئے ہیں، ان میں مولانا کی جذباتی کیفیات کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے، اسی کے ساتھ ان میں یقین علی اللہ، مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنے کے علاوہ فکر کی بلندی خصوصی اوصاف ہیں۔

وہ اپنے ممدوح (مرنے والے) کے فاضلانہ اخلاق اور اوصاف عالیہ کو اس طریقہ پر ابھارتے ہیں کہ سامع محظوظ بھی ہوتا ہے اور ان اخلاق کو اپنے اندر سمو لینے کے متعلق غور وفکر کرنے لگتا ہے، جس کے باعث یہ مراثی تبلیغ وترغیب کا ایک مؤثر آلہ بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان کی مرثیہ گوئی، شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ حزن وملال کی بہترین عکاسی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی برجستگی، تشبیہات کی عمدگی، اور اشعار کی نغمگی بھی یہاں پر پورے طور سے موجود ہے۔

وہ مراثی میں مراتب کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً جب اپنے پیرومرشد کا مرثیہ کہتے ہیں تو ان کا انداز کچھ اور ہوتا ہے، اور جب اپنی اہلیہ کا مرثیہ کہتے ہیں تو ان کے جذبات دوسرے انداز کے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جب وہ اپنی لختِ

---

(۱) مصباح اللغات (عربی، اردو)/ص:۲۷۹۔

(۲) دائرۂ معارف اسلامیہ، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء/ج:۲۰/ص:۳۹۰۔

(۳) تاریخ الادب العربی/عمر فروخ/دار العلم، بیروت: طبع پنجم، ۱۹۸۴ء/ج:۱/ص:۸۳۔

جگر لاڈلی بیٹی کا مرثیہ کہتے ہیں تو ان کی جذباتی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے، اظہارِ رنج وغم تو سبھی مراثی سے ظاہر ہے، لیکن ان میں خوبصورت نصیحتیں بھی ہیں۔ اور موت کی زندۂ جاوید حقیقتیں بھی۔ ذیل میں مولانا کے مراثی کا قدرے تفصیل سے لیا گیا جائزہ ہمارے اس اندازے کو بہت حد تک واضح کرسکتا ہے۔ اور ان مراثی کی معنویت کو اجاگر کرنے میں معاون بھی۔

مرثیہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی

مولانا ظفر احمد صاحب، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے براہِ راست شاگرد نہیں تھے، لیکن چوں کہ ان کے مرشد و مربی (مولانا اشرف علی تھانویؒ) ان کے شاگرد تھے، اس لئے یک گونہ تعلق شاگردی کا بھی تھا۔ دوسرے یہ کہ شریعت وطریقت میں شیخ الہند کا جو مقام تھا وہ مشہور و معروف ہے۔ اس مرثیہ میں شیخ الہند کے اسی مقام کو بھی واضح انداز سے بیان کیا گیا ہے، اوران کے علمی کمالات وعملی اجتہادات کا بھی بھرپور تذکرہ کیا گیا ہے ۔اس سے جہاں شیخ الہند کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں شیخ الہند کے تئیں مولانا کے قلبی تعلق کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ مرثیہ سلاست وروانی کا بہترین نمونہ ہے۔ الفاظ کا انتخاب نہایت مناسب طریقہ سے کیا گیا ہے، کہیں کہیں مبالغہ آرائی کا احساس ہوتا ہے، لیکن مولانا نے حقائق کا ہی اظہار کیا ہے۔ اس مرثیہ میں مرنے والے (شیخ الہند) کی ذات پر غم کے تذکرے سے کہیں زیادہ ان کے اوصاف کا تذکرہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ جذبات حقیقت پر محمول ہیں کیوں کہ مرنے والے پر غم وافسوس اور ماتم وگریہ زاری کرنا اہلِ علم کا شیوہ نہیں، بلکہ اس کی خوبیوں پر سامعین وقارئین کو متوجہ کرنا ہے۔ یہی کام مولانا نے اس مرثیہ میں کیا ہے۔

شیخ الہند کی وفات نومبر ۱۹۲۰ء/ ۱۳۳۹ء میں ہوئی۔ مولانا نے یہ مرثیہ اسی دور میں لکھا جو بائیس اشعار پر مشتمل ہے۔[۱]

قصیدہ کی ابتداء حزنیہ اشعار سے ہوتی ہے۔ شیخ الہند کی جدائی کا غم ایسا غم ہے، جس کی وجہ سے طبیعت کو قرار نہیں آ رہا ہے، اور آسمان بدلا بدلا معلوم ہو رہا ہے، اور دل پارہ پارہ ہوا جا رہا ہے۔ یہ غم ایسا غم ہے جس نے پورے وجود کو جلا کر رکھ دیا ہے:

حزن بقلبي ام لظى نيران ‌ ‌ ‌ قد احرقت حتى كاني الفاني

كيف القرار و قد تبدلت السماء ‌ ‌ ‌ لا فول بدر تم في اللمعان

كيف الحياة و قد تفتت مهجتي ‌ ‌ ‌ برحيل شيخ عارف رباني

وہ ایک ایسے عالمِ دین تھے جو اپنے وقت کے پیشوا، ہدایت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز، فیوض کے سرچشمہ، سخاوت کے دریا، ولایت اور تقویٰ کے آفتاب، مخلوق کے فریادرس، عرفان میں کامل، طالبین کو سیراب کرنے والے دریا، رنج وغم کی تاریکیوں کو دور کرنے والے، ہدایت کی بارشیں برسانے والے بادل کی مانند سب کی پیاس بجھانے والے، علوم ومعارف

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون، ۱۳۳۹ھ/ص:۱۹۔

کے بلند مرتبہ پر فائز تھے ان میں ایسے اوصاف تھے جو بیان سے باہر ہیں:

مولای محمود الانام المقتدی قطب الهداية منبع الفيضان
بحر الندى شمس الولاية و التقى غوث البرية كامل العرفان
بحر يروى الطالبين بفيضه شمس تزيل حنادس الاحزان
أو مزنة جادت بأمطار الهدى تشفى الغليل بضيفها الهتان
رب المحامد و المعارف و العلى و فضائل جلت عن التبيان

یہ خصوصیات تو ان میں طریقت اور رشد وہدایت کی وجہ سے تھیں۔ جہاں تک ان کی علمی حیثیت کا تعلق ہے وہ علوم کا خزانہ تھے، محدث، مفسر، متکلم اور قرآن پاک کے مترجم تھے، فقہ اور علم معقولات (منطق وکلام) کے ماہر تھے۔ اور علم حدیث میں تو کوئی اس دور میں ان کا ثانی ہی نہیں تھا۔ بس یہ کہا جاسکتا ہے وہ اپنے دور کے بیہقی اور سعید بن قطان جیسے محدثین کے مشابہ تھے۔ افسوس کہ ان کے جانے کے بعد ہندوستان میں حدیث کا کوئی ماہر نہیں رہا:

كنز العلوم ، محدث و مفسر متكلم ومترجم القرآن
متبحر فى الفقه و المعقول فى علم الحديث هو العديم الثانى
فرد الزمان و بيهقى أوانه و مماثل بن سعيدن القطان
وا حسرتا من للحديث و اهله من بعده فى ارض هندوستان

اور جہاں تک ان کی عملی زندگی کا معاملہ ہے، اس سے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ وہ اللہ کے شیر، اس کے عاشق اور محبوب تھے۔ شریعت کے حامی اور سچے صابر تھے۔ انہوں نے بے انتہاء مصائب اور سختیوں کا مقابلہ کیا۔ زمانہ نے انہیں برا بھلا بھی کہا، لیکن وہ حق کے راستہ پر گامزن رہے۔ ان کے یہی اوصاف تھے کہ جب وہ دانشوروں کے درمیان آتے تھے تو ان سب کے دل فرشِ راہ بن جاتے تھے۔ اور ان کے جمال سے تمام لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنی باتوں سے عقیدت مندوں کو اس طرح مطمئن کرتے کہ گویا کہ پیاسا شخص آبِ حیات کے چشمہ پر پہونچ گیا ہو۔

اسد الاله محبه و حبيبه حامى الشريعت صابر حقانى
قاسى الشدائد و المصائب لم يخف فى الله لومة لائم بمكان
فرشت لوطأته قلوب اولى النهى وجماله قرت به العينان
و كلامه للطالبين كأنه ماء الحياة اتى الى الظمآن

ظاہری و باطنی اوصاف کے تذکرے کے بعد مولانا نے مرثیہ کو نیا رخ دیتے ہوئے عالمِ خیال میں ان سے استدعاء کی کہ آپ دور مت جایئے، کیوں کہ آپ کا ذکر خیر اس فانی دنیا میں باقی رہے گا، اور حقیقت یہ ہے کہ ذکرِ خیر انسان کے لئے دوسری زندگی کے مانند ہے، تو اے متقیوں کے امام! جاؤ تم اللہ کے سپرد، کیونکہ یہ خوبیاں تمہیں اللہ نے ہی عطا کی تھیں۔

محمود لا تبعد فذكرك خالد | و الذكر للانسان عمر ثانٍ
لله انت يا امام اولى التقى | لله درك من عظيم الشان

اس کے بعد کے دو اشعار میں مولانا اپنے شیخ کو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہنے کی دعاء دے رہے ہیں:

لا زلت مبتهج الفؤاد و لم تزل | فى عيشة مرضية بجنان
لا زلت فى كنف المهيمن فائزا | بنعيم رؤيته مع الرضوان

اسی کے ساتھ وہ مولانا کو ان کے جوار میں اپنی جگہ کے لئے سفارشی ذریعہ بناتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے صحابۂ کرام پر درود و سلام کے تحفے کے ساتھ مرثیہ ختم کردیتے ہیں:

وانظر الى الظفر الكئيب فانه | يرجو جوارك يا رجاء العانى
ثم الصلاة على النبى محمد | و على صحابته اولى الاتقان

لاڈلی صاحب زادی کا مرثیہ

مولانا ظفر احمد صاحب کی ایک صاحب زادی اختری نام کی تھیں، جن کی پیدائش ۱۵؍شعبان ۱۳۳۹ھ/ اپریل ۱۹۲۱ء کو ہوئی تھی۔ عین جوانی کی حالت میں ۲۵؍شعبان ۱۳۵۴ھ/ ۲۴؍نومبر ۱۹۳۵ء میں پندرہ سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اس حادثہ سے مولانا کی طبیعت بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ جوان اولاد کا غم جتنا رقت انگیز ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ مرثیہ سے واضح ہے کہ مولانا مرحوم کو اپنی اس بیٹی سے بے انتہاء پیار تھا، اور ان کے اچانک چلے جانے نے مولانا کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ انہوں نے جہاں موت کی حقیقت کو ذکر کیا، وہیں اس کی بے رحمی کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا، اسی کے ساتھ ساتھ ان معاملات میں انسان کی بے بسی کو بہت ہی خوبصورتی سے واضح کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے، اس کے اختیار میں کچھ نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اس کے فیصلے بالکل صحیح اور بروقت ہوتے ہیں۔ مرثیہ میں مولانا نے مرحومہ کے اوصاف کو نہایت جامع انداز سے پیش کیا ہے۔[1] اس کی ابتداء حزنیہ اشعار سے ہوتی ہے، جن میں مولانا اس غم کی شدت کو نئے انداز سے بیان کر رہے ہیں، وہ اس کا نقشہ اس انداز سے کھینچ رہے ہیں جس سے ہر قاری متاثر ہوتا ہے:

ما للفؤاد متیم متبول	ما للدموع علی الخدود تسیل
ما للسماء کأنها مهتزة	و الارض هامدة تکاد تمیل
همّ عرانی لا یکاد یزول	حتی اموت و هل الیه سبیل

اس کی وجہ مولانا یہ بیان کر رہے ہیں کہ دنیا سے ایک ایسا آدمی چلا گیا ہے، جسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی تھیں، دل کو سکون ملتا تھا۔ یہ غم بجائے خود اتنا بڑا غم ہے جو پہاڑوں کو ہلانے کے لئے کافی ہے، اسی وجہ سے آنکھوں کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے:

بمصاب قرة ناظری و حبیبی	کادت لها شم الجبال تزول
هی اختری حسنی کریمة اهلها	حسنی الفعال و وجهها لجمیل
راحت و خلّفت الفؤاد متیما	و العین تدمع و الدموع سیول

اس کے بعد مولانا اس حالتِ غم میں جس طریقہ سے یقین علی اللہ کا اظہار کر رہے ہیں، اس نے مرثیہ میں جان

---

(۱) ماہنامہ "قاسم العلوم"، دیوبند، شوال وذی قعدہ ۱۳۵۴ھ/ص: ۵۷-۵۹۔

پیدا کر دی ہے۔ وہ اگر چہ اس کی حالتِ جوانی میں موت کی توقع نہیں رکھتے تھے لیکن جب موت کا وقت آ گیا تو یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا، جس میں انسانی کوششوں کو کوئی دخل نہیں۔ اگر یہ ہوسکتا کہ میں اپنی جان کا نذرانہ اس کے فدیہ میں دے کر اس کی زندگی کو واپس لاسکتا تو اس میں دریغ نہ کرتا، لیکن ظاہر ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا:

ما كنت احسبها تموت فتية — كلا و لا ان التراب مقيل

قد كنت آمل ان يطول بقاء ها — فينا و لكن الجمال بخيل

كلا و لكن القضاء لواقع — امر الاله و وعده مفعول

لو كان ينفعها فديت بمهجتى — حقا و ذالك للحبيب قليل

مولانا کی یہ صاحب زادی صوم وصلوۃ کی بے انتہا پابند تھیں۔ حتی کہ جب ان کی موت کا وقت بالکل قریب تھا تب بھی وہ نماز کے لئے کمر بستہ تھیں۔ حالانکہ زبان گنگ ہوگئی تھی اور روح کھنچ رہی تھی، ایسی صالح صاحب زادی کی وفات کے بعد اب زندگی کا مزہ کیا باقی رہا؟ بس اب تو موت ہی کو زندگی کے الفاظ سے تعبیر کیا جا رہا ہے:

اعجب بهمتها لأمر صلاتها — و الروح ينزع و اللسان كليل

وا حسرتاه على تفرق شملنا — يا ليت شعرى هل اليه وصول

شط الحياة فلا حياة و انما — حرف الحياة على الممات مقول

یہ غم مولانا کا ذاتی غم ہے، جس سے پورا خان دان متاثر ہے، خاندان کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر سکون وقرار درہم برہم ہو گیا ہے۔ اب نہ تو گھر گھر رہا اور نہ ہی خاندان خاندان رہا۔ کیوں کہ خاندان کی زیب وزینت، اس کی ظاہری و باطنی خوبصورتی و جمال سے روشن تھی اور اب وہ سب کچھ غائب ہو گیا، جس کی وجہ سے زندگی دشوار ہو گئی:

كيف القرار ولا قرار بدونها — فرحيلها للوالدين رحيل

ما كان اجمع شملنا بكِ برهةً — و الدار دار و القبيل قبيل

فالدار منذ رحلتِ عنها غدوة — دار الهموم بها البكا و عويل

ما ان رأيت كمثل وجهكِ مشرقاً — كلا و ما لكِ فى الحسان مثيل

اس کے بعد مولانا اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں کہ یہ دن ہر انسان کے لئے کبھی نہ کبھی آنا ہی ہے۔ اگر زندگی فضل وتقوی کا معیار ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کی وفات کا حادثہ رونما نہ ہوتا۔ یہ دنیا فانی ہے اور دوام تو صرف آخرت کو ہے، وہی حقیقی زندگی ہے، اسی کی نعمتیں لازوال ہیں۔ دنیوی زندگی کا فلسفہ تو یہ ہے کہ ہر خوشی کے پیچھے کوئی نہ کوئی

غم کارفرما ہوتا ہے اور اخروی خوشی غموں سے آزاد دائمی خوشی ہے:

کل ابن آدم میت ولو انہ	عاش المئین باربع محمول
ما فی البقاء فضیلة و لقولنا	ھذا و فا .ة محمد لدلیل
لا عیش الا عیش یوم آخر	نعماؤہ تبقی و لیس تحول
و حیاتنا الدنیا تمر و تنقضی	و نعیمھا بمعرة مشمول

مولانا ان سب حقائق کو اجاگر کر رہے ہیں، لیکن بیٹی کی فطری محبت اور اس کی جدائی کا دلی غم مولانا کسی طرح فراموش نہیں کر پا رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا دھیان پھر اپنی لاڈلی کی طرف متوجہ ہو گیا ہے، اور وہ انتہائی غمگین انداز میں بیٹی سے اپنے تعلق کو اس طرح ظاہر کر رہے ہیں:

واللہ لا انساكِ بنتی! کلما	لاح الصباح بنورہ و اصیل
کلا و لا انساكِ بنتی! کلما	ناح الخلیل و بان منہ خلیل
لا تبعدی یا بنتِ ذکركِ خالد	و حدیث خیركِ فی الزمان طویل
لا تبعدی فلأنتِ وسط قلوبنا	و مثال وجھكِ فی العیون یجول
لا تبعدی نامی کنوم عروسة	سکری بروضٍ ظلہ لظلیل
لا تبعدی قری بوجہ محمدؐ	عینا و قربُ محمد لجلیل

یہیں سے مولانا کا ذہن رسول اکرم ﷺ پر درود و سلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور وہ درود و سلام کی سوغات اس طرح پیش فرما رہے ہیں:

صلی اللہ علیہ ربی کلما	ھب الدبور علی الوری و قبول
و علی صحابتہ الکرام و آلہ	ما لاح نجم او عراہ افول

رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر درود و سلام بھیجتے ہوئے بھی ان کے ذہن پر اپنی لاڈلی صاحب زادی کی یاد سوار ہے، جو کسی طرح ان کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو رہی ہے۔ اسی لئے درود و سلام میں بھی اس لختِ جگر کو شامل کر رہے ہیں:

و علیك یازین العشیرة بدرھا	معھم سلام دائم موصول

اپنی پیاری بیٹی کی جدائی پراس قدر رونے اور غم کرنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ چوں کہ دواوصاف ایسے ہیں کہ جن پر جتنا بھی رویا جائے کم ہے، ایک تو شریف کی موت اور دوسرے محبوب کی جدائی، اوراس پیاری بیٹی میں یہ دونوں اوصاف موجود تھے اس لئے اس پر رونا اور اظہارِ غم کرنا فطری ہے:

شيئان لو بكت الدماء عليهما   عين الزمان و سامنها النيل

كانا احق به و كانا اهله   موت الكريم و ان بين خليل

مرثیہ کے اختتامی اشعار میں مولانا نے اپنی صاحبزادی کو اللہ کے سپرد کرتے ہوئے ''حبیب سبحان اختری'' سے سنِ وفات (۱۳۵۴ھ) کی تخریج کی ہے:

و الله يا بنتى عليك خليفتى   و اليه يرجع كلنا و يؤول

عام الوفاة " حبيب سبحان اخترى"   بالفارسى مؤرخ مقبول

۱۳۵۴ھ

استادِ گرامی (مولانا محمد یسین صاحبؒ) کا مرثیہ

پاکستان کے سابق مفتی اعظم مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ کے والدِ ماجد مولانا محمد یسین صاحبؒ (۱۲۸۲ھ-۹ر صفر ۱۳۵۵ھ/ ۱۸۶۵-۱۹۳۶ء) دار العلوم، دیوبند کے مشہور استاد تھے۔ ان کا انتقال ۹ر صفر ۱۳۵۵ھ کو ہوا۔ اس پر مولانا نے مندرجہ ذیل مرثیہ کہا جو مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ''نفحات'' میں درج ہے۔ اس مرثیہ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ پورا مرثیہ خواب میں الہام ہوا، آپ نے اس کے ایک شعر کے علاوہ بقیہ تمام اشعار خواب میں ہی کہے۔ (۱)

اس کی ابتداء جس شعر سے کی گئی ہے وہ مولانا نے اپنی زمانۂ طالب علمی میں اپنے والد کے انتقال کے وقت بھی کہا تھا:

الی این ابکی واحدا بعد واحد ☆ فلیس امرؤ منا هناك بخالد

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس وقت بھی پے بہ پے دو غم پہونچے تھے، اور اس وقت بھی، اس وقت کے پہلے غم کا اگرچہ تعین نہیں ہوسکا تھا، لیکن اس وقت قریبی زمانہ (شعبان ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) میں مولانا کی صاحب زادی کی وفات کا حادثہ پیش آچکا تھا، اس لئے ''واحدا بعد واحد'' کا اشارہ ادھر ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور غالباً یہی شعر ہے جس کا مولانا نے حالتِ بیداری میں اضافہ کیا ہے۔

اس کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے ایسے عالمِ دین (جو مفتی صاحب کے والد تھے) کی وفات پر اظہار رنج وغم کررہے ہیں:

و ان الذی قد طار قلبی لفقده ☆ ابوك ابو الخیر افضل عابد

ان کی وفات جہاں ایک طرف رنج وغم کا باعث ہے، وہیں ایک گونہ اطمینان یہ بھی ہے کہ انشاءاللہ تعالی نے ان کے وہاں جانے پر انہیں خاص نعمتوں سے نوازا ہوگا۔ وہ جنت کے خوش گوار مناظر سے لطف اندوز ہورہے ہوں گے، جو بہترین مقام ہے اور جہاں اچھے لوگ ہی جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ان کی سعادت ہے کہ ان کے خلف مفتی صاحب جیسے فرزند نیک ارجمند ہیں تو ایسے والد اور ایسی اولاد دونوں ہی قابلِ مبارکباد ہیں۔ ایسے ہی ان کا اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے قرب میں چلا جانا، یہ سب باتیں بے انتہاء مبارک ہیں۔ اس لئے ان کی وفات پر زیادہ غم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ان کمالات کے باعث خوشی و مبارکباد کے مستحق ہیں، کیوں کہ مومن کی زندگی کا مقصد آخرت کی فلاح و

---

(۱) ماخوذ از: نفحات/ مرتبہ: مفتی محمد شفیع عثمانیؒ/ ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۳۹۳ھ/ ص: ۵۰۔

کامرانی ہے:

هنيئا ليسين الكريم قدومه　　على ربنا الرحمان رب العوائد

هنيئا له جنات عدن بظلها　　فيا خير مورود و يا خيروارد

هنيئا لمن قد كان مثلك ابنه　　فيا خير مولود و ياخير والد

هنيئا له قرب الحبيب محمد　　فيا خير مشهود و يا خير شاهد

اور جہاں تک ان کی علمی حیثیت اور معلم ہونے کا تعلق ہے وہ بہت اچھے استاد تھے جنہیں دیکھنے والے ''علم کا دریا'' کہا کرتے تھے:

فكان ابوك الخير خير معلم ☆ و انك بحر العلم زين المشاهد

تو ایسے علم و فضل والے باپ اور بیٹے دونوں ہی قابلِ فخر و مسرت اور لائق صد مبارکباد ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص جس کا وارث تم جیسا ذی علم شخص ہو، کبھی مرتا نہیں، کیوں کہ اس نے پیچھے ہدایت کے روشن ستارے چھوڑے ہیں جو اوروں کی رہنمائی کا کام کر رہے ہیں:

فطوبى لمن قد كان مثلك خلفه　　فيا خير مفقود و يا خير فاقد

و ما مات من كان خلف مثلكم　　نجوم الهدى من سائق الخير قائد

یہی وجہ ہے کہ تمہارے اسلاف اگر چہ بظاہر اس دنیا سے کنارہ کش کر گئے ہیں، لیکن وہ زندہ ہیں، کیوں کہ ان کے اسلاف میں آپ جیسے ذی علم و شعور اور صاحبِ فضل و تقوی حضرات ہیں۔ اس کا فیض آپ کی وجہ سے ان کو مسلسل پہونچ رہا ہے:

فيحيى بك الاسلاف طرا و يهتدى ☆ بكم خلف من بين غمر و راشد

آخری شعر میں مولانا اپنے رفیقِ محترم (مفتی محمد شفیع صاحب) کو یہ جاننے کے باوجود کہ وہ صبر سے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں، اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ صالح لوگوں کا اس دنیا سے چلا جانا اللہ کے حضور حاضر ہونا، اللہ سے ملنا، سب کچھ بہت سے فوائد اور انعامات پر مشتمل ہے، صبر کی تلقین کی ہے اور اس خوبصورت انداز سے مرثیہ کا اختتام ہوا:

فصبرا شفيع البر و انك عارف ☆ بان لقاء الله خير الفوائد

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مرثیۂ اول

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا ظفر احمد صاحبؒ کے حقیقی ماموں، مرشد و مربی اور اپنے وقت کے بلند پایہ عالمِ دین تھے، ان کی وفات کا حادثہ جمادی الثانی ۱۳۶۲ھ مطابق جولائی ۱۹۴۳ء میں پیش آیا تو ان کی خواہش کے مطابق نمازِ جنازہ بھی آپ نے ہی پڑھائی، اس حادثہ کا اثر حکیم الامت کے سبھی متعلقین بالخصوص مولانا جیسے مقربین پر جس قدر ہوا اس کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔ خود مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے مؤرخ و ادیب نے اس حادثہ پر متعدد تعزیتی مضامین لکھے، مشہور انشاء پرداز مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے ''حکیم الامت، نقوش و تاثرات'' نامی کتاب لکھی۔ مولانا تھانویؒ کے عاشق و شیدائی خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے ''اشرف السوانح'' تین جلدوں میں لکھ کر قوم کے سامنے حکیم الامت کی زندگی کو تفصیلی طور پر پیش کیا۔ الغرض سبھی متعلقین نے نظم و نثر میں بہت کچھ تحریر کیا۔ جس سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی علمی حلقوں میں مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا جس میں دو عربی مرثیے بھی شامل ہیں، اس وقت یہی مراثی ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ یہ دونوں مرثیے ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ کے دو شماروں میں شائع ہوئے۔ اول الذکر مرثیے کو خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے اپنی کتاب میں شائع کر کے اسے مولانا تھانویؒ کی حیات کا جزو بنا دیا۔ [۱] اسی مرثیہ کا قدرے تفصیلی جائزہ ذیل میں پیش ہے۔

اس مرثیے کی ابتداء حزن و ملال کی کیفیت سے ہو رہی ہے، جب کہ اس صدمہ سے شاعر بے قرار ہے۔ اس کی آنکھ اشکبار ہے اور گریہ بڑھ رہا ہے، اور وہ آنسوؤں کو سامانِ تسلی بنائے ہوئے ہے:

بکت عینی و زاد بی العویل ☆ و هل بدموعها یشفی الغلیل [۲]

مولانا اسی کے ساتھ ساتھ غم و ملال کی اس حالت کو اس کیفیت کے مشابہ بتا رہے ہیں کہ جب پہاڑ جھکے ہوئے، بلکہ جگہ سے ہٹے ہوئے معلوم ہو رہے ہوں، جس کی وجہ سے شہر وحشت ناک معلوم ہو رہے ہوں اور ایسے ہولناک منظر میں کوئی دوست نظر نہ آ رہا ہو، بس ایسا محسوس ہوتا ہو کہ ہر کوئی اندھیرے میں ہے اور بظاہر اس حالت سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ یہ حالت مصیبت کی ایسی انتہائی حالت ہے کہ جس سے دل پھٹ جائیں اور عقل جاتی رہے:

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: ''اشرف السوانح''/ خواجہ عزیز الحسن مجذوب/ امداد المطابع، تھانہ بھون ۱۳۹۴ھ/ ج:۳، ص:۱۵۱-۱۵۴۔

(۲) معارف، اعظم گڑھ : ۳/۵۲، ستمبر ۱۹۴۳ء، ص:۲۲۹-۲۳۲۔

لقد ضاق القضاء بنا و مالت　　جبال الارض او كادت تزول
و اوحشت البلاد بنا و امست　　يبابا ما يرى فيها خليل
و اظلمت الديار و ما عليها　　فهل لضيائها يوماً سبيل؟
تصدعت القلوب بما دها ها　　وجلّ الخطب و انذهلت عقول

اس کے بعد حکیم الامت کے علمی و عملی کمالات، خصوصاً ان کی علوم قرآن و حدیث پر گہری نظر اور اس کی وجہ سے زمانہ کی خدمات، تقوی و فضل کی وجہ سے زمانہ کی امامت کے ان کے ذاتی اوصاف کو خاص طور پر ابھارا گیا ہے:

و قلبت الامور غداة ولّى　　حكيم الامة العلم الجليل
مجدد ملة الاسلام حقا　　فنعم دليلنا ذلك الدليل
مفسر عصره من غير خلف　　فقيه الوقت ليس له عديل
خبير بالحديث و كل علم　　و بالاسراء ينطق اذ يقول
و ليٌّ زمانه عدل تقى　　امام الدهر ليس له مثيل
تضلع بالعلوم فكان فردا　　اليه كل مكرمة تؤول
رؤف راحم بر كريم　　و لاعناق الهوى سيف صقيل

حکیم الامت کی خاصیت یہ تھی کہ وہ شیطانی جال کو کاٹ کر عوام کو ارشاداتِ نبویہ کی طرف دعوت دیتے تھے، اس طریقہ پر وہ حق کے داعی تھے اور باطل کو کاٹنے والے تھے۔ وہ اگرچہ آج ہمارے بیچ نہیں ہیں، لیکن ان کی تصنیفات و تالیفات زندۂ جاوید ہیں:

لقد قطع الحبائل عن فئام　　بواد الهالكين لهم نزول
يحض بنا على طلب المعالى　　و يهدينا لما قال الرسول
له فينا صحائف معلمات　　كثير ثناؤ ها منا قليل

یہی وجوہات تھیں کہ جو بھی ان کو دیکھ لیتا تھا وہ ان کے فضل کا معترف ہو جاتا تھا، کیوں کہ وہ اللہ کے دوست تھے، اس لئے ان سے عداوت کرنا اللہ سے عداوت کرنے کے مترادف تھا۔ یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اللہ کا دشمن ہمیشہ ذلیل و خوار ہی ہوتا ہے، اسی وجہ سے جب میں نے انہیں قبر میں اترتے ہوئے دیکھا تو میرا دل پھٹنے لگا:

اقرّ بفضله من قد رآه　　و لم يكفر به الا جهول

یعادی اللہ من عادی ولیا	لہ و عدوہ ابدا ذلیل
و کاد القلب ان ینشق لما	رأیتك فی التراب لك المقیل

پھر مولانا نے اپنی اس قلبی کیفیت کو ظاہر کیا ہے جوان پر اپنے پیرومرشد کے رخصت ہونے کے باعث گذر رہی ہے۔ وہ ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ جن کی جدائی پر آسمان، چاند، سورج اور زمین سب رو رہے ہیں، دریا اور اس کی مخلوق، پہاڑ اور اس کے نباتات، مکان ومکین، دیوار و در سبھی ان کی جدائی پر آنسو بہا رہے ہیں، یہی نہیں بلکہ علوم اور ان کے پڑھنے والے، ضوابط واصول، منبر ومحراب، وعظ ونصیحت سبھی اشک فشاں ہیں۔ مدارس دینیہ (جو ظاہری علوم کا ذریعہ ہیں) اور طریقت وسلوک (جو باطنی علوم کا مدرسہ ہیں)، تصوف وشریعت سبھی اپنے قدر داں کے اس طرح چلے جانے پر گریہ زاری کر رہے ہیں۔ راتوں کا تہجد، اور دن کی حسین وجمیل مجلسیں، غرضیکہ دور، قریب اور اجانب واقارب اپنے اس پیشوا کے جانے پر غمزدہ ہیں، اور اپنے غم کا اظہار ظاہری و باطنی طریقہ سے اپنے اپنے انداز میں کر رہے ہیں، اس سے ان کی شخصیت کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ملاحظہ فرمایئے اشعارِ بُکا:

یبکیك السماء و نیّراها	و هذی الارض هامدة تمیل
یبکیك البحار و ما حوتها	و تبکیك الحزونة و السهول
یبکیك البیوت و ساکنوها	و تبکیك المعالم و الطلول
یبکیك العلوم و دارسوها	و تبکیك الضوابط و الاصول
یبکیك المنابر موحشات	و تبکیك المواعظ و القبول
یبکیك المدارس مظلمات	علیها الیوم دائلة تدول
یبکیك الطریق و سالکوها	و یبکیك التصوف و الوصول
یبکیك التهجد باللیالی	و مجلس یومك الحسن الجمیل
یبکیك الحقائق و المعانی	و تبکیك الصحائف و النقول
یبکیك الاقاصی و الادانی	و یبکیك الاجانب و القبیل
و یبکیك الزمان لفقد خیر	بفقدك ایها البر الوصول

یہی وجوہات ہیں کہ مولانا مرحوم کی شخصیت کو بھلایا نہیں جاسکتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ ان کے آثار اور حکیم الامت کی ذاتِ گرامی سے جڑے ہوئے نورانی ایام ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان کا ذکر

ہماری مجلسوں میں عرصۂ دراز تک رہے گا:

فلا ننساك اشرف! مابقينا　　و انك بين اعيننا تجول

تذكرناك آثار كرام　　تركت لنا و ايام حجول

اذا نسي الانام حديث قوم　　فذكرك في مجالسنا يطول

اس کے بعد مولانا قدیم شاعرانہ طرز کے مطابق اپنی آنکھ کو مخاطب کر کے اسے رونے اور آنسو بہانے پر زور دے رہے ہیں، کیوں کہ یہ حادثہ اتنا سنگین ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا، اس کے لئے ہم اگر اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کر دیں تو بھی حق ادا نہیں کیا جاسکتا:

الا يا عينُ جودي و استهلّي　　بدمع بعد ذلك لا يسيل

فاني لن اصاب بمثل هذا　　و ان رحيله لهو الرحيل

فدته نفوسنا لو كان يبقى　　لكان لنا به ظل ظليل

مولانا کو اپنے مرشد کی وفات پر جہاں بے انتہاء غم اور رنج ہے، وہیں اس بات پر انہیں اطمینان وسکون بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال اور تعلق مع اللہ کی بدولت اللہ کے فضل وکرم سے جس مقام پر گئے ہیں، وہ مقام قابلِ صد رشک مقام ہے اور اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، کیوں کہ وہاں پر انہیں اللہ کا سلام، اجرِ جزیل اور ابدی نعمتیں مل رہی ہیں۔ ہماری جماعت کا یہ مایۂ ناز فرد (انشاء اللہ العزیز) اللہ تعالی کے پاس عمدہ عیش میں ہے۔ (یہ مولانا کے عقیدت مندانہ خیالات ہیں، جو انہوں نے اپنے پیرو مرشد کی قربت میں رہتے ہوئے ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر قائم کئے ہیں۔ مقامات کا تعین صرف ذاتِ باری تعالی کے انعامات پر منحصر ہے):

ليهنك سيدي في كل يوم　　سلام الله و الاجر الجزيل

و صلت الى مقام شهود صدق　　يحف به نعيم لا يزول

فانت لدى الاله بخير عيش　　و انت لخيلنا سلف رعيل

اسی کے ساتھ مولانا کا ذہن اس ارضِ مقدس کی طرف مراجعت کر رہا ہے جس میں تمام مخلوقات کی افضل ترین ہستی نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قیام فرما ہیں۔ اس ارض مقدسہ کی زیارت بھی ہر قلب کی زندگی ہے۔ اس ارضِ مقدسہ کی مٹی بھی مریض قلب کی شفا ہے، کیوں کہ وہ ارضِ مقدس اپنے دامن میں اس مایۂ ناز شخصیت کو لئے ہوئے ہے کہ جس کے لئے جان کا نذرانہ پیش کر دینا دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے:

بنفسی روضة فی ارض قدس	بها جدث له شرف نبیل
زیارته الحیاة لکل قلب	و تربته بها یشفی الغلیل
اذا فقد الریاض عبیر ورد	فماء الورد عن ذاك البدیل
و ان افلت ذکاء فان نجما	ظلام اللیل عن افق یزیل
فصبراً یا لأشرف ان فیکم	نجوماً یهتدی بهم الضلول [1]

چوں کہ یہ ایک کلیہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سچی محبت کرنے والا اوران کی تعلیمات پر عمل کرنے والا شخص ہزاروں قلوب کو غیر فانی نور سے حیات بخشنے والا ہوتا ہے اور وہ فنا نہیں ہوتا۔ ہمارے حکیم الامت بھی اسی قبیل سے ہیں، ان پر اللہ تعالی کی طرف سے ہر گھڑی رحم وکرم کی بارشیں نازل ہوں:

و ما مات الذی احیی قلوبا	بنور ما له ابدا افول
علیه من المهیمن کل حین	شآبیب الکرامة و الظلول

---

(۱) درجِ بالا اشعار میں سے مؤخر الذکر تین اشعار اشرف السوانح میں نہیں ہیں صرف معارف میں ہیں۔

دوسرا مرثیہ

مولانا ظفر احمد صاحب نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک اور مرثیہ کہا، جو "معارف" کے اکتوبر ۴۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ مرثیہ چونتیس اشعار پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ گذشتہ مرثیہ کا تتمہ معلوم ہوتا ہے، لیکن دونوں کے مضامین قدرے مختلف ہیں۔ ابتداء اس مرثیہ کی بھی غم وحزن کی اس کیفیت سے ہوتی ہے جو شاعر کے دل پر اس سانحہ سے واقع ہوئی ہے، اس کا انداز پہلے سے ذرا سا مختلف افسانوی طرز لئے ہوئے ہے، ملاحظہ فرمائیں: (۱)

بقلبی هم لا یکاد یزول ثقیل و هم العاشقین ثقیل

یسهرنی لیلا طویلا و لم اکن لأسهر الا ان یبین خلیل

الی الله اشکو ما الاقی من النوی و لو ان قلبی للجبال حمول

اور صرف دل پر ہی اکتفاء نہیں، بلکہ دل کے ساتھ ساتھ آنکھ اپنا کام اس انداز سے کر رہی ہے کہ وہ گرم پانی کا چشمہ بہا کر اس دل پر پڑے ہوئے غمگین بوجھ کا اظہار کر رہی ہے:

کان بعینی مابقلبی من الجوی فمن طرفها عین الحمیم تسیل

مولانا اس غم کی منظر نگاری بایں طور کر رہے ہیں جیسے کہ رات کے وقت کا عالم ہو، ایسے وقت میں موت کی خبر دینے والا کسی کی موت کی خبر سنائے تو اندھیری رات اور موت کے خوف سے سننے والے پر خوف والم کی جو غم ناک کیفیت گذرے گی وہی حالت میری حکیم الامت کے انتقال کی اطلاع سے ہوئی اور میں نے اس اطلاع دینے والے کو غیر اشرف کہہ دیا۔ لیکن یہ خبر مبنی بر حقیقت تھی، اسی وجہ سے میں رویا اور میرا دل کثرتِ گریہ کی وجہ سے پھٹ گیا:

و داعٍ دعا اذ قام باللیل ناعیا فطار بقلبی القول حین یقول

فقلت له غیر اشرف ناعیا فدته الوری لو للفداء قبول

فبکّی و نادی ان اشرف قد ثوی فضجت قلوب بالبکا و عقول

مولانا اشرف علی کی وفات کا سانحہ کسی ایک گھر یا خاندان کا غم نہیں، بلکہ وہ تمام نیک لوگوں کا غم ہے، کیوں کہ انہوں نے قرآن کی تفسیر کی خدمات انجام دیں۔ وہ ایسے فقیہ تھے جو فروع واصول پر دسترس رکھتے تھے، وہ متقی تھے، اور ذی رائے تھے، انکی رائے کا عوام احترام کرتے تھے، ان کی مختلف علوم پر مبنی کتب سے اہلِ علم استفادہ کر رہے ہیں۔ اسی وجہ

(۱) تفصیل کے لئے: معارف، اعظم گڑھ : ۵۲/۴؛ اکتوبر ۴۳ء؛ ص: ۳۰۶ تا ص: ۳۰۸۔

سے اس حادثۂ فاجعہ پر غم وحسرت اور افسوس کا اظہار ایک قدرتی وفطری امر ہے، یہ غم ایسا غم ہے کہ اگر پہاڑوں پر پڑ جائے تو وہ لرز جائیں، کیوں کہ انہوں نے اپنے علمی کمالات کی وجہ سے اللہ تعالی سے قتال کرنے والے گروہ پر شمشیر برہنہ کے مانند کام کیا تھا۔ کاش یہ جدائی کے دن نہ ہوتے اور وصال کے ایام لوٹ آتے:

مجدد هذا القرآن حقا حكيمه ــ فقيه لديه للفروع اصول

مفسر هذا العصر من غير ريبة ــ له في المعالي رأية و رعيل

تقي نقي حجة ذو اصابة ــ من الرأى اذ رأى الانام اقول

له كتب في كل علم جميلة ــ بها يشتفي للطالبين غليل

تقطر قلبي اذ رأيتك راحلا ــ و كادت له شم الجبال تزول

فوا حسرتا ما اقبح البين بيننا ــ و اقطعه و النائبات تهول

و يا قاتل اللهُ النوى ما امرّه ــ واصرعه للمرء حين يصول

فيا ليت ايام الفراق رواحلا ــ و يا ليت ايام الوصال تؤول

حکیم الامت ایسی شخصیت کے حامل تھے کہ جنہوں نے اپنے علمی کمالات کی وجہ سے علوم پر پڑی ہوئی نقاب اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس کے پوشیدہ رازوں کو گویائی عطا فرمائی، جس کی وجہ سے خود ساختہ فریبِ دانشوری میں مبتلا افراد دلدل میں مبتلا شخص کی مانند ہو گئے، اور حکیم الامت نے ایسے علمی نکتے دریافت کئے جنہوں نے ان علوم کو خزانے کی حیثیت دے دی، جس کی وجہ سے مخلوق کے درمیان انہیں عظمت وبزرگی حاصل ہوئی:

فمن لعلوم قد كشفت لثامها؟ ــ و لم يقتبسها عن سواك سؤول

و من لمعان قد نطقت بسرها؟ ــ و زلّت باقدام العقول وحول

و من لنكات قد فتحت كنوزها؟ ــ لها غرر بين الورى و حجول

و من لعضال اعجز الناس طبه؟ ــ و انت لكشف المعضلات كفيل

و من لبيان في القلوب مؤثر؟ ــ و بعدك قول القائلين فضول

یہی وجہ ہے کہ اس عالم باعمل کی وفات پر علماء، صلحاء اور متقی حضرات اس طرح ماتم کناں ہیں کہ آنسو سیلاب بلا کی صورت اختیار کر گئے ہیں، یہ گریہ زاری کسی ایک طبقہ یا کسی ایک متعینہ زمانہ سے عبارت نہیں ہے، بلکہ یہ نالۂ شیون تا قیامت یوں ہی جاری رہے گا:

يبكيك اهل العلم و البر و النهى	سواءً شباب منهم و كهول
يبكيك اهل الزهد و الورع و التقى	بآماتهم مثل العيون سيول
يبكيك اهل الارض فى كل ليلة	و فى كل يوم رنة و عويل

یہ حادثہ ایسا حادثہ ہے کہ جس کی وجہ سے اطراف واکناف کے عوام آزمائش میں مبتلا ہو گئے ہیں، کیوں کہ آپ ہر عبدِ بیمار کے لئے طبیب کے مثل تھے۔ آپ علوم کے فریاد رساں تھے اور آپ کے چہرۂ انور کی دید سے آلام ومصائب اسی طرح زائل ہوتے تھے جس طرح چمک دار رھار دار تلوار کے سامنے کوئی نہیں ٹک پاتا۔ مولانا نے حکیم الامت کے ساتھ زندگی کے گذارے ہوئے ایام کو نہایت شیریں، خوبصورت اور بڑی پاکیزہ زندگی کا دور تسلیم کیا ہے، یہ مجالس عدل و انصاف اور زہد وتقوی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھیں۔ آپ کے ذکر کے بغیر زندگی بے کیف لگتی ہے اور حالت خواب میں مولانا کے افکار وخیالات بڑی واضح صورت میں نظر آتے ہیں:

فقد حاق بالناس البلا كل جانب	و كنت طبيبا و الزمان عليل
و كنت ملاذالانام غياثهم	و وجهك سيف للهموم صقيل
تذكرت اياما مضت فى حلاوة	اذا انت حى و الزمان جميل
مضت فمضى ما كان من طيب عيشة	بمجلس خير ما لذاك عديل
اقوم و مالى غير ذكرك لمهج	و ارقد و الافكار فيك تجول

اسی کے ساتھ مولانا ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جب حکیم الامت نے اپنی موت کے وقت مولانا کو بلا کر قرآنی آیت کریمہ ﴿و جعلنا ها و ابنها آية للعالمين﴾ لکھ کر انہیں دی۔[1] جس سے اشارہ ملتا ہے کہ حکیم الامت نے نرینہ اولاد نہ ہونے کے باعث مولانا ظفر صاحبؒ کو اولاد کے مانند مان لیا۔ اسی طرح انہوں نے مجھے عیسٰی بن مریم علیہما السلام سے تشبیہ دے کر خوش کر دیا۔ یہ نمونہ اور یہ مثالیں بہت ہی برکتوں والی ہیں:

بنفسى من لم ينسنى عند موته	دعانى باسمى واللسان كليل

---

(۱) مولانا نے اس شعر کی تشریح کے لئے معارف میں حاشیہ دیا ہے جس میں تحریر فرمایا ہے کہ: ''حکیم الامت نے اپنی وفات سے دو دن قبل گھر کے تمام افراد کی موجودگی میں کاغذ اور قلم لے کر ایک تحریر لکھ کر مجھے دی جس میں تحریر تھا ''هنيئاً لكم انموذج آية؛ ﴿و جعلناها و ابنها آية لعالمين﴾ (القرآن الکریم؛۲۱:۹۱) اور فرمایا کہ میں اس سے زیادہ لکھنے پر قادر نہیں، مجھے اس سے جو خوشی ہوئی وہ ناقابلِ بیان ہے''۔ معارف؛ ۴/۵۲؛ ص:۳۰۸۔
اس آیت سے مولانا تھانوی کا مقصود خواہ کچھ بھی ہو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تھانوی، مولانا ظفر کو اپنی حقیقی اولاد کے مانند بتانے کا اشارہ دے رہے ہیں۔

و قد كان فيها قبل يومين خط لی　　　كتابا لـه فی المرجفين صليل

يبشرنی انی بعيسی ابن مريم　　　ببركتـه انموذج و مثيل

عليها مع الابن السلام و تحية　　　من اللـه ما يتلو العروج نزول

شیخ عارف کی موت کے وقت یہ بشارت میرے لئے اللہ کی خصوصی نعمت ہے، جس کی دلیل آیت بالا ہے۔ اللہ تعالی ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، اوران کی بھلائیوں کا دائرہ بڑی بھلائیوں کے ساتھ وسیع کرے اوران کو بہترین جزا عطا فرمائے، آمین:

بشارة شيخ عارف قرب موته　　　لنعمة ربی آية و دليل

جزاه الـه العرش خيرا يمده　　　بخير عظيم و الجزاء جزيل

اسی کے ساتھ مرثیہ ختم ہو جاتا ہے۔

مولانا کی شریکِ حیات کا مرثیہ

مولانا ظفر احمد صاحب کی پہلی شادی تھانہ بھون کے پیر جی ظفر احمد صاحب کی صاحب زادی کے ساتھ (۱۳۲۹ھ/۱۹۱۰ء) ہوئی تھی۔ (انہیں کی ایک بیٹی کی شادی مولانا اشرف علی کے ساتھ ہوئی تھی [۱]، جن کی ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء میں وفات ہوگئی۔ مولانا کی طبیعت اس واقعہ سے حد درجہ متاثر ہوئی۔ شریکِ حیات کی طویل رفاقت کے بعد اس طرح داغِ مفارقت دے جانا واقعۃً بہت بڑا صدمہ تھا۔ مولانا نے اپنی ان کیفیات کو مرثیہ کی شکل میں پیش کیا۔ فی الحقیقت یہ مرثیہ دلی جذبات کی حقیقی ترجمانی ہے۔ اس میں الفاظ کی بندش اور جاذبیت اس قدر ہے کہ اس کی وجہ سے مشہور مؤرخ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا کی عربی شاعری پر قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے، اور اس پر خصوصی ادارتی نوٹ میں اس کو واضح کیا ہے۔ [۲]

مولانا نے اس مرثیہ میں اپنے مونس وغم خوار کی جدائی پر حد درجہ افسوس کا اظہار کیا ہے، اور اس مرثیہ میں ان کے ظاہری حسن و جمال کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرحومہ باطنی اوصاف کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن و جمال کی دولت سے بھی مالا مال تھیں۔ اس کا آغاز ملاحظہ فرمائیے:

أف لـفـرقة مـونسـي و أنيسـي — بـدر البـدور نـعم وشمس شموس

حسنـاء ، بيـضـاء الـفعـال فريدة — غيـداء قـد ارزت لـكـل نـفيـس

حسن و جمال کی انتہائی تشبیہات سے مولانا کی مراد ان کی ظاہری خوبصورتی سے لی جاسکتی ہے، لیکن ایک مؤمن کی باطنی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو، اور اللہ کا اطاعت گذار، فرماں بردار ہو۔ مرحومہ ان اوصاف سے بھی متصف تھیں۔ ان اوصاف کو ابھارنے کے لئے مولانا نے انتہائی مبالغہ سے کام لیا ہے کہ ''اگر وہ اپنے اندازِ عبادت کے ساتھ مشرکین میں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتیں تو وہ شیطانی طریقوں پر چلنے والے مشرکین بھی ان کے اس عمل سے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے، اور اگر ان کا ظاہری جمال مجوسیوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا تو اس حسن و جمال کے سامنے مجوسیوں کے آتشدان سرد پڑ جاتے:

اللّٰـــهُ زيـنـهــا بـحسـن مـلاحة — و عبــاد ۃ و طهــاۃ الـنـامـوس

لـو انهــا لـلـمشـر كـين تعرضـت — سـجـدوا لـطـلـعتهــا بـنـوا ابليـس

---

(۱) تذکرۃ الظفر/ص: ۱۳۰۔

(۲) ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ، ۶۷/۴؛ اپریل ۵۱ء/ص: ۳۰۶۔

و لـو انهـا خـرجـت لهم فـی زینة　　　خـمـدت لهـا انفـاس نـار مجوس

مذکورہ بالا اشعار نے مولانا کی شاعرانہ طبیعت کی پوشیدہ صلاحیتوں کی پوری طرح ابھار دیا ہے، اور ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ حسن و جمال کی شیدا طبیعت کے مالک تھے جس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ مولانا کی اہلیہ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ سیرت سے بھی مالا مال تھیں انہوں نے خود کو خلقِ خدا کے لئے وقف کر دیا تھا، ان کے انہیں اوصاف کے باعث ہر ملنے والا اور تمام اعزاء و اقرباء سکون و راحت محسوس کرتے۔ ایسی شخصیت کا اس طرح جدا ہونا نہایت تکلیف دہ ہے، چناں چہ جب بھی جمعرات کا دن (اسی دن مرحومہ کا انتقال ہوا تھا) آتا ہے تو دل پر ایک چوٹ سی لگ جاتی ہے۔ ہائے افسوس! اس کی جدائی سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ دل کے ٹکڑے کر کے خود تو چلی گئی اور مجھے اس غرض مند دنیا کے سپرد کر گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر قرار و سکون کا تصور امر محال ہے۔ اس کی جدائی سے دل تنور کے مانند ہو گیا ہے۔ جس نے دل کو خاکستر کر دیا۔ ان حالات میں زندگی بے کیف ہے۔ یہ حسین و جمیل زندگی قباحتوں اور ذلتوں کے ہاتھ بک گئی ہے۔ یہ ہیں وہ جذبات جن کا اظہار مولانا نے اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے:

کـانـت حیـاة لـلـنـفـوس و راحة　　　لـلـقـلـب قـرة عیـن کـل جـلیـس

راحـوا بهـا یـوم الـخـمیـس فلم ازل　　　قـلـق الـفـؤاد بـکـل یـوم خمیـس

و افـرقـتـاه لـقـد تـقـطـع مهجتی　　　و بـقیـت فـی نکد اذل خسیـس

و احــرقـتـاه فـلا قـرار بـدونهـا　　　یـا ویـح قـلـب بـالفراق و طیس

و احـرّ قـلـبـاه فـکیف یـلـذ لی　　　عیـش تبـدل سـعـده بـنـحـوس

آگے مولانا نے شعری انداز بدل دیا ہے، وہ اپنی اہلیہ کے دوسرے عالم میں پہونچ جانے پر افسردگی و ملال کا اظہار کرتے ہوئے انہیں مخاطب کر رہے ہیں کہ تم ہمارے دلوں سے دور نہیں ہو، بس یہ سمجھ لو کہ ہمارے سینوں کی دھڑکن، آنکھوں کا سرور اور ذہن کا سکون سب کچھ تمہاری یادوں سے وابستہ ہے۔ میں تم سے انتہائی تیز رفتار سواری پر سوار ہو کر منزلِ مقصود پر پہونچ کر مل لوں گا، میں تمہارا پیچھا اس طرح کر رہا ہوں کہ اس طریقہ کا پیچھا کرنے والا اور کوئی نہیں ہے، اور میری جان تم پر فدا ہے:

لا تبـعـدی فـلأنـت بیـن قـلـوبـنـا　　　و صـدورنـا و عیـونـنـا و رؤوس

لا تبـعـدی لأوافیـنـك عـاجـلا　　　فـلـقـد حدا بالرکب حادی العیس

لا تبعدی فالله خیر خلیفة　　　　منی علیك فداك کل نفوس

اس خطاب کے ساتھ مولانا اپنی اہلیہ کو بڑی قیمتی دعاؤں سے نواز رہے ہیں، کیوں کہ اب ان کے لئے یہی چیز ذخیرۂ آخرت ہے، دعاء میں بھی مولانا نے بہت دل کش انداز اختیار کیا ہے، چند الفاظ میں انتہائی جامع اور مؤثر دعائیں دے کر ''دریا کو کوزہ میں بند کرنے'' کا محاورہ پورا کردیا ہے:

حیاك ربكِ و الملائکة الکرا　　　　م بقولهم نامی کنوم عروس

سبقت لكِ الحسنی فانتِ بعیدة　　　　عما یسوء ك یا اجل انیس

روّی الاله رباكِ کل عیشة　　　　و سقاكِ من نهر الحیا بکؤوس

اسی مرثیہ کے ایک شعر میں انہوں نے سالِ وفات کی تخریج بھی کی ہے، جس میں ان کے لئے دعائے خیر کی گئی ہے، اور آخری شعر میں حضورِ اکرم ﷺ، ان کے عیال پر درود بھیج کر مرثیہ کا اختتام ہوا، جو مولانا کا ایک عظیم شعری شاہ کار ہے:

منی السلام علیكِ یا روح الحیاة و عمدتی فی کل یوم عبوس

عام الوفاة خلیل ربك مشتری　　　　حق وقاها ربها من بوس

۹۵۰ + ۲۲۲+۶۷۰　　　　۱۰۸ = ۱۹۵۰

۱۹۵۰

ثم الصلاة علی النبی و آله　　　　ما دام بهجة لیلة التعریس

دوست کا مرثیہ

مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ، مولانا ظفر احمد صاحب کے حقیقی ماموں زاد بھائی، یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ مولانا کے ہم عمر تھے، برادرانہ ودوستانہ تعلقات کے علاوہ مولانا کی اہم ترین تصنیفات کے ناشر اور ماہنامہ ''النور''، تھانہ بھون کے مدیر بھی تھے۔ علم دوست اور علماء نواز تھے۔ ابتداء سے ہی علمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان چلے گئے تھے، وہیں پر شعبان ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں بمقام کراچی اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال پر مولانا نے ایک تعزیتی مضمون بہ عنوان ''محبوبِ نبی شبیر علی'' لکھا، جس کے آخر میں ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔ یہ مضمون کراچی کے مشہور علمی جریدہ ''البلاغ'' میں شائع ہوا۔ (۱)

مرثیہ کی ابتداء اس آنکھ کو مخاطب کر کے کی گئی ہے جو آنسو میں ڈوبی ہوئی ہے اور موٹی موٹی بوندوں کے مانند اشک بار ہے:

یا عین جودی مع هاطل همل ☆ على حبيب جميل الوجه و العمل

اسی کے ساتھ اپنے اس دوست کی جدائی پر دل ودماغ کی جو کیفیت ہوئی، اس کا اظہار ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کیوں کہ وہ حسن وجمال اور شکل وصورت کے علاوہ سیرت میں بھی ممتاز تھے:

وا حر قلباه من موت الحبيب و من	بدر الجمال ببطن الارض منجدل
و احسرتاه كريم كان موضعه	بين العيون رهين الترب و الجزل
واحسرتاه احيط البدر فى ظلم	من الغمام و غاب الشمس فى ظلل
و افرقتاه فان القلب متصدع	و العيش منكدر و العين فى همل

وہ ایک کریم النفس، علم کے شیدائی اور حلیم و بردبار تھے، وہ مغلظات، فتنہ وفساد اور دنیاوی جھمیلوں سے دور تھے، ان کی زندگی صاف ستھری تھی، وہ اللہ کا ایسا جوان تھا جس کا مقصد اللہ کی اطاعت کرنا تھا، وہ اخلاقِ عالیہ سے مزین اور خباثتوں سے پاک تھے، سخن سرا ہوتے تو چہرے پر مسکراہٹیں کھلتیں، وہ مساکین کے معاون ومساعد اور خلق خدا کے رفیق تھے، مہربانی، سخاوت، بزرگی، ذہانت، نیکی، بردباری اور تقوی جیسی صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں، چغلخوری جیسی بیماری سے کوسوں دور تھے:

---

(۱) ملاحظہ فرمایئے: ماہنامہ ''البلاغ''، کراچی؛ شوال ۱۳۸۸ھ؛ ص: ۳۱ تا ۴۰۔

ما كان احسنه خلقا و مكرمة	ما كان اطيبه نفسا بلا دخل
العلم ادّبه و الحلم هذّبه	لم يلف قط على شتم و لا جدل
بعدا و سحقا لدنيا لا يزال بها	هم يكدر صفو العيش بالخلل
لله در فتىً قد كان منشأه	في طاعة الله من ايامه الاول
مزين بحلى الآداب نائرة	مطهر من قذى الامارة السفل
حلو الشمائل طلق الوجه مبتسما	عون المساكين محبوب الانام ولى
حر، كريم، سخى، ماجد، فطن	بر، حليم، تقى، غير ذى دغل
زين العشيرة نور العين قرتها	نعم و منطقه احلى من العسل

ایسا عالی اوصاف شخص، جس میں ظاہری اور باطنی خوبصورتیاں اس درجہ موجود ہوں، وہ اللہ کی رحمت اور لطف و عنایات سے دور نہیں ہوسکتا (انشاء اللہ)۔ ہمیں اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے دور نہیں ہوں گے، ان کی زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، ہمیں امید یہی ہے کہ ان کے خلف بھی اس راستہ پر چل کر اپنے ان اسلاف کا نمونہ بنیں گے۔

ان مذکورہ بالا اوصاف کے باعث آج لوگوں کی آنکھیں انہیں آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں میں تلاش کر رہی ہیں:

لا يبعد الله من قد كان طلعته	عين الحياة لنا بالاعين النجل
كنا نؤمل ان تبقى لنا خلفا	فكنت سلفا لنا يا خير مرتحل
تبكى عليك عيون الناس قاطبة	مع السماوات و الارضين و الجبل

اس کے بعد مولانا نے ایک شعر میں قرآنی آیت سے استشہاد کرتے ہوئے بڑی عمدہ نصیحت سبھی افراد کو بڑے خوب صورت پیرایے میں کی ہے:

و عد من الله ماتى على اجل ☆ و لات حين مناص [۱] منه بالحيل

درجِ ذیل اشعار میں مولانا نے اپنے دوست کے لئے دعائیں کی ہیں نیز رسول اللہ ﷺ، آلِ رسول اور اصحابِ رسول پر درود و سلام پیش کیا ہے:

---

(۱) القرآن الکریم؛ ۳۸:۳۔

روی الالــه ضـریـحـا ضم اعظمـه ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بـصیـب مـن ریاض القدس منهمل

ثـم الصلاة علـی مـن کـان نشأته ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اصـل الـخـلائـق جرّا هـا من الازل

مـحـمـد خـاتـم الانبیـاء سیـدهم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ و اکـرم الـنـاس طُـرا افـضل الرسل

و الآل و الـصـحب ثم التابعین لهم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مـا لاح نـجـم علی الآفاق بالأُصُل

شاگرد کا مرثیہ

مولانا محمد ادریس کاندھلوی علیہ الرحمۃ برِّ صغیر کے ان ممتاز علمائے کرام میں سے ہیں جنہوں نے اپنی علمی خدمات خصوصاً علومِ قرآن وحدیث میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ آپ کی پیدائش ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ/ اگست ۱۸۹۹ء کو معروف مردم خیز قصبہ کاندھلہ میں ہوئی۔ (۱) آپ مولانا ظفر احمد کے ہونہار اور لائق شاگردوں میں سے تھے، (۲) ان کی تفسیر قرآن ''معارف القرآن'' کے نام سے مشہور ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے بخاری شریف اور مشکوۃ شریف کی شروحات بھی کیں، جو بہت مقبول ہوئیں، خصوصاً مؤخر الذکر کی شرح ''التعلیق الصبیح'' عربی زبان میں سات جلدوں میں بے انتہاء مشہور ہے اور علمی حلقوں میں اہم مقام رکھتی ہے۔

ان کا انتقال مولانا کے انتقال سے کچھ ماہ قبل (جولائی ۷۴ء) میں ہوا، جس کا مولانا پر زبردست اثر ہوا، جس کی عکاسی درجِ ذیل مرثیہ سے ہوتی ہے۔ (۳)

مرثیہ کی ابتداء میں دنیا کی نعمتوں کے زوال اور ہر چیز کے فنا ہونے کا ذکر بڑے اچھے انداز سے کیا گیا ہے:

تبا لدنیا لا یدوم نعیمها ☆ و جمیع ما فیها لدینا فان

البتہ اس فانی دنیا میں علم وعمل کے پیکر (مولانا ادریس جیسے) کچھ حضرات ایسے بھی ہیں کہ جن کے اس فانی دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کا ذکر خیر باقی رہتا ہے، اور وہ بظاہر بھلے ہی دور چلے جاتے ہوں، لیکن فی الحقیقت وہ دور نہیں جاتے۔

اسی کے ساتھ مولانا اپنے شاگرد سے جو توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے کہ علومِ قرآن وحدیث میں ادریس صاحب مولانا کے خلیفہ بنیں گے، ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کے جنت کی طرف تیزی کے ساتھ چلے جانے اور ورثاء کو روتا بلکتا چھوڑنے کا شکوہ کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

ادریس لا تبعد فذکرك خالد ☆ و الذکر للانسان عمر ثان

قد کنتُ ارجو ان تکون خلیفة ☆ لدراسة الآثار و القرآن

لکن رحلتَ الی الجنان بسرعة ☆ و ترکت اهلك فی البکا لزمان

---

(۱) تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی/ مرتبہ: محمد میاں صدیقی/ مکتبہ عثمانیہ، لاہور/ جولائی ۷۷ء/ص:۱۵۔

(۲) تذکرۃ الظفر/ص:۱۵۰۔

(۳) تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی/ص:۳۵۲-۳۵۳۔

سچی بات یہ ہے کہ مولانا علوم کے دریا تھے اور عالم ربانی تو تھے ہی اس کے علاوہ آپ ظاہری حسن و جمال سے بھی آراستہ تھے، چودھویں رات کی چاند کے مانند تھے، اور عملی زندگی میں اس روشن ستارے کی مثل تھے جس سے شیطان کو مارا جاتا ہے۔ شیطان کو مارنے کی تشبیہ دے کر اس شعر کو ذو معنیین بنا دیا ہے:

قد كنت بحرا فی العلوم باسرها　　　و لانت حقا عالم ربانی

قد كنت بدرا للعباهب صاحبا　　　قد كنت نجما راجم الشيطان

قد كنت من اهل الصلاح نعم و من　　　اهل التقى فی السر و الاعلان

ان اوصافِ ظاہری و باطنی کے حامل اپنے اس عزیز ترین شاگرد کو دعاؤں سے نواز رہے ہیں کہ اللہ تعالی اس لائق شاگرد کے ساتھ عفو درگذر اور مغفرت کا معاملہ فرماتے ہوئے یومِ جزا میں اس جنت الفردوس کا وارث بنائے جو اللہ کے لطف و کرم اور فضل و عنایت سے متقیوں کے لئے مخصوص ہے اور مؤمنوں کے لئے ابدی سرمایہ ہے۔ اس دعاء میں مولانا نے مولانا ادریس صاحبؒ کو حصولِ جنت کی دعاء دی ہے۔ حصولِ جنت ہی ہر مؤمن کی آرزو و تمنا ہے:

فالله يورثك الجنان برحمة　　　و كرامة بالعفو و الغفران

فتكون وارث جنة الفردوس　　　يوم الجزا بالروح و الريحان

آخری شعر درود ہے۔ اس میں مولانا نے رسول اللہ ﷺ کی نسبت آپؐ کے قبیلہ بنی عدنان کی طرف کرتے ہوئے آپؐ کو تمام مخلوقات میں افضل ہونے کا شعری جامہ پہنایا ہے:

ثم الصلاة على النبی المصطفی ☆ خير الخلائق من بنی عدنان

اس طریقہ پر یہ مرثیہ اختتام کو پہونچتا ہے۔

مولانا کے جو مراثی دستیاب ہو سکے ہیں یا، وہ اس مقالہ میں پیش کئے جا چکے ہیں، اب بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایک طالب علمانہ نظر مولانا کی منظوم تقاریظ پر بھی ڈال لی جائے۔

چوتھی فصل: منظوم تقاریظ

یہ ایک عام دستور ہے کہ ماہرینِ فنون سے فنی شہ پاروں سے متعلق آراء طلب کی جاتی ہیں، تاکہ ان کے معیار کی بابت کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ علمی دنیا بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ علم حدیث سے مولانا کو خصوصی مناسبت ہونے کے باعث جب حدیث کی شروحات کا مشاہدہ مولانا کو کرایا جاتا تو مولانا اس پر اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے۔ بہت سی تصنیفات و تالیفات پر مولانا کے تبصرے اردو اور عربی میں محفوظ ہیں، لیکن بذل المجہود فی حل شرح ابی داؤد اور الکوکب الدری علی جامع الترمذی پر مولانا نے منظوم تقاریظ لکھ کر نہ صرف یہ کہ ان کتب اور ان کی شروحات سے اپنے خصوصی قلبی تعلق کا اظہار کیا، بلکہ ان کے شارحین کے تئیں بھی اپنی عقیدت، محبت اور خاص جذباتی لگاؤ کا اظہار کیا۔

جہاں تک ان شروحات کی علمی حیثیت کا تعلق ہے اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ بالا دونوں ہی کتب علم حدیث کی ایسی شروحات ہیں کہ جن کا معیار تا ہنوز بدستور قائم ہے، خصوصاً حنفی مسلک کے متبعین ان میں دیے ہوئے حنفی دلائل سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ مولانا نے اپنے پاکیزہ جذبات کا اظہار بہت خوبصورت منظوم تقاریظ کے ذریعہ کیا، جس میں کتاب کے اوصاف بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف، مؤلف اور شارح سبھی کو بہترین خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان تقاریظ کو بھی زندۂ جاوید بنا دیا۔ پیش ہیں دونوں تقاریظ۔

تقریظ بذل المجہود فی حل ما قال ابوداؤد

اللہ تعالیٰ نے علمِ حدیث کی جن کتب کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور احادیث کی معتبر ترین کتب ''صحاحِ ستہ'' میں جن کا شمار ہوا ان میں سے ایک امام ابوداؤد سجستانی (۸۱۷ء-۸۸۸ء/۲۰۲-۲۷۵ھ) کی مشہور و معروف کتاب ''سنن ابی داؤد'' علمی حلقوں میں کسی طرح محتاجِ تعارف نہیں۔ یہ کتاب آج تک علمی حلقے میں متداول ہے، اس کی شرح کا خیال مولانا ظفر احمد صاحب کے پیر و مرشد مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۱۸۵۲-۱۹۲۷ء/۱۲۶۹-۱۳۴۶ھ) کے دل میں پیدا ہوا تو انہوں نے تقریباً دس سال کی محنت کے بعد اس کی شرح مکمل کی، جو بذل المجہود فی حل ما قال ابوداؤد کے نام سے معروف ہوئی، یہ شرح ربیع الاول ۱۳۳۵ھ میں شروع ہوئی اور شعبان ۱۳۴۵ھ میں تکمیل کو پہونچی۔ [1] اس کی پہلی اشاعت ۱۳۴۶ھ میں عمل میں آئی۔ مولانا نے اس شرح کو ملاحظہ کیا تو اپنے جذبات کو اشعار میں پیش کیا۔ یہ منظوم تقریظ کتاب کے مقدمہ کے ساتھ شامل ہے۔ [2] جو چونتیس اشعار پر مشتمل ہے، اس کی ابتداء اس قلبی کیفیت سے ہوتی ہے جو خوشی کی وجہ سے ناقابلِ بیان ہے:

یا قلب مالك طائرا بسرور ☆ مالی اراك كميت منثور

اس کے بعد اس خوشی پر استفہامی حالت پیدا کر کے عرصۂ دراز کے بعد محبوبہ کے دیدار سے تعبیر کر رہے ہیں:

ما بال وجهك مشرقا متهللا ☆ ارأيت وجه سعاد بعد دهور

اور وہ محبوبہ بھی ایسی کہ جو سرتاپا خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ ہے:

حورية رمت الرقاب بلحظها ☆ سبت القلوب بشعرها المضفور

پھر اس کی تشبیہ مختلف نادر تشبیہات سے اس طرح دے رہے ہیں:

ام هل مررت على منازلها التى ☆ شاقتك من بين الذرى و الدور
ام هل وصلت الى سرادق عزها ☆ او شمت برق جمالها المستور
او مر طيف خيالها بك موبنا ☆ ام ارسلت من عندها ببشير

---

(۱) تذکرۃ الخلیل/ص:۲۷۶۔

(۲) ملاحظہ کیجئے: بذل المجہود فی حل ما قال ابوداؤد/مولانا خلیل احمد سہارنپوری/مکتبہ رشیدیہ، سہارنپور ۱۳۹۶ھ/مقدماتی صفحہ:۴۔

اس خوشی کے اظہار اور اس کیفیت مسرت کو ظاہر کرنے کے ساتھ مولانا کی توجہ نعت کی طرف مبذول ہوئی اور نہایت مناسب موقع پر کچھ نعتیہ اشعار چسپاں کردئے:[1]

ما للظلام تبدلت بالنور	ما للزمان اتی بکل حبور
دع عنك ذکر سعاد و الزمن الذی	منی مضی فی حب ذات خدود
انی اطلعت علی معالم طیبة	و شممت ریح جنابها المعطیر

نعتِ رسولؐ کے ساتھ ہی کلام رسول (احادیث مبارکہ) سے متعلق سنن ابی داؤد کی شرح (بذل المجہود) کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کلام (کلامِ رسول) کی شانِ مبارک میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

لما رأیت من الحدیث مؤلفا	کالبدر یطلع من سهارنبور
خیر الکلام کلام احمد بعدما	اوحی الاله بنظمه فی السور

کلامِ الٰہی کے بعد کلام نبوت ہی کو درجۂ فضیلت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام نبوت کے سلسلے میں جو خدمت بھی انجام دی جائے وہ باعثِ ثواب ہے۔ مولانا نے درجِ ذیل اشعار میں ان پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے:

طوبی لحفاظ الحدیث و اهله	و الناظمین لدره المنثور
و الناقدین سلیمه و سقیمه	و النابذین لمفتری بالزور
و الناقلین صحاحه و حسانه	و لما تواتر منه و المشهور
و العاملین به لفقه صائب	تبعا لمجتهد بذاك خبیر

یہ کام (تالیف بذل المجہود) کتنا مبارک ہے، اس کی تشبیہ مولانا نے سورۂ یوسف کی آیت ﴿فلما ان جاء البشیر القه علی وجهه فارتد بصیرا﴾[2] سے مستعار لے کر بہت خوبصورت انداز سے اس طرح دی ہے:

طوبی فقد جاء البشیر لوجهکم ☆ بقیص یوسف فائحا بعبیر

اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری (مؤلف بذل المجہود) کی تعریف میں چند اشعار اس طرح کہے گئے ہیں:

---

(۱) ملاحظہ کیجئے گذرے ہوئے صفحات میں مولانا ظفر صاحب کا نعتیہ قصیدہ ''وسیلۃ الظفر''۔

(۲) القرآن الکریم: ۱۲: ۹۳۔

مــولای سیــدنــا الــخلیـل الـمقتـدی	غــوث الــزمـــان بــکــل یــوم ثبــور
زاکــی الــنــجـار و سلالة الانــصــار[1]	حــلــو الشـمــائـل جــابـر الـمکسـور
بـحـر الـنـدی، عـلـم الهدی، بطل الوغی	یــمــحــو الــضــلال بـصــارم مشهـور
کشــاف مــعــضـلة الـعـلـوم بـأسـرهـا	شیــخ الــوری حــلال کــل عسیـــر
مبـــعـــوث رب الــعـــالــمیـــن هــدایة	لاولــی الــضــلال بسعیـه الـمشـکـور
و بـــمـــا حبـــاه کـــرامة مـــن عـنـده	تـــاج الــولایة و التــقـــی و الـــنــور
و بـــآیة لاحـــت لأربـــاب الــحـجـی	فـــی ذاتـــه و الـــنــطــق و التـحـریــر
قـد اسـمـعـت کـلـمـاتـه صم الهوی	و بــوجهـــه انــفـتـحـت عیـون الـعـور
رَوِی الانـــام بـــفیـضـــه متـواتـــرا	بــلــغ الــعــلـــی بــجـهــاده الـمبـــرور

مولانا خلیل احمد کے اوصاف حمیدہ کو ذکر کرنے کے بعد شرح ابوداؤد (بذل المجہود) اور اس تالیف کے ذریعہ مسلک حنفی کو جو تقویت ملی اس کا ذکر ہے۔ اس کو مولانا نے ایک خوبصورت دوشیزہ کے گلے میں پڑے ہوئے بیش قیمت خوبصورت ہار سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح وہ ہار اس کے حسن کو دوبالا کئے ہوئے ہے اسی طرح اس شرح نے اصل کتاب کے حسن میں اضافہ کر کے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے:

امـلـی لـنـا شـرحـا عـلـی سنن ابی	داؤد مثـــل قـــلاد ة لـــلـحـــور
فتـــلألأت انـــوار ســـنة احـمـــد	مـــنهـــا نـــعـــم واشــعة الـتـفسیـــر
ابـدت سـرائـر کـان اخفـاهـا الاوا	ئـل فـی الشـروح بـاحسن التصویر
شـرحـت احـادیـث الرسول بنصرة	لا بــحـنیفة ذی الـعـلـی و الـخیـر
جـعـلــت وجـوه مـقـلـدیـه منیـرة	و طلست وجوه اولی الهوی بالقیر
واهـــا لـــه مـن بـذل مـجهـود اتـی	بیـن الشـروح کـنسـمة فـی الصور

مصنف، مؤلف، تالیف، شرح اور شارح سبھی کی خصوصیات کی طرف مولانا نے اپنی منظوم تقریظ میں اشارات کئے ہیں۔ تقریظ کا اختتامیہ سرورِ کائنات ﷺ سے جڑا ہے۔ مولانا کی اس عقیدت رسول کا منظر نامہ ملاحظہ فرمائیے:

---

(۱) مولانا خلیل احمد صاحبؒ حضرت ابوایوب انصاریؓ کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جو مختلف مقامات سے گذر کر انبہٹہ، ضلع سہارنپور میں آباد ہو گیا تھا۔ اس شعر میں اسی نسبت کی طرف اشارہ ہے۔

منہا الحیاۃ لکل حق میت　　　منہا الممات لکل قول زور

فیہا البیاض لکل قلب اسود　　　فیہا السواد لکل عین ضریر

آخری شعر میں بذل المجہود کی اشاعت اول کے سن کی تخریج ''ہو خیر تالیف'' سے (۱۳۴۶ھ) برآمد کرنے کے ساتھ اپنا تخلص (ظریفؔ) بھی لے آئے ہیں:

قال الظریف لعام اول طبعہ　　　"ھو خیر تالیف" من المنصور

۱۳۴۶ھ

تقریظ الکوکب الدری علی جامع الترمذی

صحاحِ ستہ کی مشہور و معروف کتاب الجامع الترمذی ، ابوعیسی محمد بن عیسی بن سکورہ بن موسی بن ضحاک (۲۰۹-۲۷۹ھ/۸۲۴-۸۹۲ء) کی وہ مایہ ناز علمی تالیف ہے کہ جسکی استناد پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اور ابتداء سے ہی وہ علمی حلقوں کی پسندیدگی اور توجہ کا مرکز رہی ہے۔ ہر دور میں اس کے علمی نکات تمام علمی طبقوں میں زیرِ بحث رہے۔ ہر مکتب فکر نے اس کی احادیث کو اپنے اپنے پیمانے سے جانچا ہے، اور ان کو صحیح گردانا ہے، اسی کی ایک شرح ''کوکب الدری علی جامع الترمذی'' کے نام سے معروف ہے۔ دراصل یہ کتاب قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی کی وہ تقریر ہے جو وہ اس کتاب کو پڑھاتے وقت کیا کرتے تھے۔ اسی کو ان کے مشہور شاگرد مولانا یحیی کاندھلویؒ (والدِ ماجد مولانا محمد زکریا صاحبؒ) نے دورانِ درس قلم بند کر لیا تھا، پھر بعد میں اس پر اضافات بھی کئے، لیکن کسی وجہ سے ان کی زندگی میں یہ کام مکمل نہیں ہوسکا، بعد میں ان کے صاحب زادے مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ''پدر نہ کند پسر تمام کند'' کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے اس پر مزید حواشی لگا کر اسے خوبصورت انداز سے مزین کیا، اور ''الکوکب الدری علی جامع الترمذی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ جب یہ کتاب مولانا ظفر احمد صاحب نے ملاحظہ کی تو اس پر فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جو کتاب، شارح کتاب اور حاشیہ نگار کی شان میں بلند پایہ بائیس اشعار پر مشتمل ہے۔(۱)

تقریظ کی ابتداء بطورِ تشبیب کی گئی ہے۔ اس کی منظر نگاری بڑے خوبصورت انداز سے اس طرح کی ہے جیسے سہانا وقت ہو، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے ہوں، صبح کی پو پھٹنے کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہو، اس سے خوش گوار منظر پیدا ہوتا ہے، طبیعت میں بشاشت پیدا ہوتی ہے، مسرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی علمی حلقوں میں الکوکب الدری کے آنے سے یہی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، اس کا اظہار ابتدائی اشعار میں اس طرح کیا گیا ہے:

زال الظلام و لاحت الانوار	و تنفست بنسیمها الاسحار
و تبخترت ریح الصبا بذیولها	فتمایلت بغصونها الاشجار
و الکوکب الدری زان بلادنا	فتلألات بجماله الاقطار

یہ تالیف فی الحقیقت مولانا رشید احمد گنگوہی کی تقریر ہے، جس کو مولانا یحیی صاحب اور ان کے صاحب زادے مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنی شرح سے مزین کیا تو اس کی تشبیہ اس بہشت سے دی گئی ہے جس کے نیچے نہریں جاری ہیں:

کلم الرشید بشرح یحیی و ابنه	جنات عدن تحتها الانهار

(۱) ملاحظہ کیجئے: فہرست تالیفات شیخ / سید محمد شاہد / مکتبہ یادگار شیخ، سہارنپور ۱۴۱۷ھ - ۱۹۹۷ء / ج:۳، ص:۲۸۲۔

اس شرح کی وجہ سے بلبلیں چہچہا رہی ہیں اور اس کی تعریف میں نغمہ سرا ہیں، پھول خوشبوؤں میں بس گئے ہیں، ہوا اٹھلا کر چل رہی ہے، پرندے خوشی سے باغوں میں اتراتے پھر رہے ہیں:

سجعت عنادلها يطيب ثنائه و تعطرت بعبيره الازهار

والريح تعبث بالغصون و غرورت بـرياضها فرحا بـه الاطيار

پھر ان تشبیہات میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ تمہاری اس کوکب نے ستاروں میں لکنت پیدا کردی ہے، یعنی ان کی چمک اس چمک کے سامنے ماند پڑ گئی ہے، اور اس نے حاسدین ومخالفین کے سینوں میں آگ بھڑکا دی ہے:

يا كوكبا كم قد حضرمت كواكبا ☆ قد قادها اهل الهوى الاشرار

پھر حاسدین اور مخالفین پر اس تالیف سے کیا گذری؟ انہیں کس قدر ذلت و رسوائی کا سامنا ہوا، اور اس کی مقبولیت سے ان کو مخالفت، حیرت واستعجاب اور شرمندگی وندامت کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ وہ لوگ اس میدان میں بزعمِ خود اپنے سے بڑا کسی کو تصور نہیں کرتے تھے، اس کی علمیت اور شارحین کی عالمیت نے ان پر یہ حقیقت واضح کردی کہ وہ اصل میں کچھ بھی نہیں تھے:

اخزيت من زعم الحديث شحيمة نكسوا الرؤس و سُكّرت ابصار

فسبقتهم و تخلفوا و تحيروا رجعوا و زادهم الخنا و العار

اس کے بعد مولانا نے اپنی عقیدت کا اظہار قسم کھا کر اس طرح کیا ہے کہ آپ (شارح یا حاشیہ نگار) ستاروں سے زیادہ روشن ہیں، کیوں کہ ستاروں کی چمک وقتی ہے اور اصحابِ علم وفضل کی تابنا کی دائمی ہے، ان کے بعد ان کے علم و فضل کا نور دنیا کو روشن کرتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ علمی کام ایسا ہے کہ جس نے طالبینِ علومِ نبوت، اہلِ روایت اور اہلِ درایت سبھی کی خدمت کا حق ادا کیا ہے۔ اور اگر اس کو ایسے عمل سے تشبیہ دی جائے جو میدانِ جنگ کے مشابہ ہو تو اس میدان میں بھی یہ کام دشمنانِ دین کے لئے سخت ترین ہے۔ یہ کتاب حاسدین کے لئے سیفِ براں سے بھی زیادہ کارگر ہے۔ زندیقی، منکرینِ حدیث اور دشمنانِ اسلام کیلئے یہ کتاب مسکت جواب کے مانند ہے، اس کی وجہ سے ان کی چولیں ہل گئیں اور انہیں کوئی جائے فرار نہ مل سکی:

قسما بوجهك انت اضوء كوكب قد يهتدى بضيائه الاحبار

اهـــل الـــروايةو الــدراية جـمــلةً ٭ و الـطـــالبـــون سبـــابك الــزوار

ابشـر فـــانك يـــا يـحيى ابن عــامل ٭ بـــالـقـول مـــا لـم يـعـمـل البتـــار

مـــا لـلهـوى و لاهـلــه متـحـصـن ٭ مـــن بــرق سيـفـك ابهـــارالـكـرار

عـلـم التــزنـدق نـاكـس متـزلـزلا ٭ بـنهيـب رعـدك ايهـــا الـعكـــار

فتـمــزقـوا ايـدى سبـــا و تهدمت ٭ اركــــان حــديـثٍ مـــا لهـن قـرار

اس طریقہ پر آپ حضرات نے علومِ نبویہ کے وہ معارف بیان کئے، وہ باریک نکتے بیان کئے کہ جن پر عام آدمی کی نظر نہیں پڑتی تھی۔ آپ حضرات کی کوششوں سے درخشاں نظر آنے لگے اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا کہ آپ نے ان علوم کو پہاڑ کی ان بلندیوں پر پہونچانے میں مدد کی جہاں مخالفینِ اسلام اور حق سے برسرِ پیکار گروہ پہونچ کر حملہ کرنا چاہے گا تو وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پائے گا:

و عـلـوت مـن جبل المعارف ذروة ☆ لا يـــرتـقيهـــا عسكـــر جـــرار

اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ آپ کا ان علوم کی تشریح کا جو انداز ہے، اور سنتِ نبوی کو جس فصیح و بلیغ طریقہ پر آپ نے بیان کیا ہے، اس نے نہ صرف یہ کہ شہروں اور ملکوں ہی کو کسی متعینہ مدت کے لئے متاثر کیا، بلکہ یہ کام رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے گا۔ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کریں گی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اس کام پر علماء، صلحاء، فقہاء اور اولیاء و غیرہم نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا:

بـاهـت بـمنطقك الفصيح مجالس ٭ و مــدارس و اكـــابـــر و صـغـــار

بـاحـت بـمدحك السُّنن و الضمائر ٭ و عـلــت بك البـلـدان و الاعـصـار

فـرحـت بك الـعلماء و الصلحاء وا ٭ لـفـقـهـــاء و الـفـقـراء و الابـرار

اسی کے ساتھ مؤلف کتاب کو اللہ کی پناہ میں اور ان کی بلندئ درجات کی دعا ربِّ کریم سے اس طرح کی گئی ہے:

لا زلـت فـى كـنف الالــه و لم تزل ☆ تــرقــى الـمـعــارج مـا اضـاء نـهـار

اس کے بعد پیغمبرِ آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ، ان کے جاں نثار ساتھیوں اور اہلِ بیت کے لئے درود و سلام کے تحفہ کے ساتھ کے ساتھ تقریظ پوری ہو جاتی ہے:

ثـم الـصلا ة عـلــى الـنبـى محمد ٭ روح الـعـوالـم سيـد الـمـختــار

و عـلــى صـحـابتـه الكـرام و آلـه ٭ مــــا دار هـــذا الازرق الــدوار

پانچویں فصل: مولانا ظفر احمد کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

مولانا ظفر احمد عثمانی کی عربی شاعری کے جو نمونے ہم نے گذشتہ صفحات میں پیش کئے ہیں، ان کے مطابق ہم مولانا کی شاعری کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(الف) نعتیہ قصائد　　(ب) شخصی مدائح　　(ج) مراثی　　(د) تقاریظ

جہاں تک ان کی نعتیہ شاعری کا تعلق ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ان کی شاعری کا یہ حصہ نہایت شستہ وشائستہ، پاکیزہ خیالات اور حبِ رسولؐ سے سرشار جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس میں جہاں مولانا نے اپنی جذباتی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا ہے، وہیں اسے عبادت سمجھ کر اپنے خیالات کو نظم کیا ہے۔ وہ ﴿و من یطع الرسول فقد اطاع الله﴾[1] کی قرآنی تعلیم پر پوری طرح عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ شخصی مدائح میں بھی انہوں نے انہیں حضرات کی شان میں قصائد کہے ہیں جو دنیوی دولت وجاہ وحشمت سے کوسوں دور علم وعمل کی دنیا میں اپنا مقام بنائے ہوئے تھے، اور مخلوقِ خدا کو مسلسل فیض پہونچا رہے تھے۔ تقاریظ ان کتابوں پر لکھی ہیں جو کلام رسولؐ کی تشریح وتعبیر اور ان میں آپسی تطبیق کے لئے لکھی گئیں، مراثی میں دو مرثیوں کو چھوڑ کر (اہلیہ اور صاحب زادی) باقی تمام مراثی علماءِ عصر اور رشد وہدایت کے منبع سمجھے جانے والے حضرات کے متعلق نظم کئے۔ اہلیہ اور صاحب زادی کے مراثی میں بھی ان کے ان اوصاف کو اجاگر کیا جن سے عمل کی تلقین ہوتی ہے، حالانکہ ان کا اپنی اہلیہ کی یاد میں کہا گیا مرثیہ جذباتی لگاؤ کا اظہار ہے اور اس میں حسن وعشق کے وہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جو غزلیہ شاعری کے ضمن میں چلے جاتے ہیں، الفاظ کا زیر وبم اور ان کا مناسب جگہوں پر انطباق ایسی خصوصیات ہیں جن سے اس مرثیہ کی نوعیت جداگانہ ہے، تاہم اس میں بھی انہوں نے ان کے دینی جذبہ، وفا شعاری، دینداری اور خصوصاً ان کی اسلام پسندی کو جس طرح ابھارا ہے ان سب سے مولانا کی فکری صلاحیت واصابت کا پتہ چلتا ہے۔

ان تمام معروضات کی بنا پر ہم مولانا کو صحیح العقیدہ اسلامی افکار کا علم بردار شاعر قرار دے سکتے ہیں، اس لئے مولانا کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ نکتہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ اسی تناظر میں ہم مولانا کی شاعری کا جائزہ لیں گے۔

نعتیہ شاعری

مولانا کی نعتیہ شاعری کے ضمن میں تین قصائد اور کچھ متفرق اشعار گذشتہ صفحات میں پیش کئے گئے ہیں، جن سے اندازہ ہوا کہ مولانا نے شعر وسخن کی اس سب سے متبرک صنف میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے اور انہی روایات سے

---

(۱) القرآن الکریم: ۴: ۸۰۔

استفادہ کیا ہے جو بہر طور معتبر ہیں۔قرآن کریم کی آیات سے مولانا نے اپنے اقلیمِ سخن کو جس طرح سنوارا ہے وہ مولانا ہی کا حصہ ہے۔

سب سے زیادہ دل چسپ یہ ہے کہ قرآنی آیات اور ارشاداتِ رسولؐ کو اپنے اشعار میں بایں طور پیش کیا ہے کہ وہ چیزیں ضرورتِ شعری معلوم ہونے لگتی ہیں۔"نور علی نور" کے دو قصائد میں حضورِ اکرم ﷺ کی مکی زندگی اور معجزات صادقہ کی جھلک موجود ہے تو "وسیلۃ الظفر" میں آپؐ کی مدنی زندگی، غزوات، فتوحات، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر آپؐ کی اخلاقی تعلیمات کے اثرات، ان کا جذبۂ حبِ رسولؐ، حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کے ذیلی تذکرے، عشرۂ مبشرہ کو خراجِ عقیدت وہ مضامین ہیں جن کو مولانا نے بطورِ خاص پیش کیا ہے۔

قرآنی اثرات

مولانا کی نعتیہ شاعری کا خصوصی وصف قرآن کریم پر ماہرانہ نظر اور اس سے اپنی شاعری کو زینت بخشنا ہے۔انہوں نے قرآن کریم کے متعدد الفاظ اور آیات کو جس طرح نظم کیا وہ مولانا کی قرآن فہمی اور ان آیات کے مناظر و پسِ مناظر پر مولانا کے عبور رکھنے کی دلیل ہے۔اس سے جہاں مولانا کی قرآنی فہم و بصیرت اور اس کے معانی و تفسیر سے بلا تکلف اخذ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں ان کی ذہانت و فطانت کا اندازہ کرنا بھی چنداں مشکل نہیں ہے۔اس کے نمونے ان کی شاعری میں جا بجا موجود ہیں، مثلاً:

و نادی شقی القوم تبا لمن دعا   فتبت یداہ فی لهيب مسعر (۱)

اسی طریقہ پر جب انہوں نے واقعۂ معراج کو نظم کیا تو ایک ہی شعر میں اس پوری کیفیت کو اس طرح نظم کیا:

قد خصك الله بالاسراء ليلة اذ   ترقى السماوات من طبق الى طبق (۲)

مولانا کے نعتیہ قصائد میں اس قسم کے سینکڑوں اشعار ہیں، جنکا موضوع قرآن پاک ہے ان کا تفصیلی تذکرہ گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

احادیث نبوی کے اثرات

قرآن حکیم کے بعد ہر مومن و مسلم کے لئے سب سے زیادہ بھروسہ مند سرمایہ وہ احادیث رسولؐ ہیں، جن کی صحت کو جانچنے پرکھنے اور بالکل صحیح طریقہ پر امت تک پہونچانے کے لئے محدثین نے اپنی عمریں لگا دیں اور ہر ہر حدیث کے تمام

(۱) القرآن الکریم: ۱۱۱ : ۱ ، (ابولہب کے ذریعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغ کرنے پر جب سب وشتم کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی، اس شعر میں اس واقعہ کے منظر و پس منظر کو قرآنی اشارہ میں سمو دیا گیا ہے۔

(۲) القرآن الکریم: ۸۴: ۱۹ ۔

راویوں کے تقدس کو جانچا، پرکھا اور جہاں بھی جھول نظر آیا بلا تکلف اس راوی کی روایت کو نا قابلِ قبول قرار دیدیا۔ لہذا احادیث کا یہ ذخیرہ خصوصاً صحاحِ ستہ مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کے بعد سب سے مستند ذخیرہ ہے۔ مولانا علومِ قرآنیہ کے ساتھ ساتھ علومِ احادیث سے بہرہ ور تھے (جس کا ثبوت ان کی معروف کتاب اعلاء السنن ہے)۔ اسی لئے ان کی شاعری میں قرآن پاک کے ساتھ ساتھ معتبر احادیث کے اشارے ملتے ہیں، مثلاً مولانا کا مندرجہ ذیل شعر:

لو ساوت الدنيا جناح بعوضة ☆ عند الاله لمات كل كفور [۱]

اس حدیث مبارک کی طرف اشارہ ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا: ''لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة''۔ [۲]

سیرت نگاری

ان کی نعتیہ شاعری کا ایک خصوصی وصف رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ کا احاطہ ہے، جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ مولانا نے اپنی شاعری میں آں حضرت ﷺ کی مکی و مدنی زندگی کے پہلوؤں کا کافی حد تک احاطہ کیا ہے۔ اگر ان کے دونوں نعتیہ قصائد (نورعلی نوراور وسیلۃ الظفر) کو یکجا کر دیا جائے تو پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ منظوم شکل میں سامنے آجاتی ہے، جس میں اختصار تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اس کی جامعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نورعلی نور میں آپ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مکہ کے جو حالات تھے انکو بیشتر نظم کیا ہے، جب کہ وسیلۃ الظفر میں آپؐ کی بعثت سے پہلے جو جہالت اور تاریکی کا ماحول تھا اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپؐ کی آمد سے وہ تاریکی جس انداز سے چھٹی اور روشنی نمودار ہوئی اس کو مرکزی موضوع بنا کر مدنی زندگی کی بڑی خوبصورت تصویرکشی کی ہے۔ آپؐ کے معجزات مبارکہ کو جس طرح مولانا نے نظم کیا ہے وہ آپ کی شعری مہارت کی دلیل ہے، مثلاً معجزۂ شق القمر کے بارے میں آپ کا مندرجۂ ذیل شعر:

باصبع من يد كانت اشارتها   فی البدر انكى من الصمصام فی العنق [۳]

معجزاتِ مصدقہ آپ کی سیرت مبارکہ کا جزو لازم ہیں، اسی لئے مولانا نے اکثر و بیشتر معجزات کو موقع و محل کی مناسبت سے بڑے ہی جامع اور دلکش انداز میں نظم کیا ہے، جس نے ان قصائد کو اہم بنا دیا ہے۔

---

(۱) وسیلۃ الظفر/ص:۳۔

(۲) معارف الحدیث/مرتبہ: منظور نعمانی/مطبوعہ: الفرقان بک ڈپو لکھنو ۱۹۵۸ء/ص:۲۶۶/۲۔

(۳) نورعلی نور/ص:۹۔

تاریخ نگاری

مولانا نے اپنی شاعری میں بہت سے تاریخی واقعات کو تلمیحی انداز میں نظم کیا ہے، جس سے ان کی تاریخ پر وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ اسے نظم کرنے کی صلاحیتوں کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ واقعہ جس میں انہوں نے اپنے والد کی بصارت واپس آنیکے کے لئے اپنا کرتا بطورِ علاج بھیجا تھا۔ تاریخ کے صفحات پر قرآن کی سچائی کے ساتھ محفوظ ہے۔ اس واقعہ کو مولانا نے اپنے نعتیہ اشعار میں محبت بھرے انداز میں اس طرح نظم کیا ہے:

جـاء البشير فـرد اللـه لي بصري — لـمـا اتـى بـقـميص فـائح عبق

فـالحـمـد لـلـه ان لـم ياتني اجلي — حتى لبست لباسا زاد كل نقي (۱)

مدحتِ صحابہ

رسول اللہ ﷺ کے ذکرِ مبارک کے ساتھ ساتھ آپ نے ان کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی تعریف وتوصیف بھی اپنے نعتیہ اشعار میں شخصی واجتماعی طور پر کی ہے خلفاء اربعہ، عشرہ مبشرہ کے تذکرے انفرادی طور پر بطورِ خاص منظوم ہیں، لیکن اجتماعی طور پر تمام صحابہ کرام کو دو اشعار میں جس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس نے قصیدے کو چار چاند لگادئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

اولـئك خيـر الـنـاس بـعـد نبيهـم — و مـن يـعـتـصـم بـالله يسعد و يظفر

اولـئك اصـحــاب النبـي و حـزبـه — كـفاهم به فخرا على كل مفخر (۲)

درود وسلام کا التزام

مولانا کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے خواہ کسی بھی صنف میں اپنے خیالات نظم کئے ہوں، لیکن اس کا اختتام عام طور پر رسول اللہ ﷺ، ان کے اہل بیت، جاں نثار صحابۂ کرامؓ اور صالحین امت پر درود وسلام سے کرتے ہیں، جس سے مولانا کے حبِ رسول وصحابۂ کرام کی محبت کے ساتھ ساتھ جملہ اہل حق مؤمنین ومسلمین سے محبت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نعتیہ شاعری ہو یا شخصی مدائح، تقاریظ ہوں یا مراثی سبھی جگہ مولانا نے درود وسلام کا التزام کیا ہے۔

الغرض مولانا کی نعتیہ شاعری ہم جس لحاظ سے بھی دیکھتے ہیں وہ ایک کامیاب شاعری ہے، جس میں متنوع مضامین، جدت آفرینی، ندرت کلامی، صوتی ہم آہنگی، الفاظ کی شان وشوکت اور معنوی حسن وصوری خوبیاں سبھی کچھ ہیں اس

---

(۱) نور علی نور/ص:٦ ۔

(۲) ایضاً ۔

سے مولانا کی قادرالکلامی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور وسعتِ مطالعہ کا بھی، وہ یقینی طور پر ایک عمدہ نعت گو شاعر ہیں، جنہیں رسول اللہ ﷺ سے والہانہ تعلق بھی ہے اور بے پناہ عقیدت بھی، احادیثِ نبویہ سے اخذ مفاہیم کی قدرت بھی ہے اور فہمِ قرآنی کی صلاحیت بھی، اس روشنی میں جب ہم ان کے نعتیہ قصائد کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں، جو حبِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ مدحِ صحابہ کے بحر بیکراں میں بھی موجزن ہیں، اس طریقہ پر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی عربی نعتیہ شاعری ہندی النسل شعراء میں بہترین شاعری ہے، جس پر اہالیانِ ہند کو ناز ہے۔

شخصی مدائح

مولانا اپنی زندگی میں جن شخصیات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، ان کی تعریف و تحسین کے لئے بھی انہوں نے عربی نظم کا سہارا لیا۔ ظاہر ہے کہ ان میں ان کے مربی و مرشد مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی سب سے اول ہے۔ علاوہ ازیں مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے انہیں خصوصی عقیدت تھی، ان کے سفرِ مدینہ منورہ پر مولانا نے اپنے جذبات کو شعر کا قالب عطا کیا۔ ایسے ہی نواب صادق علی صاحب کے مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور تشریف آوری پر ان کا استقبال منظوم خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا، ابوظہبی کے قاضی القضاۃ شیخ زائد کے ٹنڈو الہیار تشریف آوری پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک قطعۂ اراضی قبرستان کے لئے وقف کرنے پر اپنے خیالات نظم کئے (جن کا تفصیلی تذکرہ گذشتہ صفحات میں آچکا ہے)۔

مولانا نے ان قصائد میں جن چیزوں کو مرکزی موضوع بنایا ہے وہ موقع و مناسبت کے لحاظ سے ہر قصیدہ میں مختلف ہیں، تاہم مجموعی طور پر جو تاثر ابھرتا ہے وہ مولانا کی بزرگوں کے تئیں عقیدت و محبت اور خوفِ خدا و خشیت کی زیادتی ہے، جس کی وجہ سے کہیں کہیں ان اشعار میں مبالغہ بھی ہے جو اسلامی شاعری سے ہم آہنگ نہیں، لیکن ان کی شاعرانہ تخلیقی صلاحیتوں کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ خاص طور پر نواب صادق علی کی سہارنپور مدرسہ آمد پر مولانا نے جو قصیدہ پیش کیا وہ عربی ادب میں ہندوستانی شعراء کی اعلیٰ ادبی کاوشوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس قصیدہ میں مولانا اپنی عام روش سے ہٹ کر ممدوح کی تشریف آوری پر جو منظر کشی کی ہے، اس میں پورے طور سے غزلیہ انداز نمایاں ہے، اس کے مندرجہ ذیل اشعار بطورِ خاص قابلِ داد ہیں:

جاء الامیر ففاحت الازهار	و تعطرت لشمیمه الاقطار
لبست ریاض العلم ثوب بهائها	و تغردت طربابها الاطیار [(۱)]

یہ طرز مولانا کی شاعری میں جداگانہ اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ عام طور پر ان کی شاعری اپنے ممدوح کی تعریف میں اس طرح رطب اللسان نہیں ہوتی، وہ یا تو اپنے ممدوح کی بزرگی و پارسائی کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں یا پھر پند و

---

(۱) روداد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور/۱۳۲۹ھ/ص:۷۔

نصائح کے دفتر کھول دیتے ہیں۔لیکن اس قصیدہ میں انہوں نے حسن وعشق، پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کا کھلنا،نسیمِ صبح گاہی اور پھر اس سے پیدا ہونے والی طبیعت کی جولانی کو جتنے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ مولانا کی ابتدائے جوانی کی شاعری کا نمونہ ہے، جب کہ مولانا کی عمر بیس سال سے بھی کم رہی ہوگی،عنفوانِ شباب کی شاعری میں اس رنگ کا آنا فطری ہے۔بہرحال اس سے اتنا تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا کی شاعری صوفیانہ وزاہدانہ خشکی ہی نہیں لئے ہوئے تھی، بلکہ وہ حسن وعشق کی رنگینیوں کو بھی نظم بند کرنے پر قادر تھے۔

پند ونصائح

مولانا کی شاعری کا دوسرا اہم پہلو نصیحت کے مواقع تلاش کرنا ہے،انہوں نے جب مناسب موقع دیکھا تو اس فرض کو ادا کیا۔اس طریقہ پر وہ تبلیغ وتذکیر کا دینی فریضہ بھی ادا کردیتے ہیں اور شعری ضروریات بھی۔مثلاً مولانا تھانویؒ کے قبرستان کے لئے ایک قطعۂ اراضی وقف کرنے پر انہوں نے جو قصیدہ کہا ہے اس میں انہوں نے موت کی گرفت سے بے خبر انسانوں کو تلقین کرتے ہوئے بہت عمدہ نصیحت اس طرح نظم کی ہے:

یا غافلا بلذة العیش المعجل   ابصر فتلك عم قلیل تدمر

کل امرئ یرید بقاه و انما   و انلـه ان ذاك خیال یصور

یہ مولانا کی شاعری کی وہ خوبیاں ہیں جو ظاہر و باہر ہیں۔علاوہ ازیں ان کی شاعری باطنی خوبیوں سے بھی مالامال ہے۔

مولانا کی شاعری کے نقائص

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مولانا ایک انسان تھے،اور انسان ''مرکب خطأ ونسیان'' ہے۔کسی بھی ادیب،شاعر،یا مصنف کا کوئی ادبی شہ کار ایسا نہیں ہے کہ جو صرف خوبیوں کا مرقع ہو، ناقدینِ ادب نے جب بھی ان کو کسوٹی پر رکھا تو ایسے جھول نظر آئے کہ جو عوام الناس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ایسے ہی جب مولانا کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعری صاف ستھری اور پاکیزہ ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی رکھتی ہے، جن کی صحیح گرفت ہم جیسے مبتدئین کیلئے بڑا دشوار گزار مرحلہ ہے،لیکن کچھ نقائص ایسے ہیں جو نمایاں ہیں۔بہتر ہے کہ ایک سرسری نظر ان پر بھی ڈال لی جائے۔

مولانا کے شعری سرمایے میں عربوں کی عام شعری روایت سے ہٹ کر کچھ ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جنہیں محاسن کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاتا،مثلاً:

عجمی اثرات

تخریج سنین کے لئے مصرعوں کو موزوں کرنا اگرچہ عمر کو محفوظ کر دیتا ہے اور یہ عربی شعر گوئی میں خوش گوار اضافہ ہے، تا ہم یہ شعر گوئی کا عجمی انداز ہے۔ مولانا کے یہاں اس کے نمونے خاصے ملتے ہیں، مثلاً مولانا اشرف علی تھانویؒ کے قطعۂ اراضی برائے قبرستان وقف کرنے پر مولانا نے جو قصیدہ کہا اس میں ایک شعر یہ بھی ہے:

ان یسئلوك این ریاحین طیبة ☆ قل "اشرف المقابر نجم منور" (۱)

۱۳۴۴ھ

ایسے ہی بذل المجہود کی تقریظ میں مولانا نے اس کے سنِ طباعت کی تخریج اس طرح کی ہے:

قال الظریف لعام اول طبعه ☆ "هو خیر تالیف" من المنصور (۲)

یا اسی طرح اپنی صاحب زادی کے سانحۂ ارتحال پر مولانا نے جو مرثیہ کہا اس کے تخریج سن میں مولانا نے خود اس کے عجمی ہونے کا اعتراف کیا:

عام وفاة "حبیب سبحان اختری" ☆ بالفارسی مؤرخ مقبول (۳)

مذکورہ بالا مثالوں کے علاوہ بہت سی مثالیں صوری و معنوی بھی ہیں جنہیں طوالت کے خوف سے نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مولانا کو عربی شعر گوئی میں کمال حاصل تھا، پھر بھی وہ اپنی عجمیت کو چھپانے پر قادر نہیں تھے، ایسا صرف مولانا ہی کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کے بیشتر، بلکہ تقریباً سبھی شعراء کے یہاں اس قسم کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان عربی نہ ہونے کے باعث خیالات و افکار کی بندش میں عجمی رنگ آ جاتا ہے۔

مبالغہ

مولانا کی شاعری کا ایک نقص یہ ہے کہ ممدوح کی تعریف میں حد سے زیادہ رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ نعت میں تو یہ چیز بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا مقصد ان دلی جذبات کا اظہار ہے جو ممدوح کی ذات کے تعلق سے مولانا پیش کرنا چاہتے ہیں، لیکن پھر بھی بسا اوقات وہ ناقابلِ یقین ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے مولانا کا شعری تقدس پامال ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً الکوکب الدری کی تقریظ میں مولانا نے جو اشعار کہے ہیں ان میں ایک طرف کتاب اور شارحِ کتاب کی تعریف و توصیف اور دوسری جانب ناقدین و حاسدین کی مذمت و برائی دونوں میں ہی بے انتہاء مبالغہ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

یا کوکبا کم قد حضرمت کواکبا ☆ قد قادها اهل الهوی الاشرار (۴)

---

(۱) ملاحظہ فرمایئے: "النور"، تھانہ بھون/شوال ۱۳۴۴ھ /ص:۲۱۔

(۲) بذل المجہود فی حل ابی داؤد/سر ورق کا اندرونی صفحہ۔

(۳) القاسم، دیوبند/شوال ۱۳۵۴ھ/ص:۵۹۔

(۴) فہرست تالیفاتِ شیخ/۲۸۲:۳۔

فسبقتهم و تخلفوا و تحيروا	رجعوا و زادهم الخنا و العار
قسما بوجهك انت اضوء كوكب	قد يهتدى بضيائه الاحبار

اسی طرح نواب صادق علی کے سہارنپور آنے پر مولانا نے جو قصیدہ کہا اس میں مندرجہ ذیل شعر بھی شامل ہے:

لو لاح طلعته المنيرة فی الدجی ☆ لتلت نشيد ثنائه الاقمار [۱]

جو مبالغہ کی انتہائی شکل ہے۔

عقیدت میں غلو

مولانا، بنیادی طور پر اپنے مرشد کی عقیدت واحترام میں ذرہ برابر بھی کمی نہ آنے کے قائل تھے۔ اصطلاحِ تصوف میں اسے ''فنافی الشیخ'' کا نام دیا جاتا ہے، اسی وجہ سے ان کے ان اشعار میں جو انہوں نے اپنے مرشد کی تعریف میں یا ان کی وفات پر کہے، ان میں خاصہ غلو ہے، جسے غلوفی العقیدت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اللہ کی ذات سے امید یہی ہے کہ حکیم الامت انشاءاللہ جنت میں اسی مقام پر سرفراز ہوں گے جو مولانا کی طبیعت چاہ رہی ہے، لیکن اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کر کے اسے شعر میں موزوں کر دینا غلوفی العقیدت ہی کہا جائے گا، مثلاً:

ليهنك سيدی فی كل يوم	سلام الله و الاجر الجزيل
و صلت الی مقام شهود صدق	يحف به نعيم لا يزول
فانت لدی الاله بخير عيش	و انت لخيلنا سلف رحيل

فی الحقیقت مولانا اشرف تھانویؒ کی ذاتی زندگی زہد وتقوی کے جس اعلی مقام پر تھی اس کی بنا پر اشعارِ بالا میں کوئی غلو نظر نہیں آتا، لیکن بہرحال انسان انسان ہے، اللہ کے فضل وکرم اور لطف وعنایات سے یہ امیدیں قائم رکھنا مستحسن، لیکن انہیں حتمی شکل دینے کو غلوفی العقیدت کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

تکرار

کوئی شاعر کتنا ہی بلند مراتب پر کیوں نہ فائز ہو، شعر گوئی میں وہ اگر اشعار کا اعادہ کرنے لگے تو یہ اسکی شعری خامی تصور کی جائے گی۔ مولانا کی شاعری میں جہاں بہت سے عمدہ اوصاف ہیں وہیں ایک خامی اشعار کی تکرار ہے، حالانکہ وہ ان اشعار کو جہاں موزوں معلوم ہوتے ہیں فٹ کر دیتے ہیں، لیکن اس تکرار سے قاری کو کلفت محسوس ہوتی ہے۔

مثلاً ان کے نعتیہ قصیدہ ''وسیلۃ الظفر'' کے مندرجہ ذیل اشعار:

---

(۱) بذل المجہود فی حل ابی داؤد (تقریظ) / سرِ ورق کا اندرونی صفحہ۔

مـــا لـــلـظـــلام تبـدلـت بـــالـنـور   مـــا لـــلـزمـان اتـی بـكـل حبـور [1]

خیـر الـكـلام كـلام احـمـد بعدمـا   اوحـــی الالـــه بـنـظـمـه فـی السور

ایسے ہی:

مـنهـــا الـحيـاة لـكـل حـق ميـت   منهـا الـمـمـات لـكـل قـول زور

فيهـــا البيـــاض لـكـل قـلـب اسـود   فيهـــا الـســواد لـكـل عيـن ضـريـر

تقریظ بذل المجہود میں شامل ہیں جو اگرچہ موقع ومناسبت کے لحاظ سے بالکل مناسب ہیں، لیکن بہرحال ان میں تکرار ہے۔

اسی طرح ان کے زمانۂ طالب علمی کا شعر:

الـی ایـن ابـكـی واحـدا بـعـد واحـد ☆ فـلـيـس امـرؤ مـنـا هـنـاك بخالد

مفتی شفیع احمد صاحب کے والد کے مرثیہ کا بھی پہلا شعر ہے جو واقعات کے مطابق بالکل درست معلوم ہوتا ہے، لیکن بہرحال تکرار ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے اشعار میں لفظی، معنوی اور مفاہیم کی تکرار بھی پائی جاتی ہے، مثلاً ان کے مندرجہ ذیل اشعار کی مماثلت ملاحظہ فرمائیے:

مـحـمـود! لا تبـعـد فذكـرك خـالـد   و الـذكـر لـلانسـان عمـر ثـان [2]

لا تبـعـدی یـــا بـنـت ذكـرك خـالـد   و حدیث خیرك فی الزمان طویل [3]

دونوں مراثی میں اگرچہ زمین وآسمان کا فرق ہے، لیکن جذباتی تعلق دونوں سے یکساں ہونے کی بنا پر اصل مرثیہ پر اتنی مدت گذر جانے کے باوجود دوسرے مرثیہ میں لفظی تکرار سے اگرچہ معنی ومفہوم میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دی، لیکن تکرار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

الغرض اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی شاعری کسی محنت وکاوش کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کی ان فطری صلاحیتوں کی عکاس ہے جو قدرت نے ان کو فطری طور پر ودیعت کی تھیں، ورنہ مولانا جس خانقاہی ماحول اور زاہدانہ مسلک ومشرب کی عملی تجربہ گاہ سے تعلق رکھتے تھے وہاں اس کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ مولانا اپنے خیالات وافکار کو باقاعدہ نظم کریں، وہ تو منتشر افکار و

---

(۱) وسیلۃ الظفر ۔ ص: ۳

(۲) مرثیہ شیخ الہند/ النور، تھانہ بھون/ رمضان المبارک ۱۳۳۹ھ/ص: ۱۹ ۔

(۳) مرثیۂ دختر کے لئے دیکھئے: القاسم، دیو بند/ شوال ۱۳۵۲ھ/ص: ۶۰ ۔

خیالات کو فطری طور پر نظم کر لیتے تھے اور پھر جس سے متعلق اشعار ہوئے اس تک براہِ راست یا مجلات کی وساطت سے پہونچا دیتے تھے، فنکارانہ نوک پلک درست کرنے کی نہ تو انہیں فرصت تھی اور نہ ہی غالباً ان کے مرشد کی طرف سے اجازت۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری وہ قبولِ عام حاصل نہیں کر سکی جس کی وہ بجا طور پر مستحق تھی۔ اور پھر مولانا کے ورثاء میں بھی کوئی اس ذوق کا حامل نہیں ہوا، جو ان کے شعری سرمایے کو قرینے اور سلیقے سے عوام کے روبرو پیش کرتا، اور اس کے سقم کو دور کر دیتا۔

ان سب باتوں کے باوجود مولانا کی شعری خدمات کا بہرطور اعتراف کیا جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی صاحبِ تحقیق و نظر آئے اور ان جواہر پاروں کو یکجا کر کے انہیں دنیائے علم و ادب کے حضور پیش کرے تا کہ ان کی شعری سرمایے کو عمر طویل مل سکے۔

حاصلِ کلام

گذشتہ صفحات میں ہم نے مولانا ظفر احمد صاحبؒ کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے قدرے تفصیل سے ان کے حالات قارئین کے سامنے پیش کئے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ظفر صاحب ماضی قریب کی عبقری شخصیات میں سے ایک تھے، جنہوں نے اپنے سیاسی شعور کی پختگی، علمی ذوق کی بلند مرتبتی اور اور ادبی شوق کی تسکین کی خاطر ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔

سیاست میں ان کا نظریہ اگر چہ اختلافی رہا، جس کی وجہ سے علماء کی ایک جماعت ان سے فکری طور پر متصادم رہی، تا ہم انہوں نے جو کچھ کیا حق جان کر کیا اور جو بھی کیا اس سے یک سرِ مو انحراف نہیں کیا، بلکہ اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ وہ اس تحریکی پودے کو تناور درخت بنانے کے لئے عمر بھر کوشاں رہے، جس میں انہیں کامیابی بھی ملی۔

لیکن یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ مولانا جس پائے کے عالم، ادیب اور شاعر تھے اس کا اعتراف کرنے میں نئی نسل نے بخل سے کام لیا، یہی وجہ ہے کہ آج نئی نسل ان کے کارناموں سے تو کیا ان کے نام کو بھی فراموش کرتی جا رہی ہے۔

اگر چہ اپنی کم علمی کی بنا پر میں نے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی ہے، تا ہم استادِ محترم کی کوششوں اور کاوشوں سے اس میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا ہوں کہ مولانا کی زندگی کے بکھرے ہوئے اوراق، اور ان کی ناقابلِ فراموش خدمات یکجا کر دوں تا کہ کام کرنے والوں کو ان بکھرے ہوئے موتیوں سے لطف اندوز ہونے میں کسی دقت کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ والسعی منا و الاتمام من اللہ، والحمد للہ علی ذلک۔

تمت

عبید اقبال عاصم

۱۲؍جون ۲۰۰۱ء (۱۹؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ بروز منگل)

مراجع

عربی:

القرآن الکریم: مختلف مقامات

(۱) احیاء السنن (مقدمہ اعلاء السنن) ظفر احمد عثمانی، مطبوعہ: تھانہ بھون، ۱۳۴۴ھ۔

(۲) اعلاء السنن، ظفر احمد عثمانی (مع تعلیقات مولانا تقی عثمانی)، مطبوعہ: کراچی، ۱۳۹۷ھ۔

(۳) الاعلام یعنی نزہۃ الخواطر، سید عبدالحیٔ الحسنی، مطبوعہ: رائے بریلی، ۱۹۹۲ء، جلد: ۳۔

(۴) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند؛ سید عبدالحیٔ الحسنی ؛مطبوعہ: دمشق، ۱۹۵۷ء۔

(۵) الحکمۃ فی مخلوقات اللہ عز وجل ؛ابو حامد بن محمد الغزالی؛ مطبوعہ: مصر، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء۔

(۶) الشعرانی -- امام التصوف فی عصرہ؛ الدکتور توفیق الطّویل؛ مطبوعہ: مصر ۱۹۴۵ء۔

(۷) المسالک والممالک؛ الشیخ ابوالقاسم خرداذبہ خراسانی؛ مطبوعہ: مصر، ۱۳۰۶ھ۔

(۸) المستدرک؛ ابوعبداللہ الحاکم؛ مطبوعہ: حیدرآباد (بدون تاریخ)؛ جلد: ۴۔

(۹) الملل والنحل؛ محمد بن عبدالکریم الشہرستانی؛ مطبوعہ: مصر، ۱۹۴۷ء۔

(۱۰) الہدیۃ السنیہ ؛مولانا ذوالفقار علی دیوبندی؛ مطبوعہ: دہلی ۱۳۰۷ھ

(۱۱) انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن؛ ظفر احمد عثمانی (مع تعلیقات مولانا تقی عثمانی)؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۳۸۷ھ۔

(۱۲) انہاء السکن الی من یطالع اعلاء السنن؛ ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون ۱۳۴۴ھ۔

(۱۳) صحیح البخاری؛ ابو اسماعیل عبداللہ البخاری؛ مطبوعہ: دیوبند (بدون تاریخ)۔

(۱۴) بذل المجہود فی حل ما قال ابو داؤد؛ مولانا خلیل احمد سہارنپوری؛ مطبوعہ: سہارنپور ۱۳۹۶ھ۔

(۱۵) تاریخ الادب العربی؛ عمر فروخ؛ مطبوعہ: بیروت (طبع خامس - جلد اول) ۱۹۸۴ء۔

(۱۶) تاریخ الطبری؛ الشیخ ابو جعفر الطبری؛ مطبوعہ: مصر، ۱۸۹۰ء؛ جلد: ۵۔

(۱۷) دیوان زہیر بن ابی سلمی؛ تحقیق و شرح: کرم البستانی؛ مطبوعہ: بیروت، ۱۹۵۳ء۔

(۱۸) دیوان طرفۃ بن العبد؛ طرفۃ بن العبد؛ تحقیق: کرم بستانی؛ مطبوعہ: بیروت، ۱۹۶۱ء۔

(۱۹) دیوان الفرزدق (مع شرح استاد علی فاعور)؛ مطبوعہ: بیروت، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

(۲۰) سبحۃ المرجان؛ غلام علی آزاد بلگرامی؛ مطبوعہ: علی گڑھ، ۱۹۷۲ء۔

(۲۱) شرح دیوان جریر (محمد اسماعیل عبداللہ الصاوی)؛ مطبوعہ: بیروت، (بدون تاریخ)۔

(۲۲) شرح دیوان کعب بن زہیر (ابو سعید الحسن بن الحسین)؛ مطبوعہ: مصر، ۱۹۵۰ء۔

(۲۳) عجائب الہند؛ بزرگ بن شہریار رامہرمزی (مع فرانسیسی ترجمہ)؛ مطبوعہ: لیڈن، ۱۸۸۳ء۔

(۲۴) فتوح البلدان (مع شرح و تحقیق: عبداللہ انیس الطباع و عمر انیس الطباع)؛ امام ابو العباس احمد بن یحیی البلاذری؛ مطبوعہ: بیروت، ۱۹۵۷ء۔

(۲۵) قواعد فی علوم الحدیث؛ عبدالفتاح ابو غدۃ؛ مطبوعہ: حلب (شام) ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء۔

(۲۶) مقالات الکوثری؛ شیخ محمد زاہد الکوثری؛ مرتبہ: محمد الخیری؛ مطبوعہ: مصر، ۱۳۷۳ھ۔

(۲۷) نزہۃ الخواطر؛سید عبدالحیٔ الحسنی؛مطبوعہ:حیدرآباد۱۹۷۹ء؛جلد:۷۔

(۲۸) نفحات؛مرتبہ:مفتی محمد شفیع عثمانی؛مطبوعہ:کراچی۱۳۹۳ھ۔

(۲۹) نورعلی نور؛مولانا ظفر احمد عثمانی؛مطبوعہ:سہارنپور۱۳۵۴ھ۔

(۳۰) وسیلۃ الظفر ؛مولانا ظفر احمد عثمانی؛مطبوعہ:اعظم گڑھ۱۳۶۳ھ ۔

(۳۱) الاصابہ فی تمییز الصحابہ/ابن حجر العسقلانی/مطبوعہ مصر/۱۳۵۸ھ

اردو:

(۳۲) آبِ کوثر؛شیخ محمد اکرام؛مطبوعہ:دہلی،۱۹۸۷ء۔

(۳۳) آثارالصنادید؛سرسید احمد خاں(مرتبہ:خلیق انجم)مطبوعہ:دہلی،۱۹۹۰ء۔

(۳۴) ابوالکلام آزاد - شخصیت اور کارنامے؛مرتبہ:خلیق انجم؛مطبوعہ:دہلی،۱۹۸۶ء۔

(۳۵) ابوالکلام آزاد -ایک ہمہ گیر شخصیت؛مرتبہ:رشیدالدین خاں؛مطبوعہ:دہلی؛۱۹۸۹ء۔

(۳۶) اردو انسائیکلوپیڈیا؛مرتبہ:فضل الرحمان؛مطبوعہ:دہلی،۱۹۹۶ء؛جلد:۲۔

(۳۷) اردو ترجمہ ترمذی شریف؛مرتبہ:نامعلوم؛مطبوعہ:دہلی،۱۹۷۸ء۔

(۳۸) اسلام میں پردہ کی حقیقت؛مولانا ظفر احمد عثمانی؛مطبوعہ:سہارنپور۱۳۵۴ھ۔

(۳۹) اسلامی نظام تعلیم؛پروفیسر سعید احمد رفیق؛مطبوعہ:کراچی،بدونِ سن۔

(۴۰) اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں(اردو ترجمہ عرفان ندوی)؛حکیم عبدالحیٔ الحسنی؛مطبوعہ:

(۴۱) اشرف السوانح؛عزیز الحسن مجذوب؛مطبوعہ:لاہور(طبع سوم) ،۱۳۷۸ھ؛جلد:۳۔

(۴۲) الاسباب المحمودیۃ (اردوترجمہ آداب العبودیۃ)؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛مطبوعہ:تھانہ بھون ۱۳۴۲ھ۔

(۴۳) البنیان المشید (اردوترجمہ البرہان المؤید)؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛مطبوعہ:لکھنؤ،۱۳۵۲ھ۔

(۴۴) الدرالمنضود(اردوترجمہ البحرالمورود)؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛مطبوعہ:تھانہ بھون،۱۳۴۸ھ۔

(۴۵) الشفاء(تفسیری مضامین)؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛مطبوعہ:تھانہ بھون۔

(۴۶) الترغیب والترہیب(اردوترجمہ بنام الانوار المحمدیۃ:مولانا ظفراحمد عثمانی) ؛ذکی الدین المنذری؛ مطبوعہ:دہلی،۱۳۵۰ھ۔

(۴۷) القول الماضی فی نصب القاضی؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛مطبوعہ:تھانہ بھون،۱۳۴۵ھ۔

(۴۸) القول المنصور فی ابن منصور؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛لکھنؤ،بدون تاریخ۔

(۴۹) امپریل گزیٹیر آف انڈیا؛مرتبہ:گورنمنٹ آف انڈیا؛مطبوعہ:دہلی،۱۹۰۸ء؛جلد:۱۱۔

(۵۰) امدادالاحکام فی مسائل الحلال والحرام؛مولانا ظفراحمد عثمانی؛مطبوعہ:کراچی،بدون سن۔

(۵۱) انتخاب الترغیب والترہیب(اردوترجمہ:عبداللہ دہلوی)؛مطبوعہ:دہلی،۱۹۷۳ء۔

(۵۲) انوارِاولیاء؛سیدرئیس احمد جعفری ندوی؛مطبوعہ:لاہور،۱۹۵۸ء۔

(۵۳) انوارالاتقیاء؛محمد برکت اللہ رضا فرنگی محلی؛مطبوعہ:دیوبند،۱۳۹۱ھ۔

(۵۴) برِعظیم پاک وہند کی ملتِ اسلامیہ؛اردوترجمہ:ہلال زبیری؛مطبوعہ:کراچی،۱۹۸۷ء۔

(۵۵) بزمِ اشرف کے چراغ؛ پروفیسر احمد سعید؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۹۲ء۔

(۵۶) تاریخ پاکستان اور دنیائے اسلام؛ پروفیسر محمد اسلم؛ مطبوعہ: راولپنڈی، ۱۹۷۴ء۔

(۵۷) تاریخ تعلیم ہند؛ اردو ترجمہ: مسعود الحق؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۷۳ء۔

(۵۸) تاریخ جمعیۃ علماء ہند؛ اسیر ادروی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۳ء۔

(۵۹) تاریخ دار العلوم، دیوبند؛ سید محبوب رضوی؛ مطبوعہ: دیوبند، ۱۹۷۷ء۔

(۶۰) تاریخ دعوت وعزیمت؛ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ؛ مطبوعہ: لکھنؤ ۱۹۸۲ء۔

(۶۱) تاریخِ دیوبند؛ سید محبوب رضوی (قدیم ایڈیشن)؛ مطبوعہ؛ دیوبند، ۱۹۵۲ء۔

(۶۲) تاریخ سہارنپور؛ پنڈت نند کشور؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۸۶۵ء۔

(۶۳) تاریخ فرشتہ؛ محمد بن قاسم فرشتہ؛ اردو ترجمہ: عبدالحئی خواجہ؛ مطبوعہ: دیوبند، ۱۹۸۳ء۔

(۶۴) تاریخ مظاہر علوم، سہارنپور؛ مولانا محمد زکریا؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۹۷۲ء۔

(۶۵) تاریخ مسلم لیگ؛ مرزا اختر حسین؛ مطبوعہ: بمبئی، بدون سن۔

(۶۶) تاریخ ندوۃ العلماء، لکھنؤ؛ اسحاق جلیس ندوی؛ لکھنؤ، ۱۹۸۳ء۔

(۶۷) تجلیات عثمانی؛ پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی؛ مطبوعہ: ملتان، ۱۹۵۷ء۔

(۶۸) تحذیر المسلمین عن موالاۃ المشرکین؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون، ۱۳۳۹ھ۔

(۶۹) تحریکِ خلافت؛ عدیل عباسی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۷۸ء۔

(۷۰) تحریک شیخ الہند؛ مولانا محمد میاں؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۷۵ء۔

(۷۱) تذکرۃ الخلیل؛ مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری؛ مطبوعہ: سہارنپور، بدونِ سن۔

(۷۲) تذکرۃ الرشید؛ مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۹۷۷ء۔

(۷۳) تذکرۃ الظفر؛ مولانا عبدالشکور ترمذی؛ مطبوعہ: کمالیہ (پاکستان)، ۱۹۷۷ء۔

(۷۴) تذکرۂ سلیمان؛ غلام محمد بی،اے؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۹۶۰ء۔

(۷۵) تذکرۂ شیخ مدنی؛ مولوی راشد حسن عثمانی؛ مطبوعہ: دیوبند، ۱۹۵۸ء۔

(۷۶) تذکرہ علمائے ہند؛ اردو ترجمہ: ایوب قادری؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۹۶۱ء۔

(۷۷) تذکرہ مشائخ ہند؛ اسلام الحق مظاہری؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۹۷۸ء۔

(۷۸) تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی؛ مولانا محمد میاں صدیقی؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۷۷ء۔

(۷۹) تفسیر نظام القرآن؛ علامہ حمید الدین فراہی (اردو ترجمہ: امین احسن اصلاحی) مطبوعہ: سرائے میر، ۱۹۹۰ء۔

(۸۰) تقویم ہجری وعیسوی؛ مرتبین: ابوالنصر محمد خالدی، محمود خاں، زیڈ اے ڈیسائی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۷۷ء۔

(۸۱) تلخیص البیان (تلخیص تفسیر بیان القرآن)؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون، ۱۳۴۰ھ۔

(۸۲) جمعیۃ العلماء ہند؛ پروین روزینہ؛ مطبوعہ: اسلام آباد، ۱۹۸۰ء۔

(۸۳) جناح - بانئ پاکستان (اردو ترجمہ: تنویر انجم)؛ مطبوعہ: کراچی، پاکستان؛ ۱۹۹۸ء۔

(۸۴) چند عظیم شخصیات؛ مفتی محمد شفیع؛ مطبوعہ: دیوبند، ۱۹۹۷ء۔

(۸۵) حضرت مجدد الفِ ثانی؛ مولانا سید زوار حسین شاہ؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۹۷۵ء۔

(۸۶) حکیم الامت - نقوش و تاثرات؛ عبد الماجد دریا آبادی؛ مطبوعہ: اعظم گڑھ ۱۹۵۲ء۔

(۸۷) حیاتِ اجمل؛ قاضی محمد عبد الغفار؛ مطبوعہ: دہلی، بدونِ سن۔

(۸۸) حیاتِ امداد؛ پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۹۶۵ء۔

(۸۹) حیاتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی؛ خلیق احمد نظامی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۵۳ء۔

(۹۰) حیاتِ عبد الحیؒ؛ سید ابو الحسن علی ندویؒ؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۹۶ء۔

(۹۱) حیاتِ عثمانی؛ پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۹۸۵ء۔

(۹۲) دائرۂ معارف اسلامیہ؛ مرتبہ: دانش گاہِ پنجاب؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۷۳ء؛ جلد: ۸۔

(۹۳) دائرۂ معارف اسلامیہ؛ مرتبہ: دانش گاہِ پنجاب؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۸۶ء؛ جلد: ۱۹۔

(۹۴) دائرۂ معارف اسلامیہ؛ مرتبہ: دانش گاہِ پنجاب؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۸۶ء؛ جلد: ۲۰۔

(۹۵) دائرۂ معارف اسلامیہ؛ مرتبہ: دانش گاہِ پنجاب؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۸۶ء؛ جلد: ۲۲۔

(۹۶) رحمۃ القدوس (اردو ترجمہ بہجۃ النفوس)؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: لاہور، بدونِ سن۔

(۹۷) رسائل و مسائل؛ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ؛ مطبوعہ: اچھرہ، پاکستان، ۱۹۵۷ء۔

(۹۸) روحِ تصوف مع عطر تصوف؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون، بدونِ سن۔

(۹۹) رودِ کوثر؛ شیخ محمد اکرام؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۷ء۔

(۱۰۰) روداد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۳۲۸ھ۔

(۱۰۱) روداد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۳۲۹ھ۔

(۱۰۲) روداد مدرسہ مظاہر علوم، سہارنپور؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۳۳۳ھ۔

(۱۰۳) سرگزشتِ مجاہدین؛ مولانا غلام رسول مہر؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۵۶ء۔

(۱۰۴) سفرنامۂ حج و زیارتِ حرمین شریفین؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۳۵۴ھ۔

(۱۰۵) سوانحِ قاسمی؛ مولانا سید مناظر احسن گیلانی؛ مطبوعہ: دیوبند، ۱۳۷۲ھ۔

(۱۰۶) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ؛ مولانا عبید اللہ سندھی؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۴۴ء۔

(۱۰۷) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات؛ خلیق احمد نظامی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۶۹ھ۔

(۱۰۸) ظہیر الدین محمد بابر (مسلمان و ہندو مؤرخین کی نظر میں)؛ صباح الدین عبد الرحمان؛ مطبوعہ: اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء۔

(۱۰۹) عرب و ہند عہدِ رسالت میں؛ قاضی اطہر مبارکپوری؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۶۵ء۔

(۱۱۰) عرب و ہند کے تعلقات؛ سید سلیمان ندویؒ؛ مطبوعہ: اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء۔

(۱۱۱) عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ؛ شمس تبریز خاں؛ مطبوعہ: لکھنؤ، ۱۹۸۹ء۔

(۱۱۲) عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ (اردو ترجمہ: شاہد رزاقی)؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۸۷ء۔

(۱۱۳) عربی زبان و ادب عہدِ مغلیہ میں؛ شبیر احمد قادر آبادی؛ مطبوعہ: لکھنؤ، ۱۹۸۲ء۔

(۱۱۴) عربی میں نعتیہ کلام؛ عبد اللہ عباس ندوی؛ مطبوعہ: لکھنؤ، ۱۹۷۵ء۔

(۱۱۵) علم حدیث اور چند اہم محدثین؛ پروفیسر محمد سالم قدوائی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۱ء۔

(۱۱۶) علم حدیث میں برِّ اعظم پاک و ہند کا حصہ (اردو ترجمہ: شاہد رزاقی)؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۳ء۔

(۱۱۷) علمائے مظاہر علوم اور ان کی تصنیفی خدمات؛ مولانا محمد شاہد سہارنپوری؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۹۸۳ء۔

(۱۱۸) علمائے ہند کا شاندار ماضی؛ مولانا سید محمد میاں؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۵ء۔

(۱۱۹) فضائلِ جہاد؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: کراچی، بدونِ سن۔

(۱۲۰) فقہ القرآن؛ عمر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: کراچی، بدونِ سن۔

(۱۲۱) فنِ تحریر کی تاریخ؛ محمد اسحاق صدیقی؛ مطبوعہ: علی گڑھ، ۱۹۶۲ء۔

(۱۲۲) فہرست تالیفاتِ شیخ؛ مولانا محمد شاہد سہارنپوری؛ مطبوعہ: سہارنپور، ۱۹۹۷ء۔

(۱۲۳) کاروانِ تھانوی؛ محمد اکبر شاہ بخاری؛ مطبوعہ: کراچی، ۱۹۹۷ء۔

(۱۲۴) کانگریس اور اقلیتیں؛ مرتبہ: ایم، ایم زیدی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۴ء۔

(۱۲۵) کانگریس کا صد سالہ جشن؛ مرتبہ: آل انڈیا مومن کانفرنس؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۵ء۔

(۱۲۶) لباب النعمۃ (اردو ترجمہ کتاب الحکمۃ: امام غزالی)؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون، بدونِ سن۔

(۱۲۷) محمد علی جناح (اردو ترجمہ: شہاب الدین دسنوی)؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۷۰ء۔

(۱۲۸) محمود غزنوی کی بزمِ ادب؛ ڈاکٹر غلام محی الدین قادری؛ مطبوعہ: حیدرآباد، ۱۹۲۷ء۔

(۱۲۹) مرام الخاص (اردو ترجمہ: النظام الخاص)؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون، ۱۳۵۲ھ۔

(۱۳۰) مسلم لیگ، ایک قومی تحریک؛ پروفیسر محمد مظفر مرزا؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۹۱ء۔

(۱۳۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل؛ سید طفیل احمد منگلوری؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۴۵ء۔

(۱۳۲) مسئلۂ ترکِ موالاۃ؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: علی گڑھ، ۱۳۳۹ھ۔

(۱۳۳) مصباح اللغات، عربی اردو؛ مرتبہ: مولانا عبدالحفیظ بلیاوی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۹۲ء۔

(۱۳۴) معارف الحدیث؛ مرتبہ: مولانا منظور نعمانی؛ مطبوعہ: لکھنؤ، ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء ۔

(۱۳۵) مکتوباتِ امام ربانی (اردو ترجمہ: قاضی عالم الدین؛ مطبوعہ: حیدرآباد، بدونِ سن۔

(۱۳۶) مکتوباتِ شیخ الاسلام؛ مرتبہ: نجم الدین اصلاحی؛ مطبوعہ: اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء۔

(۱۳۷) مُلّا جیون کے معاصر علماء؛ اشفاق علی؛ مطبوعہ: لکھنؤ، ۱۹۸۲ء۔

(۱۳۸) ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ؛ ثروت صولت؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۹۵ء۔

(۱۳۹) موجِ کوثر؛ شیخ محمد اکرام؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۷ء۔

(۱۴۰) مولانا انور شاہ - حیات اور کارنامے؛ محمد رضوان اللہ؛ مطبوعہ: علی گڑھ، ۱۹۷۲ء۔

(۱۴۱) مولانا حسین احمد مدنی - ایک سیاسی مطالعہ؛ ابوسلمان شاہ جہاں پوری؛ مطبوعہ: لاہور، ۱۹۹۳ء۔

(۱۴۲) نزہۃ البساتین (اردو ترجمہ: روض الریاحین)؛ مولانا ظفر احمد عثمانی؛ مطبوعہ: تھانہ بھون؛ بدونِ سن۔

(۱۴۳) نقشِ حیات؛ مولانا حسین احمد مدنی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۵۴ء۔

(۱۴۴) واقعاتِ دارالحکومت، دہلی؛ بشیر الدین احمد؛ مطبوعہ: آگرہ، ۱۹۱۹ء۔

(۱۴۵) واقعاتِ دارالحکومت، دہلی؛ بشیر الدین احمد؛ مطبوعہ: آگرہ، ۱۹۱۹ء۔

(۱۴۶) ہندوستان میں اسلامی جدیدیت (اردو ترجمہ: جمیل جالبی)؛ پروفیسر عزیز احمد؛ مطبوعہ: دہلی ۱۹۹۰۔

(۱۴۷) ہندو پاک میں اسلامی کلچر (اردو ترجمہ: جمیل جالبی)؛ پروفیسر عزیز احمد؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۹۱ء۔

(۱۴۸) ہندوستان اسلام کے سائے میں؛ قاضی وجدی الحسینی؛ مطبوعہ: بھوپال، ۱۹۸۲ء۔

(۱۴۹) ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں؛ ابوالحسنات ندوی؛ مطبوعہ: اعظم گڑھ، ۱۹۳۶ء۔

(۱۵۰) ہندوستان کے اہم مدارس؛ محمد قمر اسحاق؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۷۰ء۔

(۱۵۱) ہندوستان میں اسلامی علوم وادبیات؛ مرتبہ: عمادالحسن آزاد فاروقی؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۸۶ء۔

(۱۵۲) ہندوستان کے سلاطین وعلماء؛ صباح الدین عبدالرحمان؛ مطبوعہ: اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء۔

(۱۵۳) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں؛ قاضی اطہر مبارکپوری؛ مطبوعہ: دہلی، ۱۹۶۷ء۔

فارسی:

(۱۵۴) مثنوی رومی؛ مولانا جلال الدین رومی؛ مطبوعہ: لندن، ۱۹۵۲ء۔

مخطوطات:

(۱۵۵) ہندوستان میں عربی شاعری (حامد علی خاں کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ)؛ T-378 مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء۔

(۱۵۶) عربی نظم؛ مولانا ظفر احمد؛ عطا فرمودہ: ڈاکٹر یوسف فاروقی، اسلام آباد، پاکستان۔

انگریزی:

The Preaching of Islam; T.W. Arnald;published:Delhi, 1990. (۱۵۷)

Shorter Encyclopaedia of Islam; H.A.R. Gibb and J.H. Karvans; Leiden, 1953. (۱۵۸)

رسائل وجرائد:

(۱) اشرف العلوم (ماہنامہ)، سہارنپور؛ جمادی الأولی ۱۳۵۴ھ ۔

(۲) البلاغ (ماہنامہ)، کراچی؛ جمادی الأولی ۱۳۸۷ھ،

= صفر، جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ ،

= شوال ۱۳۹۱ھ ،

= ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ۔

(۳) الجمعیۃ (روزنامہ)، دہلی (مجاہدِ ملت نمبر)؛ ۱۹۶۲ء۔

(۴) الرشاد (ماہنامہ)، سہارنپور؛ (ابتدائی صفحات نہ ہونے کی وجہ سے ماہ وسن کا علم نہ ہوسکا)۔

(۵) الرشید (ماہنامہ)، سہارنپور (دارالعلوم، دیوبند نمبر)؛ ۱۴۰۰ھ

= (نعت نمبر)؛ ۱۴۱۱ھ۔

(۶) الصدیق (ماہنامہ)، ملتان؛ ابتدائی صفحات نہ ہونے کی وجہ سے ماہ وسال کا علم نہ ہوسکا۔

(۷) الفاروق (=)،کراچی؛ جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ/ اکتوبر ۱۹۹۸ء۔

(۸) الفرقان (=)، بریلی و لکھنؤ (شاہ ولی اللہ نمبر)؛ ربیعین ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء؛ جلد نمبر: ۸، شمارہ نمبر: ۳-۴،

= = شوال ۱۳۶۰ھ؛ ۸/ ۱۰،

= = ربیعین و جمادی الاولی ۱۳۶۱ھ؛ ۹/ ۳، ۴، ۵،

= = ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ؛ ۹/ ۱۱-۱۲۔

(۹) النور (ماہنامہ)، تھانہ بھون؛ جمادی الاولی ۱۳۳۹ھ تا ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ (جلد ۱ تا ۱۴ کے بیشتر شمارے)۔

(۱۰) بینات (ماہنامہ)، کراچی؛ رجب و ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ،

= ذی الحجہ ۱۳۹۴ھ۔

(۱۱) ترجمان القرآن (ماہنامہ)، پٹھان کوٹ؛ جون ۱۹۴۲ء۔

(۱۲) ترجمان دار العلوم (ماہنامہ)، دہلی؛ مئی ۱۹۹۷ء؛ ۴/ ۱۲۔

(۱۳) زندگی (ہفت روزہ)، لاہور؛ ۱۴/ ستمبر ۱۹۶۹ء ۔

(۱۴) سیارہ ڈائجسٹ (ماہنامہ)، لاہور (قرآن نمبر)؛ ۱۹۷۰ء ۔

(۱۵) شباب (ہفت روزہ) لاہور؛ ۲/ اپریل، ۱۸ و ۲۵/ جون،

= = ۲۳/ جولائی، ۱۴/ اگست و ۲۴/ ستمبر ۱۹۶۱ء،

= = ۴/ فروری و ۲۳/ مئی ۱۹۶۲ء۔

(۱۶) صوت الاسلام (ہفت روزہ)، لاہور؛ ۱۲/ جون ۱۹۷۰ء۔

(۱۷) طلوعِ اسلام (ماہنامہ)، دہلی؛ ستمبر ۴۱ء ، نومبر ۴۱ء۔

(۱۸) عزائم (ہفت روزہ)، لکھنؤ (خاص نمبر: جدوجہد آزادی اور اس کے بعد)؛ دسمبر ۷۳ء ۔

(۱۹) عصرِ جدید (روزنامہ)، کلکتہ؛ ۱۲/ مارچ ۱۹۴۶ء۔

(۲۰) فاران (ماہنامہ)، کراچی؛ کچھ صفحات نہ ہونے کے باعث ماہ وسن نامعلوم۔

(۲۱) فیض الاسلام (ماہنامہ)، لاہور؛ دسمبر ۷۹ء ۔

(۲۲) قاسم العلوم (ماہنامہ)، دیوبند؛ ذی الحجہ ۱۳۵۳ھ؛ ۲/۶۔

= شوال، ذی قعدہ ۱۳۵۴ھ؛ ۳/۴-۵۔

(۲۳) گگن (ماہنامہ)، بمبئی (مذاہب عالم نمبر)؛ ۱۹۸۴ء۔

(۲۴) معارف (ماہنامہ)، اعظم گڑھ؛ ۴/۲، ۱/۱۳، ۳۷/۳و۵، ۳۸/ او ۳، ۵/۳۹، ۵/۴۴،
۴/۴۸، ۳-۴/۵۲، ۵-۴-۱/۵۳ و ۶، ۲-۱/۵۴، ۵/۵۵، ۶-۵/۵۶، ۳-۱/۵۷ و۶،
۳-۱/۵۸ و ۶، ۱/۵۹، ۴/۶۷، ۴/۶۹ ، ۶/۷۰ ، ۴-۱/۷۱ تا ۶، ۱/۷۲، ۴/۸۱ ،
۵/۸۴، ۶/۹۰، ۵-۲/۹۳۔

(۲۵) ندائے حرم (ماہنامہ)، کراچی۔

(۲۶) نقوش (ماہنامہ)، لاہور (رسول نمبر)؛ جلد: ۱۰۔